

پروفیسر محمد اکرم رضا

کتاب

معارف

جلد ۱







# قافلہ عشق کے مسافر

(نعتیہ مضامین)

پروفیسر محمد اکرم رضا



فروع ادب اکادمی

لاہور — گوجرانوالہ — اسلام آباد



خوبصورت، معیاری اور  
دیدہ زیب کتابوں کا اہم مرکز

نام کتاب : قافلہء شوق کے مسافر  
مصنف : پروفیسر محمد اکرم رضا  
سال اشاعت : 2007ء  
تعداد : اک ہزار  
قیمت : ~~1000~~ روپے  
اہتمام : فروغ ادب اکادمی  
88۔ بی۔ سیٹلائٹ ٹاؤن گوجرانوالہ  
فون : 055.3251603

تقسیم کار

کتاب سرائے۔ الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ۔ اردو بازار لاہور

فون۔ 7320318

نعت مرکز۔ المدینہ دارالاشاعت، یوسف مارکیٹ، غزنی سٹریٹ 88۔ اردو بازار لاہور



سیدنا امام محمد بن سعید شرف الدین بوسیری کے نام



کہ جن کی وارفتگی شوق نے نعت و مدحت حضور ﷺ

کے حوالے ان سے وہ تاریخ ساز اشعار کہلوائے

جو ان کی جسمانی شفا یابی، روحانی سرفرازی اور شعری رفعت کا اس شان سے اعزاز بنے

کہ وہ چادرِ رحمت (قصیدہ بردہ شریف) سے بھی نوازے گئے

اور ان کی نعت گوئی ہر عہد، ہر دور اور ہر قرن کے ظلمت زدوں کے لئے پیغامِ نور بن گئی



## فہرست

- ☆ تجلی۔ پروفیسر محمد اکرم رضا۔ 9
- ☆ پیشوائی۔ پروفیسر حفیظ تائب۔ 11
- ☆ شاعر مشرق علامہ محمد اقبال۔ ایوانِ نعت میں۔ 17
- ☆ حضرت احمد رضا خاں محدث بریلوی۔ کارواںِ سالارِ نعت۔ فنی و تحقیقی جائزہ۔ 51
- ☆ مہر عالم تائبِ نعت۔ سید پیر مہر علی شاہ گولڑوی۔ 85
- ☆ خطیبِ اسلام۔ صاحبزادہ سید فیض الحسن شاہ۔ 109
- ☆ عہدِ آفریںِ نعت گو۔۔۔ حفیظ تائب۔ 121
- ☆ گلزارِ مدحت کی بہارِ لازوال۔ محمد اعظم چشتی۔ 133
- ☆ عارف عبد المتین۔ نعت حضور ﷺ کے حوالے سے شاعر بے مثال۔ 143
- ☆ راسخ عرفانی۔ ایک منفرد نعت گو۔ 155
- ☆ جادہ شوق کا مسافر۔ اصغر حسین خاں نظیر لدھیانوی۔ 165
- ☆ کارواںِ نعت کا ممتاز رکن۔ راجہ رشید محمود۔ 169
- ☆ ساغر کوثر کا تمنائی۔ قمریزدانی۔ 187
- ☆ خواجہ عابد نظامی اور فیضانِ کرم۔ 193
- ☆ سید ابوالخیر کشفی کا نذرانہِ مدحت۔ 201
- ☆ سید صبیح الدین صبیح رحمانی۔ توصیفِ حضور ﷺ سے نعت رنگ کی ادارت تک۔ 213
- ☆ مسدس کی ہمہ گیری اور انور جمال کی مدحت نگاری۔ 221
- ☆ منفرد اور سر بلند نعت گو۔ عبدالغنی تائب۔ 227
- ☆ خیراتِ مدحت کا تمنائی۔ محمد اقبال نجمی۔ 237



## تاریخ طباعت: ”قافلہ شوق کے مسافر“

نتیجہ فکر۔ علامہ عبدالرشید ارشد جلال پوری

آگئی ہے کتابِ حقائق کشا، دیکھئے ہے چھپی کس قدر دلربا  
منفرد ہے کتابت میں بھی مرجبا! جلد ہے بہترین، سرورق خوش نما

ہے حلاوت زبان و بیاں میں بھری، خوب ہے طرزِ تحریر میں چاشنی  
کیا فصاحت، بلاغت کی ہے ساحری، حسنِ ذوقِ تکلم میں ہے دلکشی!

ایک ناقد، پروفیسر اکرم رضا۔ ۱، جو ہیں موصوف در صنفِ شعر و سخن۔ ۲  
ماہر نقد و معیارِ تنقید و فن۔ ۳، ان کی خوشبوئے سعد انجمن انجمن۔ ۴

آپ نے ذوقِ تقریظ و تحسین سے، نعت گو شاعروں کے مضامین سے  
ان کے اسلوب و اندازِ تدوین سے، اک لیا جائزہ روئے آئین سے

نعت گو شاعروں کا ہے یہ تذکرہ، ان کے عیب و ہنر کا زہرِ زاویہ  
خوب نقد و نظر سے کیا تجزیہ، پھر کیا ایک بے لاگ سا تبصرہ

عاشقانِ نبیؐ پر ہے رب کا کرم، جذب و مستی میں اٹھتا ہے ہر اک قدم  
ہے رواں دم بدم، راہوارِ قلم، سوئے آں محترم ”تاجدارِ حرم“

کارواں کے مسافر یہ عشاق ہیں، ”کشتگانِ محبت“ کے مصداق ہیں  
مدح گوئی میں مشہورِ آفاق ہیں، جن کے مدحت سے لبریز اوراق ہیں

رہروانِ عقیدت کے یہ قافلے، چل پڑے ہیں دلوں میں لئے دلوں  
جذبہ شوق میں گھٹ گئے فاصلے، طے ہوئے وادیِ عشق کے مرحلے

۱۔ ۲۰۰۶ء ۲۔ ۲۰۰۶ء ۳۔ ۱۴۲۷ھ ۴۔ ۱۴۲۷ھ



یہ مسافر وفادارِ قرآن ہیں، وارثانِ مقاماتِ حسان ہیں  
عصمتِ انبیاء کے نگہباں ہیں، سرفروشانِ اسلام و ایمان ہیں

مرحبا رہ نوردانِ دشتِ جنوں! ان کے جذبِ دروں کے لیے کیا کہوں؟  
لب پہ صلِّ علی، چالِ سیماب پا، ہر قدم کیفِ زاپیشِ شوقِ فزوں!

کتنے خوش بخت ہیں آپ کے مدحِ خواں، آپ کی منزلت کے جو ہیں قدرداں  
آپ کے راز داں، آپ کے ترجمان، ان پہ ارشد ہے ہر دم خدا مہرباں

منزلِ شوق کے ہیں مسافر وہی، جو ہیں مداحِ مدوحِ معبودِ کل  
آسمانِ ولا کے کواکب ہیں، یہ، محسنینِ محبینِ ختمِ رسل

اشرفِ الانبیاء، شاہدِ کبریا، مصطفیٰ، مجتبیٰ، آپ خیرالوری  
شب کی تاریکیاں، ظلم کی آندھیاں، چھٹ گئیں آپ سے آپ بدرالدجی

آپ خیر البشر، محسنِ بحرِ بر، آپ کی اک نظر، پُر اثر، چارہ گر!  
کہکشاں، آسمان، آپ کی رہ گزر، سدرۃ المنتہی سے بھی آگے سفر!

باعثِ کن فکاں، والی دوجہاں، ہادیِ انس و جاں، شافعِ عاصیاں  
چشمہ دینِ حق، جاوداں، جاوداں، رودِ رحمتِ رواں، بے کراں، بے کراں!

روز ہو یا کہ شب، ہر گھڑی زیرِ لب، آپ پر ہو درود و سلامِ ادب!  
آل و اصحاب پر بھی ہو والا حسب، آپ اُمی لقب، آپ محبوبِ رب

اے کثیر النعم، سید المرسلین، زبدۂ عاطفت، رحمتِ عالمیں  
ہو غطف کی نظر سوئے ارشدِ حزیں، طالبِ جذبِ صادق ہو در راہِ دین

.....☆.....☆.....



## تجلی

پروفیسر محمد اکرم رضا

نعتِ مصطفیٰ ﷺ عبادت بھی ہے اور سعادت بھی۔ وہی لمحات حاصلِ حیات ہوتے ہیں جو ذکر و فکرِ مصطفیٰ علیہ التحۃ والثناء میں بسر ہوتے ہیں۔ یہ وہ حقیقتِ قدسی ہے جس سے میں اپنے خاندانی پس منظر اور نظریاتی کرم باریوں کی بدولت اوائلِ عمر ہی میں آگاہ ہو چکا تھا۔ جب سنِ شعور کو چھوا تو نعت کے انوار سے دل و جان ضو فگن ہونے لگے۔ جب فکر و شعور کو مزید پختگی ملی تو میں نے خود کو مذہبی، نظریاتی اور ادبی رسائل کے ہجوم میں گھرا پایا۔ نعت کے نعماتِ ذہن و فکر کا افتخار بننے لگے اور ابھی میٹرک بھی نہیں کیا تھا کہ میری نعتیں معتبر رسائل و جرائد کی زینت بننے لگیں۔ جوں جوں عمر کے راہوار نے قدم آگے بڑھایا نعت کی سر بلندیوں اور نئے نئے مضامین سے افکار کے اُلجھے ہوئے کنارے سلجھنے لگے اور زندگی کی بے کیف فضائیں تذکارِ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام سے آباد ہونے لگیں۔

یہ عرض کرنا تحدیثِ نعمت ہے کہ فیاضی قدرت سے شاعری، نثر اور تقریر کا جذبہ خوب عطا ہوا، اگرچہ میں نے نظم، نثر کو ایک میدان تک محدود نہیں کیا مگر نعت کے سیلِ نور نے بالخصوص مجھے اپنے بہاؤ میں لے لیا۔ نعت تو لکھی جا رہی تھی مگر تنقیدِ نعت کا تصور اس وقت ناپید تھا۔ جب وقت نے ادھر کو رخ موڑا، تو تنقیداتِ نعت کے لحاظ سے بھی بے تحاشا لکھا۔ مضامین و مقالات، شخصی مضامین، ہمہ گیر تحریریں، دیباچے، تقاریر وغیرہ میں نے بارہا سوچا ہے کہ یہ میری فکر یا میرے قلم کا کمال نہیں بلکہ یہ تو عین عطائے خداوندی ہے کہ ہر لحظہ و ہر آن مجھے نوکِ قلم سے فکرِ نعت کے گل و لالہ لٹانے کے مواقع مہیا کرتی رہی۔

جس وقت ”فروعِ ادبِ اکادمی“ کے زیرِ اہتمام میری کتاب ”کاروانِ نعت کے حدی خواں“ شائع ہوئی تو اس وقت تنقیدِ نعت کا شعور نہ ہونے کے برابر تھا۔ آج جبکہ چاروں طرف نعت پر تحقیقی کام ہو رہا ہے تو یہی کتاب ایک ماخذ کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ اسی سلسلے کی دوسری کڑی قافلہ شوق کے مسافر ہے۔ عزیز مکرم محمد اقبال نجمی (جن میں مجھے اپنے مستقبل کی جھلک نظر آتی ہے) کے زیرِ اہتمام فروعِ ادبِ اکادمی سے شائع ہو رہی ہے۔ میرے سرمائے میں تو تنقیداتِ نعت کے حوالے سے اتنا مواد ہے کہ کم از کم درجن بھر کتب شائع ہو سکتی ہیں اور یہ سلسلہ رُکا نہیں بلکہ ممتاز رسائل و جرائد کی بدولت مسلسل پھیلتا جا رہا ہے۔ ویسے بھی کاروانِ نعت نہ کبھی رُکا ہے نہ تھما ہے۔ ہمارا کام تو فقط یہی ہے کہ تائیدِ ایزدی کے سہارے اپنی تمام صحسیں اور شامیں محبوبِ دو عالم ﷺ کی لاثانی شخصیات کے محاسن کی نذر کرتے رہیں۔ اس کتاب کی اشاعت کے ضمن میں میرے لیے سب سے زیادہ خوش کن اور یادگار پہلو یہ ہے کہ



اس کا دیباچہ عصر حاضر میں نعت کے سب سے بڑے نقیب حفیظ تائب نے لکھا ہے۔ نہایت محبت سے اور نہایت خلوص سے۔ مجھے ان سے یک گونہ تعلق خاطر تھا۔ آپ شرف زیارت بھی بخشے رہے اور مجھے بھی اپنے دولت خانہ پر حاضری کا شرف عطا کرتے رہے۔ انہوں نے یہ دیباچہ عرصہ پیشتر لکھا مگر یہ کتاب ان کے وصال کے بعد شائع ہو رہی ہے۔ جب یہ دیباچہ لکھ چکے، تو میں نے عرض کی کہ اس میں آپ کے بارے میں بھی ایک مقالہ ہے۔ کہنے لگے پھر تو مجھے دیباچہ سے گریز کرنا چاہئے تھا۔ عرض کیا کہ آپ وہاں ہیں جہاں آپ کے ذکر کے بغیر سلسلہ نعت آگے کو نہیں بڑھتا اور پھر میں یہ مضمون آپ کو دکھاؤں گا بھی نہیں لیکن کتاب کی اشاعت کی تاخیر کی وجہ سے وہ مضمون کئی جرائد کی زینت بن گیا۔ بہر حال جناب حفیظ تائب کے بارے میں میرے احساسات اور محبتیں لفظوں میں نہیں سمٹ سکتیں دعا گو ہوں کہ رب کریم انہیں اس اثاثہ نعت کی بدولت جو وہ ملت اسلامیہ کی میراث بنا چکے ہیں ہر گام پر بلند درجات عطا کرے اور حضور ﷺ کی شفاعت کریمانہ ان کا مقدر بنی رہے جس کی آرزو میں ان کی شاعری ہر لمحہ حیات کا اعزاز بنی رہی۔

”قافلہ شوق کے مسافر“ آپ کے روبرو ہے۔ قدیم دور اور عصر حاضر کے نعت گوؤں کے تذکار سے آباد۔ دعا ہے کہ رب کریم اپنے محبوب ﷺ کے وسیلہ جلیلہ سے حیات مستعار کو مہلت عطا کرتے رہیں تاکہ اوروں کے لیے بھی بدستور لکھتا رہوں اور اپنے بہت بڑے اشاعت کے منتظر ادبی سرمایہ کی طباعت کا اہتمام بھی کرتا رہوں، سب فیصلے اوپر سے ہوتے ہیں۔ نگاہیں عالم تصور میں گنبد خضریٰ پر نکلی ہیں کہ سرکارِ دو عالم ﷺ کی شفقت بے کراں کی بدولت الطافِ خداوندی کا سحاب میری فرصتِ حیات کو حسنِ طوالت کا اعزاز بخشتا رہے تاکہ میں وہ سب کچھ کر سکوں جو میرے دل کا مدعا اور میرے فکر و عمل کا تقاضا ہے۔

دل کی گہرائیوں سے ممنون ہوں اپنے پیارے محمد اقبال نجمی ڈائریکٹر ”فروع ادب اکادمی“ کا کہ جن کا اصرار اس مختصر سی تحریر کے لیے مجھے مدتوں ان سے دور رہنے پر آمادہ کرتا رہا۔ خدائے قدوس انہیں خدمتِ فروع نعت کا بھرپور صلہ عطا کرے اور اس کے ساتھ بے شمار دعائیں مدیر نعت رنگ صبیح رحمانی اور پیرزادہ حضرت اقبال احمد فاروقی کے لیے کہ جن کا اصرار اس کتاب کی اشاعت کے لیے مسلسل میرے شب و روز کا حصہ بنا رہا۔





بسم اللہ الرحمن الرحیم

## پیشوائی

محمد اکرم رضا فردِ واحد کا نام نہیں بلکہ وہ ایک متحرک ادارہ ہیں۔ ان کی شخصیت اور فکرو فن کی کئی جہات ہیں اور ربِ صوت و صدا نے انہیں بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ وہ استاد ہیں، لفظوں پر مضبوط گرفت رکھنے والے خطیب ہیں، ادیب ہیں، شاعر ہیں، محقق ہیں، نقاد ہیں، مدیر ہیں۔ ایک زمانہ ان کی شعری اور تحقیقی صلاحیتوں سے مستفید ہوتا ہے اور نہ جانے ان کے کتنے جوہر ابھی پوشیدہ ہیں۔ وہ گذشتہ چالیس برس سے اپنی تمام تر صلاحیتیں نعت مبارک کے لئے وقف کئے ہوئے ہیں۔ متعدد ادبی و نظریاتی رسائل و جرائد کی ادارت اور سرپرستی، ادبی، سماجی، شعری اور نظریاتی تقاریب کی جان، نعت گوئی کے علاوہ نعت کی تدوین، تحقیق، تنقید اور اس کے اشاعت و فروغ کے لیے تمام تر صلاحیتیں بروئے کار لانا ان کا اعزاز ہے بلکہ یوں کہنا صحیح ہوگا کہ رب کریم اور ممدوح نعت صلی اللہ علیہ وسلم کی عطائے خاص ہیں۔ ان کے سینکڑوں تنقیدی مضامین اور مقالات فنِ نعت کے مختلف زاویوں کے حوالے سے قابلِ قدر رسائل و جرائد اور نعت نمبروں کی زینت بن رہے ہیں۔ ان کی متعدد ادبی اور تحقیقی تخلیقات ان کی فکری کاوشوں اور نظریاتی صلاحیتوں کے ارتقاء کی دلیل ہیں۔

فروغِ نعت کے حوالے سے ان کی کتاب ”کاروانِ نعت کے حدی خواں“ دستاویزی اور یاد گار حیثیت کی حامل ہے۔ اس کتاب میں نابغہ روزگار نعت گو شعراء کی نعتیہ کاوشوں کا تنقیدی حوالوں سے بھرپور جائزہ لیا ہے اگرچہ اب اس نوعیت کی دو تین مزید کتب منظرِ عام پر آچکی ہیں مگر کسی بھی فکری کاوش کو اس کے پس منظر میں دیکھنا چاہیے جب پروفیسر محمد اکرم رضا کی یہ تحقیقی کاوش منظرِ عام پر نہیں آئی تھی تو اس وقت اس نوعیت کی کوئی بھی کتاب ماخذ کا درجہ نہیں رکھتی تھی فقط چند نعتیہ انتخاب تھے یا ایک دو تحقیقی مقالات لیکن کاروانِ نعت کے حدی خواں نے نعت کے مشکوٰۃ صحرائوں میں واقعی حدی خوانی کا کردار ادا کیا یہ چراغ جو جالتو کئی دیئے اور جھلملانے لگے۔ انہیں یہ شرف حاصل ہے کہ انہوں نے کئی بھولے بسرے نعت گوؤں کو ماضی کے نہاں خانوں سے نکال کر عہدِ حال کی زینت بنادیا۔ انکا یہ سلسلہ رکنا نہیں بلکہ دوام کی منزلوں کی جانب رواں دواں ہے۔

رضا صاحب بیک وقت ممتاز نقاد نعت بھی ہیں اور معروف شاعر رسالتاً صلی اللہ علیہ وسلم بھی۔ اگر بنظر



غائر دیکھا جائے تو دونوں میدانوں میں ان کا لہجہ مختلف ہوتا ہے۔ تنقید سنجیدگی، تحقیق اور ذوق جستجو سے عبارت ہے جبکہ نعت گوئی و فور شوق، عشق کے والہانہ پن اور جذبات عقیدت کی ہر ساعت اڑان کا نام ہے۔ محمد اکرم رضا اس لحاظ سے خوش بخت ہیں کہ تنقید اور نعت دونوں سے انصاف کر گئے۔ انہوں نے تنقید رقم کرتے ہوئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پُر تقدس جلوؤں کو مد نظر رکھا ہے اور جب نعت لکھی تو ممدوح نعت ﷺ کے تصورات میں ہمہ تن گم رہے۔ تحقیق و تنقید اور نعت و مدحت کی دنیاؤں میں ایک ہی وقت میں سرخروئی سے ہمکنار ہونے کا سبب یہ ہے کہ پروفیسر رضا بنیادی طور پر نعت گو ہیں۔ ایسا نعت گو جو ثنائے حبیب علیہ الصلوٰۃ والسلام میں کھوئے رہنے ہی کو حاصل حیات سمجھتا ہے۔

زیر نظر کتاب ”قافلہ شوق کے مسافر“ بھی نعتیہ تحقیق کے روشن سلسلے کا ایک حصہ ہے۔ یہ وہ جادہ ہے جس پر محمد اکرم رضا ایک مدت سے چل رہے ہیں۔ ایک بڑے علمی اور ادبی گھرانے کے فرد ہونے کے سبب انہیں محبت رسول ﷺ آغاز شعور ہی سے عطا ہوئی۔ ذرا بڑے ہوئے تو قرطاس و قلم سے رشتہ قائم ہو گیا اور پھر نعت بھی لکھی اور نعت نگاروں کے علاوہ اوصافِ نعت پر بھی لکھا۔ جب قلم اور ذہن کو مزید پختگی عطا ہوئی تو اصحابِ ذوق نے ان کی جانب تیزی سے رجوع کیا۔ جملہ اصنافِ سخن میں ان کے ادبی نقوش ہمیشہ جگمگاتے رہیں گے۔ راقم کو خوشی ہے کہ یہ میری منزل فکر کے راہی ہیں۔ کتنی ہی نعتیہ کتب ان کی توجہ اور راہنمائی سے شائع ہو چکی ہیں۔ مقدمے، دیباچے، تقریظ، فلیپ، تبصرے، شخصی اور موضوعاتی نعتیہ تحریریں، غرض ایک سیلِ نورِ مدحت پھیلا ہوا ہے۔ ان کی کاوشوں سے صحابِ لطفِ حضور ﷺ کے سبب بادِ خوشگوار کے چلتے رہنے کا گمان ہے۔ ان کا ذکر کرتے ہوئے مجھے ہمیشہ ایسی روحانی مسرت کا احساس ہوتا ہے جسے محسوس تو کیا جاسکتا ہے مباحثہ بیان نہیں کیا جاسکتا۔

”قافلہ شوق کے مسافر“ میں ڈیڑھ درجن کے قریب نعت گو شعراء کے فکری محاسن کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ ان کی نثر پر شاعرانہ جمال کا گمان گزرتا ہے۔ نعت نگاروں پر لکھتے ہوئے یوں لگتا ہے کہ جسے ان کا قلم تحقیق و تنقید کے نام پر نثری نعتیں تخلیق کر رہا ہے۔ انشائے لطیف کی احسن صورت، فقرات ڈھلے ڈھلائے، جملے یوں جیسے تسنیم و کوثر کی پاکیزگی لئے ہوئے ہیں۔ خوبصورت تراکیب و تشبیہات، الفاظ میں پھولوں کی خوشبو، کہیں مسجع مقفی عبارت آرائی اور کہیں اتنے سادہ کہ سادگی پر بھی حسنِ صوت کا گمان گزرے۔ میرے بارے میں بعض حجت کرنے والے بعض اوقات شکوہ کر جاتے ہیں کہ میں مدحت نگار کے تذکرے کے لیے بہتر سے بہترین جملوں کا انتخاب کرتا ہوں اور اس کے لیے ہمیشہ بلند یوں کا تمنائی رہتا ہوں اسی بات کو میں محمد اکرم رضا کی طرف بھی لوٹانا چاہتا ہوں۔ اس کا جواب انہوں نے یہ دیا تھا کہ و صاف رسول ﷺ کو دنیاوی اور اخروی بلندیاں تو خدا اور مصطفیٰ ﷺ عطا کر رہے ہوتے ہیں تو فقط



ان کے اظہار میں گم ہو کر سامانِ بخشش ڈھونڈتا ہوں۔ عزیز مکرم محمد اکرم رضا کے اسی اظہار مدعا میں مجھے اپنا فلسفہ ”پیشوائی“ جھلکتا نظر آتا ہے۔ آئیے ہم مباحث میں الجھنے سے کہیں زیادہ شفاعت سر کا ﷺ کے تمنائی بننے کی آرزو کریں۔

اگر نعتیہ یا شعری تصنیف کے لیے ابتدائی تحریر مقصود ہوتی تو اب تک متعدد اشعار بطور مثال پیش کر چکا ہوتا مگر یہ تو تحقیقی کتاب ہے جس کا جائزہ مصنف کے حسن تحریر کے ساتھ ساتھ تحقیقی شکوہ کو مد نظر رکھ کر ہی کیا جاسکتا ہے۔ اس حوالے سے ہم ان کی چند تنقیدی کاوشوں میں شخصیت نگاری کے خدو خال تلاش کرتے ہیں۔ ان کا پہلا مضمون حکیم الامت علامہ محمد اقبال پر ہے۔ ”اقبال ایوانِ نعت میں“ کے عنوان سے اس مضمون میں علامہ محمد اقبال کی محبت رسول ﷺ کے پہلو بہ پہلو ان کی نعتیہ خصوصیات کا جائزہ لیا ہے۔ اقبال باقاعدہ نعت گو شاعر نہیں تھے مگر ان کے نعتیہ جواہر نے فکر و ادب کے دامن کو ابدی دلاویزی عطا کر دی۔ محمد اکرم رضا علامہ اقبال کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

”علامہ اقبال کی نعت مروجہ سالیب سے ہٹ کر ہے۔ ”ارمغانِ حجاز“ کو چھوڑ کر ان کی کتابوں کے عنوانات بھی نعتیہ نہیں ہیں۔ وہ بطور خاص نہیں کہتے مگر نعت ان سے ہو جاتی ہے۔ وہ ملت اسلامیہ کو درپیش مسائل کا تذکرہ کریں، صحابہ کرام کی قربانیوں کا ذکر چھیڑیں، مسلمانوں کو ان کا بھولا ہوا ماضی یاد دلائیں، توحید خداوندی کو اپنا موضوع بنائیں۔ خودی و خودداری کے اسرار بیان کریں۔ اصحابِ محبت کی شاہینی اُڑان کو عنوان شاعری بنائیں۔ خاکِ حجاز کا ایمان آفریں تذکرہ چھیڑیں۔ غازیانِ اسلام کو خراج عقیدت پیش کریں۔ اپنی قلبی واردات پر سے پردہ اٹھائیں یا اپنی روحانی تگ تاز کو آشکار کریں۔ مسجد قرطبہ پر قلم اٹھائیں یا اسلام کی عظمت رفتہ کا نوحہ اپنی بانگِ درا کا موضوع بنائیں۔ حق یہ ہے کہ اقبال کسی نہ کسی صورت آقائے دو عالم ﷺ کے حضور اپنی جبین عقیدت خم کر دیتے ہیں اور محبت رسول ﷺ اپنی جلوہ کاری دکھا ہی جاتی ہے۔

مولانا احمد رضا خان مبلغ اسلام اور مفسر تھے۔ بزمِ ہستی ان کے افکار سے مدتوں فیضیاب ہوتی رہے گی۔ ان کے تمام علمی اور دینی کمالات اپنی جگہ مگر ان کی بدولت نعت گوئی کی صنف کو جو مقام ملا ہے اس کا تذکرہ دنیاۓ عقیدت کا افتخار بنا رہے گا۔ امام احمد رضا فاضل بریلوی جیسے فرزندِ ان روزگار صدیوں بعد جنم لیتے ہیں۔ ایک زمانہ ان کے مقام و مرتبہ سے آگاہ ہے۔ محمد اکرم رضا نے ان کی نعت گوئی کو دل کھول کر بیان کیا ہے اور آنے والی نسلوں پر اس عظیم نعت گو کے کمالات کو خوب خوب اجاگر کیا ہے۔ تاریخی حقائق، اصحابِ نقد و نظر کے حوالے اور پھر اشعار کے انتخاب کی بدولت یہ مضمون اس کتاب کے جملہ مضامین میں خصوصی اہمیت کا حامل نظر آتا ہے۔ فاضل مصنف امام احمد رضا کے تذکرہ نعت میں یوں قلم



بار ہیں۔

”احمد رضا خان کی نعت عشق و عقیدت کی حسین داستان ہے۔ ایسی داستان کہ جس کا ایک ایک لفظ ذوق و شوق کی کیفیات سے بہرہ ور کرتا اور عنایاتِ حضوری علیہ الصلوٰۃ والسلام کا حقدار ٹھہراتا ہے۔ نعت میں عشق و عقیدت کو وہی حیثیت حاصل ہے جو پھول میں خوشبو کو، خوشبو پھول کے باطنی حسن کو اُجاگر کرتی اور اس کی حقیقی پہچان بن جاتی ہے۔ احمد رضا بہت بڑے محبت رسول ﷺ ہیں۔ یہی عشق ان کا سرمایہ حیات ہے۔ یہی ادب و احترام ان کا اثاثہ عمل اور روحانی گدازان کے لیے ذریعہ نجات تھا۔“

محمد اکرم رضا نے اس تحقیقی دستاویز میں ڈیڑھ درجن کے قریب نعت گو شعراء کی فکرِ شعرو سخن کو موضوع تنقید بنایا ہے۔ ان کی تنقید کا انداز قابلِ تکریم ہے کیونکہ وہ بخوبی جانتے ہیں کہ اس شخصیت کو اپنی تحقیق و تنقید کا مرکز بنا رہے ہیں جس کو وصالِ رسول ﷺ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ توصیفِ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا شرف حاصل ہوتے ہی شاعر جبریل علیہ السلام کا ہمنوا ہو جاتا ہے۔ وہ سیدنا حسان بن ثابتؓ کے اندازِ عقیدت کو اپنے راستے کا نور بنا لیتا ہے۔ انہوں نے تحقیقی نثر پارے پیش کرتے ہوئے تنقیص یا معائب ڈھونڈنے کا انداز اختیار نہیں کیا کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ نعت گو شاعر تو معائب و معاصی کے پر آشوب راستوں سے بہت آگے نکل چکا ہوتا ہے۔ ہاں یہ بات الگ ہے کہ تمام شعراء کی فکری سربلندی یکساں نہیں ہوتی۔ تمام مدحت نگاروں کے ہاں مضامین کی یکسانیت نہیں ہوتی۔ بعض تو اس راہ پر نور پر چند قدم ہی آگے بڑھ پاتے ہیں اور بعض کے کشادہ ذہنوں پر مصحفِ ایمان کے ستارے اترنے لگتے ہیں۔ بعض شعراء زبان و بیان کے لحاظ سے قدرے لرزیدہ نظر آتے ہیں اور بعض کے قدموں میں تاریخ ساز استقامت اور راہِ حق میں برق رفتاری سے آگے بڑھنے کا جذبہ نظر آتا ہے۔ یہی محمد اکرم رضا کا مقصود و منتہا ہے۔ اسی بنا پر ان کو ہر نعت گو اپنی ذات سے زیادہ قابلِ توقیر اور بلند رتبہ نظر آتا ہے۔

پروفیسر رضا نے درجنوں مضامین میں نعت کی تعریف کا تعین کیا ہے۔ اس خوش بخت تنقید نگار پر لکھتے ہوئے بہت سے قلم پارے میری نگاہوں کی زینت بنے۔ بحمد اللہ حسن معانی اور فصاحت و بلاغت کا ایک دریا ہے جو کناروں سے اُچھل رہا ہے۔ جس کی زندگی مدحت نگاروں کی توصیف بیان کرتے ہوئے گزری ہو اس پر قلم قدرت کیوں مہربان نہ ہوگا اور بہترین الفاظ کیوں کر اس کا توشہ تحریر نہ بنے ہوں گے۔ نعت کی تعریف ان کے لفظوں میں ملاحظہ کیجئے۔

”نعت وہ نعمتِ خداوندی ہے جو قدرت کی طرف سے بندگانِ خاص کو عطا ہوتی ہے۔ نعت صاحبِ ایمان کا سرمایہ اعزاز اور ایک مردِ مومن کا افتخار ہے۔ جب الفاظِ عقیدت کا نم حاصل کرتے ہیں تو نعت ہوتی ہے۔ جب تراکیب اور استعارات کو حسنِ آرزو کی چمک عطا ہوتی ہے تو نعت ہوتی ہے۔ جب لفظوں



کو مرصع کاری و دیعت ہوتی ہے تو نعت ہوتی ہے۔ نعت پلکوں کی جھلملاہٹ، اشکوں کی جلوہ گری اور حضور نبی کریم ﷺ سے روحانی وابستگی کا نام ہے۔ جس طرح محبت کے لیے کچھ خاص دل مخصوص ہوتے ہیں کیونکہ یہ نغمہ ہر ساز پر گایا نہیں جاسکتا۔ اسی طرح نعتِ مصطفیٰ ﷺ کا نزول بھی ہر انسان کے قلب و فکر پر نہیں ہوتا بلکہ نعت منتخب شدہ غلامانِ رسول ﷺ کے دلوں کے مطلعِ فاران سے پھوٹی اور ان کے احساسات کو معنمر کر جاتی ہے۔“

پروفیسر محمد اکرم رضا نے اس کتاب میں جن شعراء کی کاوش کا تنقیدی جائزہ لیا ہے ان میں سے بہت سے اس دایرہ فانی سے کوچ کر چکے ہیں۔ اسکے ساتھ ساتھ انہوں نے عصرِ حاضر میں موجود اور نوجوان نعت گو شعراء کا جائزہ بھی پیش کیا ہے تاکہ احساس ہو سکے کہ نعتیہ تنقید کے خدو خال کسی بھی دور میں مدہم نہیں ہوئے بلکہ ہر آنے والا دور نعت اور اس کے حوالے سے نعتیہ تنقید کی روایات کو بڑی والہانہ باقاعدگی کے ساتھ آگے بڑھا رہا ہے۔ دوسرے مدحت نگاروں کا تحقیقی جائزہ لیتے ہوئے پروفیسر رضا نے محبت کے حوالے سے میری نعت گوئی پر تذکرہ بھی شامل اشاعت کر دیا ہے۔ اپنے نام کے حوالے سے پیشوائی رقم کرتے ہوئے جھجک محسوس ہوئی مگر ایک تو برادر عزیز محمد اکرم رضا کا اصرار اور دوسرے میں نے اپنے بارے میں مضمون کا ابھی تک مطالعہ نہیں کیا۔ اس لیے اپنے بارے میں ان کی رائے سے بے نیاز ہو کر یہ سطور رقم کر رہا ہوں۔ یہ تعارفی کلمات ہر شاعر پر ناقد کے تاثرات کو سمونے سے قاصر ہیں تاہم دو تین عزیز و مداحانِ رسول ﷺ کے بارے میں ان کی تنقیدی شگفتگی کی اختصاراً جھلک دیکھئے۔

برصغیر کے عظیم خطیب صاحبزادہ سید فیض الحسن شاہ کی نعت گوئی کو انہوں نے ہی دریافت کیا اور ان کی نعتیہ شاعری پر ایک معیاری کتاب مرتب کی۔ ان کے بارے میں لکھتے ہیں۔

”صاحبزادہ سید فیض الحسن ایک بہت بڑے علمی و روحانی گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ گھر میں آنکھ کھولتے ہی علم و ادب کا غیر معمولی چراغ دیکھا۔ قدرت نے طبع موزوں عطا کی تھی اس لیے چھوٹی عمر میں ہی خوبصورت اشعار کہنے لگے۔“

عابد نظامی کے حوالے سے ان کے تاثرات دیکھئے۔

”عابد نظامی ایک راست فکر ادیب اور شاعر ہیں۔ سرکارِ دو عالم ﷺ کی عظمت و حقانیت پر غیر متزلزل ایمان رکھتے ہیں۔ فکری اور روحانی راہنمائی کے لیے ان کی نگاہیں ماسکویا واشنگٹن کی طرف نہیں اٹھتیں بلکہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ ان کی نظریاتی منازل ہیں۔“

راجہ رشید محمود کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

”ان کا مدعائے عشق نگہ الطاف حضور ﷺ ہے۔ ان کے تصورات تجلیاتِ حسن حضور ﷺ سے آباد



ہیں تو احساسات سیرت مصطفیٰ ﷺ کی جلوہ افروزیوں سے جگمگا رہے ہیں۔ یہ اپنے آقا و مولا کی حیاتِ مقدسہ کے ہر پہلو کو حاصل ایمان بنائے ہوئے ہیں۔“

نظیر حسین نظیر لدھیانوی کی بزرگی اور طویل شعری سفر کو سلام عقیدت پیش کرتے ہیں۔  
 ”صاحبو! آج انہیں دیکھ لو۔ اپنی نگاہوں میں سمیٹ لو۔ قبل اس کے کہ یہ حسین عہدِ حال پر ملال ماضی میں تبدیل ہو جائے، نظیر لدھیانوی کی صحبت کو غنیمت جانو۔ کہیں سے آبِ بقائے دوام ڈھونڈ لو۔“  
 قمریزدانی روشن ماضی کے پس منظر میں عہدِ حال کا اعزاز ہیں۔ ان کے لیے یہ تجزیاتی سطور دیکھئے۔  
 ”ان کا ماضی مدحتِ رسول ﷺ کے احساس سے آباد ہے اور ان کا حال شائے رسول کی رفعتوں سے بہرہ ور ہے اور مستقبل کا پھوٹتا ہوا سویرا ان کی دینی و اخروی سرخروئی کی نوید دے رہا ہے۔“

ہم نے فقط ”پیشوائی“ کے تعارفی تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے چند شعراء کے بارے میں مصنف کے قدرے طویل اور انتہائی مختصر اقتباسات پیش کیے ہیں تاکہ اندازہ لگایا جائے سکے کہ محمد اکرم رضا فصاحت کے ساتھ ساتھ بلاغت کے ہنر سے بھی کما حقہ آگاہ ہیں کیونکہ جملہ نثری، ادبی اور تنقیدی لوازمات کے پہلو بہ پہلو فصاحت و بلاغت ہم سفر نہ ہوں تو پھر کوئی بھی مصنف اپنے مافی الضمیر کو کہیں بھی روکنے کی قدرت سے محروم ہوتا ہے۔ بحمد اللہ ”قافلہ شوق کے مسافر“ میں بعض شخصیات پر طویل مضامین بھی ہیں اور بعض پر مختصر بھی اور جن شخصیات کے فکرو فن پر تفصیل سے تبصرہ کیا گیا ہے وہ واقعی اس سے بھی زیادہ زبردست اور سیر حاصل خراج تحسین کی مستحق تھیں۔

میری دعا ہے کہ ان کی زیر نظر کتاب ”کاروانِ نعت کے حدی خواں“ سے بڑھ کر قبولیت و پذیرائی کی حقدار قرار پائے کیونکہ عصر حاضر میں نعت میں تنقیدی رویوں کو فروغ دینے کا جو شعور پیدا ہوا ہے وہ پہلے نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں دعا گو ہوں کہ انہوں نے نثر میں جو بیش بہا نعتیہ تنقیدی سرمایہ منتقل کیا ہے اس کی شایانِ شان اشاعت کا اہتمام بھی ہوتا رہے۔ چھوٹا بھائی سمجھتے ہوئے میرا ان سے یہ محبت آمیز تقاضا بھی ہے۔

بیماری کی یلغار اپنی جگہ مگر فروغِ نعت کے حوالے سے اس کتاب پر تاثراتی تحریر لکھتے ہوئے یک گونہ روحانی مسرت کا احساس ہوا ہے۔ محمد اکرم رضا سے دیرینہ تعلق خاطر اور نعتیہ رفاقت کے حوالے سے میں از خود اس خواہش کا اظہار کر رہا ہوں کہ ان کا مجموعہ نعت جلد از جلد طلوع ہو اور خدا مجھے توفیق دے کہ اس کی پیشوائی کے لیے بھی میرا قلم بارگاہِ رسول ﷺ میں عقیدتوں اور آنسوؤں کا نذرانہ پیش کر سکے۔

پروفیسر حفیظ تائب



## شاعر مشرق علامہ محمد اقبالؒ

### ایوانِ نعت میں

شاعر مشرق علامہ محمد اقبال کا شمار ان عظیم فرزندِ انِ اسلام میں ہوتا ہے جنہیں قدرت کسی بڑے مقصد کی تکمیل کے لیے دُنیا میں بھیجتی ہے۔ اس سے عظیم مقصد اور کیا ہو سکتا تھا کہ انہوں نے اس وقت اپنی شاعری کے اُجالوں سے ظلمات کے طلسم کو پارا پارا کیا کہ جب ان ظلمتوں کے خاتمے کا تصور کرنا بھی محال تھا۔ فقط برصغیر ہی نہیں بلکہ دنیا بھر کے مسلمان استعماری قوتوں کی یلغار کے سامنے بے بس تھے۔ استعماریت کے اس طوفان کی یلغار اس قدر وحشت انگیز اور بلا خیز تھی کہ اسلامیانِ عالم نے اپنی غلامی کو نوشتہٴ تقدیر سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ اقبال کا وجود صحرائے غلامی میں بھٹکنے والے در ماندہ رہروں کے لیے صورِ اسرافیل ثابت ہوا۔ یہ صورِ اسرافیل ان کی انقلاب آفریں شاعری تھی۔ وہ انقلاب آفریں شاعری جو کبھی توحید اور خودی و بے خودی کا تصور بخشی ہے تو کبھی شاہینی پرواز کا سلیقہ بخشی ہے، جو کبھی فقر و خودداری کے آداب سکھلاتی ہے اور کبھی خانقاہوں سے نکل کر رسمِ شبیری ادا کرنے والے مردِ مومن کے قالب میں ڈھل جانے کا پیغام دیتی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اقبال کا ولولہ تازہ ہر دل پر درد کی آواز بن گیا۔ اس کا سبب وہ مؤثر لہجہ اور روحانی گداز تھا جو اسے محبتِ رسول ﷺ کے سبب عطا ہوا۔ علامہ اقبال نے محبتِ حضور کو اپنی عقیدت کا نم دیکر اس میں حدیِ خوانی کی تاثیر پیدا کر دی۔ وہ حدیِ خوانی کہ جس کی پر درد لے کا روانِ اسلام کو سوئے حجاز کا مزین کرنے کا بہانہ بن گئی۔

نغمہ کجا و من کجا سازِ سخن بہانہ ایست

سوئے حجاز می کشم ناقہٴ بے زمام را

ناقہٴ بے زمام کو سوئے حجاز کا مزین کرنے کے لیے اقبال نے عظمت و شانِ رسالت ﷺ کے قدسی نغمے سنائے۔ مدحت و توصیفِ مصطفیٰ ﷺ سے تاریک دلوں کو جگمگاہٹ عطا کر دی۔ یہ اُن کی پُر سوز نعتِ حضور ہی تھی جو ان کی انقلاب آفریں شاعری کے ہر پہلو کو آفاقیت عطا کر رہی ہے۔ اقبال کے تمام تصوراتِ عظمتِ رسول سے جلا پاتے ہیں۔ خواہ فلسفہٴ خودی و بے خودی ہو یا



فقرو شائینی پرواز کا ٹھیل۔ ہر مقام پر انوارِ مصطفیٰ کی ضو باری نظر آتی ہے حتیٰ کہ توحیدِ خداوندی کے حقیقی عرفان کے لئے بھی وہ تجلیاتِ مصطفویٰ سے قلب و جان کو جگمگانے کا پیغام دیتے ہیں۔ خدائے کریم نے محبت رسول ﷺ کو اپنی محبت قرار دے کر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حاصلِ ایمان قرار دیا ہے۔ علامہ محمد اقبال کا یہ شعر حقیقت میں نعتِ مصطفیٰ کے حوالے سے نبی کریم ﷺ کو حاصلِ ایمان سمجھنے کا دیباچہ اول ہے۔

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اُوست

اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

علامہ اقبال کی نعت مروجہ نعتیہ اسالیب سے الگ نظر آتی ہے۔ انہوں نے نعت کا عنوان دے کر نعت نہیں کہی۔ انہوں نے مسلسل نعتیہ قصائد نہیں لکھے۔ قافیہ اور ردیف کے التزام سے نعت گوئی کو شعاری شاعری نہیں بنایا۔ اپنے معاصر شعراء کی طرح کوئی نعتیہ دیوان اپنی یادگار نہیں چھوڑا لیکن اس کے باوجود ان کی شاعری توصیفِ رسول، محبتِ محبوبِ خدا اور عشقِ سرور کائنات ﷺ سے عبارت نظر آتی ہے۔ اُردو شاعری ہو یا فارسی شاعری ہر جگہ سرور کائنات کی عقیدت اور آپ کے پیغام کی جلوہ گری نظر آتی ہے۔ ان کی نعت گوئی کا انداز زمانے بھر سے جدا تھا وہ تو اسلامیانِ عالم کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کے لیے آئے تھے اور ان کے نزدیک یہ بیداری اس وقت تک ممکن نہیں تھی جب تک عشقِ حضور ﷺ کو مرکزِ ایمان سمجھ کر راہِ فکر کو اس مرکزِ ایمان کے گرد طواف کرنے پر آمادہ نہ کیا جائے یہی احساس ان کے اشعار کو عشق کی معجز نمائی کا عرفان بخشتا ہے۔ فقیر سید وحید الدین لکھتے ہیں:

”ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم کی سیرت اور زندگی کا سب سے زیادہ

ممتاز محبوب اور قابلِ قدر وصف جذبہ عشق رسول ﷺ ہے۔ ذات

رسالتِ مآب ﷺ کے ساتھ انہیں جو والہانہ عقیدت تھی اس کا اظہار ان کی

چشمِ نمناک اور دیدہ تر سے ہوتا تھا کہ جہاں کسی نے حضور ﷺ کا نام ان

کے سامنے لیا ان پر جذبات کی شدت اور رقت طاری ہو گئی اور آنکھوں

سے بے اختیار آنسو رواں ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ کا نام آتے ہی اور ان

کا ذکر چھڑتے ہی اقبال بے قابو ہو جاتے تھے۔“

فقیر صاحب ہی لکھتے ہیں کہ

”ڈاکٹر صاحب کا دل عشقِ رسول نے گداز کر رکھا تھا۔ زندگی



کے آخری زمانے میں تو یہ کیفیت اس انتہا کو پہنچ گئی تھی کہ بچکی بندھ جاتی تھی۔ آواز بھرا جاتی تھی اور کئی کئی منٹ مکمل سکوت اختیار کر لیتے تھے تاکہ اپنے جذبات پر قابو پا سکیں اور گفتگو جاری رکھ سکیں۔“

فقیر سید وحید الدین کی فیملی کو علامہ اقبال سے بہت قربت کا رشتہ بھی رہا ہے اور علامہ بھی اس خاندان کے مختلف افراد سے پیار کرتے تھے۔ فقیر وحید الدین کی تحریر ہمیں شاعر مشرق کے اس روحانی گداز سے آگاہ کرتی ہے جو انہیں محبت رسول ﷺ کے سبب سے عطا ہوا تھا۔ اسی روحانی گداز نے انہیں فکری اور نظریاتی طور پر سرور کائنات سے بے پناہ چاہت عطا کر دی یہی چاہت ان کی مدحت طرازیوں کا اعزاز بن کر جھلکتی نظر آتی ہے۔

علامہ اقبال کی نعت مروجہ اسالیب نعت سے ہٹ کر ہے۔ ”ارمغان حجاز“ کو چھوڑ کر ان کی کتابوں کے عنوانات بھی نعتیہ نہیں ہیں وہ بطور خاص نعت نہیں کہتے مگر نعت ان سے ہو جاتی ہے۔ وہ ملت اسلامیہ کو درپیش مسائل کا تذکرہ کریں۔ صحابہ رسول کی قربانیوں کی داستان چھیڑیں۔ عالم اسلام کے دکھوں کا ماجرا بیان کریں۔ اسلامی مبادیات کا ذکر کریں۔ مسلمانوں کو ان کا بھولا ہوا ماضی یاد دلائیں۔ توحید خداوندی کو اپنا موضوع بنائیں۔ خودی و خودداری کے اسرار بیان کریں۔ اصحاب ہمت کی شاہینی اڑان کو عنوان شاعری بنائیں۔ مرد مومن کے اوصاف کا تذکرہ کریں۔ اسلامی تہذیب کا باطل اور غیر اسلامی تہذیبوں سے موازنہ کریں۔ عالمی دانشوروں کے افکار کا جائزہ لیں۔ خدائے کریم سے مسلمانوں کی زبوں حالی کا شکوہ کریں یا خود ہی شکوہ کا جواب بھی تحریر کریں۔ خاک حجاز کا ایمان آفریں فسانہ چھیڑیں۔ غازیان اسلام کو خراج عقیدت پیش کریں۔ مسلمانوں کو ان کا بھولا ہوا ماضی یاد دلائیں، اپنی قلبی واردات پر سے پردہ اٹھائیں یا اپنی روحانی تگ و تاز کو آشکارا کریں۔ تہذیب مغرب کا نوحہ لکھیں یا تاریخ کے حوادث و واقعات کو قلم بند کریں۔ مسجد قرطبہ پر قلم اٹھائیں یا اسلام کی عظمت رفتہ کا نوحہ اپنی بانگ درا کا موضوع بنائیں..... حق تو یہ ہے کہ اقبال کسی نہ کسی صورت آقائے دو عالم ﷺ کے حضور اپنی جبین عقیدت خم کر دیتے ہیں۔ محبت رسول ﷺ اپنی جلوہ کاری دکھلا جاتی ہے۔ یہ اقبال کی دانستہ کاوش کا اثر نہیں بلکہ اس کے پس پردہ وہ جذبہ عقیدت مصطفیٰ ﷺ کا فرما ہے جو زندگی کی آخری سانسوں تک ان کے لیے شمع راہ عمل بنا رہا۔

اقبال کی نظروں میں مقام رسالت کیا ہے اور حضور ﷺ کی انقلاب آفریں ذات اقبال کے احساسات کو کس طرح اپنی گرفت میں لے لیتی ہے؟ فرماتے ہیں:



در دلِ مسلم مقامِ مصطفیٰ است  
 آبروئے ما ز نامِ مصطفیٰ است  
 طور موجے از غبارِ خانہ اش  
 کعبہ را بیتِ الحرم کا شانہ اش  
 بویا ممنونِ خواب را حتش  
 تاجِ کسریٰ زیرِ پائے امتش  
 در شبتانِ حرا خلوتِ گزید  
 قوم و آئین و حکومتِ آفرید  
 ماند شبہا چشمِ او محرومِ نوم  
 تابہ تختِ خسروی خوابید قوم  
 وقتِ ہیجا تیغِ او آہنِ گداز  
 دیدہ او اشکبارِ اندر نماز

علامہ اقبال کے تصوراتِ محبتِ رسول سے بھرپور ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جہاں جہاں بھی  
 دنیائے رنگ و بو آباد ہے وہ ہمیشہ نورِ مصطفوی سے فیض حاصل کرتی رہے گی۔ ایسا نہیں تو وہ ابھی  
 مصطفیٰ کی تلاش میں ہے تاکہ اس مقدس اور برگزیدہ ذات سے اکتسابِ فیض کر سکے۔ علامہ کہتے ہیں:

ہر کجا بنی جہانِ رنگ و بو  
 آنکہ از خاکش بروید آرزو  
 یا ز نورِ مصطفیٰ او وا بہاست  
 یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ است

اقبال کی نعت گوئی بیشتر مقامات پر متفرق اشعار میں ملتی ہے مگر اس طرح کہ وہ اصل نظم  
 سے جدا نہیں لگتی۔ چونکہ اقبال مقصدیت کے شاعر تھے انہیں قدرت نے گونا گوں صفات سے نوازا  
 تھا۔ یہی صفات ان کے ہر پیغام کو محبتِ رسول کے حوالے سے دیکھنے کا سلیقہ بخشتی ہیں۔ حکیم سنائی  
 غزنوی کے مزار پر ان کا قلم جذبات کو مقصدیت کے سانچے میں ڈھالتا ہوا ایک نعتِ رسول ﷺ  
 کی خوشبو لٹانے لگتا ہے:

وہ دانائے سبل ختمِ الرسل مولائے کل جس نے  
 غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادی سینا



نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر  
وہی قرآں وہی فرقاں وہی یسین وہی طہ

”ذوق و شوق“ کا شمار علامہ اقبال کی شہرہ آفاق منظومات میں ہوتا ہے۔ اس نظم میں اقبال جذب و مستی کی کیفیات میں ڈوب کر امتِ اسلام کو پھر سے اپنے مقصدِ حقیقی کی جانب رجوع کرنے کا پیغام دیتے ہیں۔ اقبال نے اس معروف نظم کا بیشتر حصہ فلسطین میں لکھا جب وہ ۱۹۳۱ء میں موتمرِ عالمِ اسلامی کے وفد کے ہمراہ وہاں گئے ہوئے تھے۔ اس نظم میں اقبال زبان و مکان کے تصورات پر بات کرتے ہیں۔ انہیں ہر لحظہ یہی احساسِ دامن گیر ہے کہ وہ پیغمبروں کی سرزمین کا نظارہ کر رہے ہیں۔ اقبال اس نظم میں بھی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عظمتوں کو اس شان سے خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں کہ ان اشعار کی لطافت اور معنی خیزی آج تک اہل ایمان کے قلوب و اذہان کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے ہے۔ وہ اپنے باطن میں ڈوب جاتے ہیں کبھی خود کلامی کا لہجہ اختیار کرتے ہیں اور کبھی حوادثِ روزگار سے نئی زندگی کا پیغام لیتے ہیں۔ ان کی چشم پھر ان غازیوں، نمازیوں اور کشور کشاؤں کی آرزو مند ہوتی ہے جن کے دم سے ہمارا ماضی درخشاں تھا اور جن کا وجود آج بھی اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا پیغام دے سکتا ہے۔ تمام نظم میں اقبال کے ذوق و شوق کا محور ذاتِ سرورِ کونین ﷺ رہی ہے اور وہ پکاراٹھتے ہیں:

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب  
گنبدِ آگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب  
عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ  
ذرّہ ریگ کو دیا تو نے طلوعِ آفتاب  
شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود  
فقرِ جنید و بایزید تیرا جمالِ بے نقاب  
شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام  
میرا قیام بھی حجاب میرا سجود بھی حجاب  
تیری نگاہِ ناز سے دونوں مراد پا گئے  
عقل غیاب و جستجو عشق حضور و اضطراب

نعت و توصیفِ مصطفیٰ ﷺ کا حق اس وقت تک ادا نہیں ہوتا جب تک مدحت نگار اپنے ممدوح کے مقام و مرتبہ سے آگاہ نہ ہو۔ یہاں تو وہ ذاتِ والا صفات ممدوح ہے جو محبوبِ خدا بھی



ہے اور محبوب دو عالم بھی۔ دو عالم جس کی خوشنودی کے لیے تخلیق کئے گئے، جو جانِ بزمِ کائنات ہے، جس کی خاطر بزمِ ہستی سجائی گئی، جس کے لیے بزمِ کون و مکاں جگمگائی گئی، جس کے لیے چاند ستاروں کی چادر بچھائی گئی، جس کے لیے رنگ و بو کی خیرات لٹائی گئی۔ علامہ اقبال حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مقام و مرتبہ سے بخوبی آگاہ ہی نہیں بلکہ انہیں تو عشقِ حضور کی دولت اپنے والد گرامی سے میراث میں ملی ہے۔ یہی عشقِ رسول تھا جس نے یورپ کی فضاؤں میں بھی انہیں تہذیبِ یورپ کی چکاچوند سے محفوظ رکھا بلکہ کفر کی چکاچوند ان کے عشق و عقیدت کے اثاثے کو مزید دلاویزی بخش گئی۔ اسی لیے کہتے ہیں:

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوہ دانشِ فرنگ

سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

خاکِ مدینہ کا سرمہ ان کی چشمِ بصیرت کو حیرت انگیز قوتِ نظار عطا کرنے کا باعث بن گیا چونکہ آپ کی شاعری انقلابی تھی۔ یہ انقلاب کسی باطلِ نظریے کی کوکھ سے پیدا نہیں ہوا تھا بلکہ اس انقلاب نے تعلیماتِ حضور سے جنم لیا تھا یہی وجہ ہے کہ آپ کا تمام تر فلسفہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پیغام پر مبنی ہے۔ آپ جہاں مقاماتِ مصطفیٰ ﷺ کی تجلیات سے اہل ایمان کے دلوں کو ضو بار کرتے ہیں وہاں اس پیغام کو فراموش نہیں ہونے دیتے جو محبتِ رسول کے سبب سے جنم لیتا ہے۔ ”شکوہ“ اور ”جوابِ شکوہ“ علامہ اقبال کی معرکہ لا راءِ نظمیں ہیں۔ ”جوابِ شکوہ“ کے اختتام میں تمثیلی انداز میں زبانِ قدرت سے عشاقِ حضور کو پیغام دیتے ہیں۔ اس پیغام میں شانِ رسول ﷺ کی جلوہ گری کا کمال دکھائی دیتا ہے کہ اے امتِ اسلام محبوب دو عالم کی غلامی کر لو کہ اسی میں فلاحِ دارین ہے اور اس میں تمہارے مسائل کا حل ہے:

ہو نہ یہ پھول تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو

چمن دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو

یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو خم بھی نہ ہو

بزمِ توحید بھی دنیا میں نہ ہو تم بھی نہ ہو

خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے

نبضِ ہستی تپشِ آمادہ اسی نام سے ہے

دشت میں دامنِ کہسار میں میدان میں ہے

بحر میں، موج کی آغوش میں طوفان میں ہے

111288



چین کے شہر مراش کے بیابان میں ہے  
 اور پوشیدہ مسلمان کے ایمان میں ہے  
 چشمِ اقوام یہ نظارا ابد تک دیکھے  
 رفعتِ شانِ رفعتنا لک ذکرک دیکھے  
 عقل ہے تیری سپر عشق ہے شمشیر تری  
 مرے درویش خلافت ہے جہانگیر تری  
 ماسوا اللہ کے لئے آگ ہے تکبیر تری  
 تو مسلمان ہو تو تقدیر ہے تدبیر تری

کی محمد ﷺ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں

یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

اسی طرح اقبال ”رموزِ بے خودی“ کے آخر میں ۱۶۵ اشعار میں ”عرض حال مصنف بحضور  
 رحمۃ للعالمین“ کے عنوان سے ماجرائے عقیدت نذر کرتے ہیں۔ ان اشعار میں وہ محبوب خدا کی  
 عظمتوں کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی عرض کرتے ہیں کہ مسلمان کو حق اور  
 باطل کی پہچان عطا کر دیجئے۔ اپنی مقدس دیوار کے سائے میں مجھے مرقد عطا کیجئے تاکہ اس مقدس  
 سرزمین میں پہنچ کر میرے بے تاب دل کو چین نصیب ہو جائے اور آپ کے سایہ رحمت میں  
 آنے کے بعد میں آسمان سے اکڑ کر کہہ سکوں گا کہ دیکھ میرا عظیم انجام دیکھ۔ میری یہ بلند اقبالی اور  
 خوش بختی بھی دیکھو:

اے ظہور تو شبابِ زندگی  
 جلوہ ات تعبیر خوابِ زندگی  
 اے زمیں از باز گاہت ارجمند  
 آسماں از بوسہ بامت ارجمند  
 اے بصیری را ردا بخشندہ  
 بربط سلمیٰ مرا بخشندہ  
 ہست شانِ رحمت گیتی نواز  
 آرزو دارم کہ میرم در حجاز  
 کو کھم را دیدہ بیدار بخش  
 مرقدے در سایہ دیوار بخش



تابیا ساید دل بے تاب من  
بستگی پیدا کند سیماب من  
با فلک گویم کہ آرا مم نگر  
دیدہ . آغازم انجام نگر

علامہ اقبال نے بعض تاریخی واقعات کو اس حسن تاثر کے ساتھ منظوم کیا ہے کہ عظمتِ رسول خدا ﷺ خود بخود ہویدا ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اس ضمن میں آپ کی معروف نظم ”بلال“ اپنی جگہ نعت کی کیفیات نور کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔ نعت کیا؟ عظمتِ مصطفیٰ کا اظہار ہے۔ قلم اقبال کا ہے مگر زبان بلالؓ کی ہے۔ وہ بلال جو سرزمینِ حبش سے امیہ بن خلف کا غلام بن کر مکہ میں آیا۔ قبولیتِ اسلام کی پاداش میں اس پر ظلم و ستم کی انتہا کر دی گئی مگر یہی بلالؓ جب سرور کائنات کی غلامی کے حلقے میں آتا ہے تو اس کی غلامی پر زمانے بھر کی آزادیاں تصدق ہونے لگتی ہیں۔ اقبال کا معجز رقم قلم بلالؓ کی شانِ اسلامی کے پس پردہ آقائے دو عالم ﷺ کو کس طور خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے۔ اس کی ایک جھلک ملاحظہ ہو:

چمک اٹھا جو ستھرا ترے مقدر کا  
حبش سے تجھ کو اٹھا کر حجاز میں لایا  
ہوئی ہے اس سے ترے غمکدے کی آبادی  
تری غلامی کے صدقے ہزار آزادی  
وہ آستاں نہ چھٹا تجھ سے ایک دم کے لیے  
کسی کے شوق میں تو نے مزے ستم کے لیے  
مدینہ تیری نگاہوں کا نور تھا گویا  
ترے لیے تو یہ صحرا ہی طور تھا گویا  
ادائے دید سراپا نیاز تھی تیری  
کسی کو دیکھتے رہنا نماز تھی تیری  
اذاں ازل سے ترے عشق کا ترانہ بنی  
نماز اس کے نظارے کا اک بہانہ بنی  
خوشا وہ وقت کہ یثرب مقام تھا اس کا  
خوشا وہ دور کہ دیدار عام تھا اس کا



نعت صرف لفظوں کی جادوگری یا الفاظ کی ساحری نہیں، نہ ت لفظ مصرعوں کے روایتی شکوہ سے جنم نہیں لیتی، یہ محض اشعار کے ظاہری محاسن سے عبارت نہیں ہے بلکہ نعت تولذت عشق حضور عطا کرتی ہے۔ اگر عشق کی لذت نصیب نہ ہو تو نعت کیسی؟ اگر محبت کا گداز میسر نہ ہو تو نعت کیسی؟ اگر نالہ شوریدہ سرسینہ چاک نہ کر دے تو نعت کیسی؟ اس تناظر میں ”جنگ یرموک کا ایک واقعہ“ محض واقعاتی حسن کا آئینہ دار نہیں بلکہ جوں جوں یہ نعتیہ نظم آگے بڑھتی ہے آنکھیں نمناک ہونے لگتی ہیں۔ سوزِ دروں احساسات کے خلوت کدوں کو درہم برہم کرنے لگتا ہے۔ مکالماتی انداز ہے مگر کمال کا اظہار عقیدت ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ جب جو انانِ اسلام عسا کرِ کفر کے خلاف صف بستہ تھے تو ایک شہادت کا متمنی مردِ مسلمان، سپہ سالار حضرت ابو عبیدہؓ سے رخصت کا طلب گار ہو کر یوں گویا ہوا:

جاتا ہوں میں حضور رسالت پناہ میں  
 ”لے جاؤں گا خوشی سے اگر ہو کوئی پیام“  
 بولا امیر فوج کہ وہ نوجواں کہے تو  
 پیروں پہ تیرے عشق کا لازم ہے احترام  
 پوری کرے خدائے محمد ﷺ تری مراد  
 کتنا بلند تیری محبت کا ہے مقام  
 پہنچے جو بارگاہِ رسولِ امیں میں تو  
 کرنا یہ عرض میری طرف سے پس از سلام  
 ہم پر کرم کیا ہے خدائے غیور نے  
 پورے کئے جو وعدے کئے تھے حضور نے

جس دور میں علامہ اقبال کی شاعری عالمِ اسلام کو بیداری حیات کا پیغام دے رہی تھی، وہ وقت مسلمانوں پہ بے حد کٹھن تھا۔ کوئی بھی اسلامی ملک صحیح معنوں میں آزاد نہیں تھا۔ باطل قوتیں عظمت اسلام کے لٹنے کا تماشا دیکھ رہی تھیں۔ وہ شیر جس نے صحرا سے نکل کر روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا اب بزدلی اور مصلحت کی کچھاروں میں پناہ ڈھونڈ رہا تھا۔ زمانہ ہنس رہا تھا کہ کیا یہ وہی مسلمان ہے جس کے نام کی ہیبت سے روما و ایران کی سلطنتیں لرز جایا کرتی تھیں؟ ایک طرف تو بے حسی اور قومی بے غیرتی اپنی انتہا پر تھی اور دوسری طرف مسلمان احساسِ زیاں سے بھی عاری نظر آتے تھے۔ احساسِ زیاں سے عاری ہونے کا المیہ اقبال کو زیادہ مضطرب کئے ہوئے تھا۔



وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا  
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا  
اقبال جانتے تھے کہ اگر احساسِ زیاں موجود ہو تو منزل کو ترقی میں، ذلت کو عزت میں، پستی  
کو بلندی میں اور غلامی کو آزادی میں بدلا جاسکتا ہے مگر احساسِ زیاں سے محرومی آزاد قوموں کی  
رگوں سے حمیت کا جذبہ چھین لیتی ہے۔ اسی اضطراب اور بے چینی میں اقبال اس آقائے رحمۃ  
للعالمین ﷺ کی درگاہِ بے کس نواز کی جانب رجوع کرتے ہیں جہاں سے غم کے ماروں کو قرار اور  
بے یقین کو یقین کی دولت عطا ہوتی ہے۔ جہاں ماجرائے غم عرض کرنے کا مقصد رحمت حضور کے  
حر بے کراں کو جوش میں لانا ہے۔ ان سے قبل کئی شعراء اپنے اپنے ادوار میں رنج و الم کی داستانیں  
سلطانِ دو عالم کو سنا کر مداوائے الم کے لیے شعری عرضداشتیں پیش کر چکے تھے۔ الطاف حسین حالی  
کی طرح:

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے  
امت پہ تیری آ کے عجب وقت پڑا ہے  
امتِ اسلام پر جو کڑا وقت آن پڑا تھا اس نے اقبال کا آرام و سکون لوٹ لیا تھا۔ اُردو اور  
فارسی منظومات، قطعات اور متفرق اشعار میں وہ اپنی ملتِ مملکت کی نگاہیں گنبدِ خضریٰ کی طلعت باریوں پر جما  
دیتے ہیں، اس احساس کے ساتھ کہ یہی وہ آخری ڈھارس ہے جو طوفانِ غلامی میں بہنے والوں کو  
سکون و عافیت کا کنارہ عطا کرے گی۔ اقبال کہتے ہیں کہ مجھے فرشتے بزمِ رسالت میں لے گئے تو  
حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا کہ اے باغِ جہاں سے پرواز کر کے مجھ تک آنے والے  
امتی تو ہمارے واسطے کیا تحفہ لے کر آیا ہے تو اقبال بصد احترام عرض کرتے ہیں:

حضور دہر میں آسودگی نہیں ملتی  
تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی  
ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاضِ ہستی میں  
وفا کی جس میں ہو بُو وہ کلی نہیں ملتی  
مگر میں نذر کو ایک آگینہ لایا ہوں  
جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی  
جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں  
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

بارگاہِ حضور ﷺ میں استغاثہ، امتِ اسلام کے حوالے سے مزید کچھ اشعار نذر قارئین ہیں:



کرم اے شہِ عرب و عجم کہ کھڑے ہیں منتظر کرم  
وہ گدا کہ تو نے عطا کیا ہے جنہیں دماغ سکندری  
اے بادِ صبا کملی والے سے جا کہو پیغام میرا  
قبضے سے امت بیچاری کے دیں بھی گیا دنیا بھی گئی

تو اے مولائے یثرب آپ میری چارہ سازی کر  
مری دانش ہے افرنگی، مرا ایمان زناری

شیرازہ ہوا ملتِ مرحوم کا ابتر  
اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے  
وہ لذت آشوب نہیں بحرِ عرب میں  
پوشیدہ جو ہے مجھ میں وہ طوفان کدھر جائے  
ہر چند ہے بے قافلہ و راحلہ و زاد  
اس کوہ و بیاباں سے حدی خوان کدھر جائے  
اس راز کو اب فاش کر اے روحِ محمد ﷺ  
آیاتِ الہی کا نگہبان کدھر جائے

نعت نام ہے عظمت و مقاماتِ حضور ﷺ سے وابستگی کا۔ محبوبِ کامل سے محبت کا اکمال  
بھی ہے کہ اس کی سیرت اور اُسوۂ حسنہ کو ہر پہلو سے قبول کیا جائے۔ علامہ اقبال کے زمانے میں  
کانگریس کے ہمنوا علماء نے اپنے کانگریسی دوستوں کی محبت میں نعرہ لگایا کہ ”قومی مذہب سے  
نہیں بلکہ اوطان سے بنتی ہیں۔“ یہ نظریہ سراسر تعلیماتِ مصطفوی کے خلاف تھا۔ برصغیر میں محمد بن  
قاسم کی امداد و قومی نظریہ اسلام کے لیے تھی۔ خواجہ معین الدین چشتی اجمیری، مجدد الف ثانی اور  
شیخ احمد سرہندی کی تعلیمات کا مرکز یہی نظریہ اسلام تھا کہ قومیں اوطان سے نہیں بلکہ مذہب سے  
بنتی ہیں۔ اس آزمائش کے وقت میں اقبال نے عشقِ رسول ﷺ کا حق ادا کیا اور اپنی منظومات اور  
خطبات کے ذریعہ واضح کیا کہ اگر دو قومی نظریہ اسلام کو فراموش کر دیا جائے تو ہمارے پاس ہندو  
اور انگریز کے خلاف میدانِ عمل میں آنے اور ایک مسلم ریاست کو قائم کرنے کا کیا جواز رہتا ہے؟  
اقبال کی دو قومی نظریہ کے حوالے سے اس نظریہ کے دشمنوں اور مخالفین کے خلاف معرکہ آرائی کو ان



کے جذبہ عشق رسول سے الگ کر کے نہیں دیکھا جاسکتا کیونکہ وہ تو اس نظریہ کی بنیاد ہی محبت رسول کو قرار دیتے ہیں:

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر  
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی  
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار  
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تیری  
ایک جگہ کہتے ہیں :

یہ بت کہ تراشیدہ تہذیب نوی ہے  
غارت گر کاشانہ دینِ نبوی ہے  
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے  
اسلام ترا دین ہے تو مصطفوی ہے  
نظارہ دیرینہ زمانے کو دکھا دے  
اے مصطفوی! خاک میں اس بت کو ملا دے  
درج ذیل دو اشعار محبت رسول کے حوالے سے دو قومی نظریہ کی کیا خوب وضاحت کر  
رہے ہیں:

سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است  
چہ بے خبر ز مقامِ محمد ﷺ عربی است  
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست  
اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی است  
عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ  
ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بواجبی است  
ان تمام تصورات کے پس پردہ یہ عقیدہ کارفرما تھا۔

یہ نکتہ پہلے سکھایا گیا کس امت کو  
وصالِ مصطفوی ، افتراقِ بولہبی  
نہیں وجودِ حدود و ثغور سے اس کا  
محمد ﷺ عربی سے ہے عالمِ عربی



ارمغانِ حجاز میں سب سے پہلے جو رباعیاں اور قطعات ہیں ان کا عنوان ہے ”حضورِ حق“۔ ان میں دو رباعیاں حضور ﷺ سے جس عقیدت کا اظہار کرتی ہیں وہ بے مثال ہے۔ ایک رباعی میں فرماتے ہیں ”جب یہ عالم اختتام کو پہنچے اور ہر پوشیدہ چیز آشکار ہو جائے اور اعمال کی باز پرس ہونے لگے تو اے رب العزت ہمارے اعمال بد کی پرشش آپ ﷺ کی نظروں سے چھپا کر کیجئے تاکہ آپ ہم عاصیوں کو دیکھ کر پر ملال نہ ہوں:

بہ پایاں چوں رسد ایں عالمِ پیر  
شود بے پردہ ہر پوشیدہ تقدیر  
مکن رسوا حضورِ خواجه ما را  
حسابِ من ز چشم او نہاں گیر

اسی طرح اگلی رباعی میں عجب ذوق و شوق کا مظاہرہ کرتے ہیں حضورِ حق میں کہتے ہیں کہ جسم تو یہاں مکہ میں پڑا ہے اور رُوح بے تاب و قرار ہے۔ اس شہرِ پاک کی آرزو میں کہ بطحا (مکہ) بھی جس کی راہ میں ایک منزل ہے تو اے خدا! تو یہیں بے شک مکے میں رہ (کہ تیرا گھر یہی ہے) اور اپنے دوستوں کو قرب کی منزل سے نواز مگر مجھے تو منزلِ دوست (مدینے) پہنچنے کی آرزو ہے مجھ سے یہاں اور زیادہ توقف ممکن نہیں ہے:

بدن و ماند و جانم در تگ و پوست  
سوئے شہرے کہ بطحا در رہ اوست  
تو باش ایں جا و یا خاصاں پیامیز  
کہ من دارم ہوائے منزلِ دوست

ایک اور مقام پر دیکھئے کہ خودی کی خلوت و جلوت کا تصور اجاگر کرتے ہوئے اپنے آقا سے عقیدت کو واضح کرتے ہیں:

خودی کی جلوتوں میں مصطفائی  
خودی کی خلوتوں میں کبریائی  
زمین و آسمان و کرسی و عرش  
خودی کی زد میں ہے ساری خدائی

یہ فطری امر ہے کہ محبوب سے محبت کے سبب سے اس کی ہر چیز عزیز ہوتی ہے اور خاص طور پر محبوب جس زمین میں جلوہ فرما ہوتے ہیں اس کی عظمت کے کیا کہنے۔ چاہنے والے کے لیے تو قیام گاہِ محبوب زمانے بھر سے اعلیٰ مقام رکھتی ہے:



خاکِ یثرب از دو عالم خوشتر است  
آں خنکِ شہرے کہ دروے دلبر است

اقبال کے لیے سرزمینِ طیبہ عشق و عقیدت کی سرزمین ہے۔ جہاں کے ذرے ذرے سے انوارِ الہی کا ظہور ہو رہا ہے۔ جہاں کی فضا میں سرورِ کائنات ﷺ کی خوشبوئے دل نواز لیے ہوئے ہیں۔ اس سرزمین پر وہ خوابِ گاہِ مصطفیٰ ہے کہ جس کا فرشتے بھی طواف کرتے ہیں۔ جہاں پہنچ کر جنید و بایزیدؒ نفسِ گم کردہ ہو جاتے ہیں۔ مدینہ جو اہل نظر کے لیے لطف و رحمت کا خزینہ ہے اور انوارِ فطرت کا گنجینہ ہے۔ نعت گو شعراء نے مدینہ طیبہ کی تجلیات کو دلوں میں سمو کر اس عظیم ترین شہر کو بہترین لفظوں میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ علامہ اقبال بھی جب اس شہر آرزو کا تصور کرتے ہیں تو ان کی کیفیت ہی بدل جاتی ہے۔ اقبال کے اولین سیرت نگار ڈاکٹر محمد طاہر فاروقی کہتے ہیں:

”یورپ سے واپسی پر آپ کے تاثرات نے ”بلادِ اسلامیہ“ مشہور نظم میں ظہور کیا۔ آپ اسلامی شان و شکوہ دولت و اقبال، عظمت و شوکت کے ان روشن اور تابناک مرکزی مقامات کو یاد کرتے ہیں اور حسرت و افسوس سے مسلمانوں کے عظمت و جلالِ گزشتہ کا ذکر کرتے ہیں جن کا ظہور دہلی، بغداد، قرطبہ، قسطنطنیہ جیسے عظیم مرکروں سے صدیوں تک ہوتا رہا اور جو سارے عالم کے لیے علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کا خزانہ اور سرچشمہ بنے رہے مگر یہ تمام عظمت و شوکت کے مینار ”خوابِ گاہِ مصطفیٰ“ کے تقدس اور جلال پر قربان ہیں۔“

اس نظم کے آخری بند میں اقبال مدینہ طیبہ کی طلعتوں اور تجلیات کو جس طور خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں اس سے محبت رسول کی نئی امنگ دل و جان میں جلوہ گر ہونے لگتی ہے اور عظمت حضور ﷺ سے اسلام کی شوکتِ رفتہ کا تصور ایک نئے انداز سے جلوہ گر ہونے لگتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں:

وہ زمیں ہے تو مگر اے خوابِ گاہِ مصطفیٰ  
دید ہے کعبے کو تیری حجِ اکبر سے سوا  
خاتمِ ہستی ہے تو تاباں ہے مانندِ نگین  
اپنی عظمت کی ولادت گاہ تھی تیری زمیں



تجھ میں راحت اس شہنشاہِ معظم کو ملی  
جس کے دامن میں اماں اقوامِ عالم کو ملی



نام لیوا جس کے شاہنشاہِ عالم کے ہوئے  
جانشینِ قیصر کے، وارثِ مسندِ جم کے ہوئے  
آہِ یثرب دیں ہے مسلم کا تو ماوا ہے تو  
نقطہِ جاذبِ تاثر کی شعاعوں کا ہے تو  
جب تلک باقی ہے تو دنیا میں باقی ہم بھی ہیں  
صبح ہے تو اس چمن میں گوہرِ شبنم بھی ہیں

کہتے ہیں کہ خوشبو کو دیکھ کر پھول کی دلاویزی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ کرنیں چاند کی تجلیات اور شعاعیں سورج کی ہمہ گیری کا اظہار ہوتی ہیں۔ اسی طرح محبِ صادق کی طلبِ صادق، جذبہِ ایثار، قربانی و استقامت اور عشق میں والہانہ پن کو دیکھ کر محبوب کے حسن کی جاذبیت اور تاثر انگیزی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے اور اقبال کا محبوب تو محبوبِ خدا و ملائکہ ہے۔ یہ وہ محبوب ہے جس کی خاطر کونین تخلیق ہوئے۔ اسی محبوب دو عالم محمد مصطفیٰ ﷺ کے عشاق اور جانثاروں کو دیکھ کر آپ کی عظمت و تقدیس کا اندازہ ہوتا ہے۔ علامہ اقبال ”غزوہ تبوک“ کا ذکر کرتے ہیں اور حبِ رسول میں ڈوب جانے والے دوسرے عشاق کے پہلو بہ پہلو عظیم جانثار رسول سیدنا صدیق اکبر کا ذکر جس دلاویز انداز سے کرتے ہیں اس سے سلطانِ مدینہ کی کشش اور تاثر انگیزی کا حیرت انگیز حد تک خوبصورت اندازہ ہوتا ہے۔ غزوہ تبوک میں مسلمانوں کے پاس ساز و سامان تھا اور نہ ہی ہتھیار، جنگ ناگزیر تھی۔ سلطانِ مدینہ ﷺ نے امداد کی اپیل کی تو مخیر صحابہ اپنا اپنا اثاثہ لے کر بارگاہِ رسول ﷺ میں حاضر ہونے لگے۔ اس نظم کے اختتامی اشعار دیکھئے:

اتنے میں وہ رفیقِ نبوت بھی آ گیا  
جس سے بنائے عشق و محبت ہے استوار  
بولے حضور ”چاہیے فکرِ عیال بھی“  
کہنے لگا وہ عشق و محبت کا رازدار  
”اے تجھ سے دیدہ مہ و انجم فروغ گیر  
اے تیری ذات باعثِ تلوینِ روزگار



پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس  
صدیق ” کے لیے ہے خدا کا رسول ” بس“

اقبال کی متفرق منظومات سے چند نعتیہ اشعار۔ ان منظومات میں سے کسی کا عنوان بھی  
”نعت“ نہیں ہے مگر ہر شعر اپنے اندر بے شمار نعتیہ مضامین کو سموئے ہوئے ہے:

سالارِ کارواں ہے میر حجاز اپنا  
اس نام سے ہے باقی آرام جاں ہمارا

ہوا ہوا ایسی کہ ہندوستان سے اے اقبال  
اڑا کے مجھ کو غبارِ رہِ حجاز کرے

اوروں کو دیں حضور یہ پیغامِ زندگی  
میں موت ڈھونڈتا ہوں زمینِ حجاز میں

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے  
دہر میں اسم محمد ﷺ سے اُجالا کر دے

تازہ مرے ضمیر میں معرکہ کہن ہوا  
عشق تمام بمصطفیٰ عقل تمام بولہب

محبت رسول تقاضا کرتی ہے کہ جس سے محبت کی جائے اس کی کامل اتباع کی جائے۔  
محبت صرف لفظی ساحری نہیں ہے۔ یہ محض ایک خوشنما لفظ نہیں ہے بلکہ اس کے پس پردہ ایک مکمل  
فلسفہ اطاعت پوشیدہ ہے۔ رب کریم نے اپنے محبوب ﷺ کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے کہ

من يُطع الرسول فقد اطاع الله

یعنی جس نے اللہ کے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ ہی کی اطاعت کی۔

علامہ اقبال بھی اس حوالے سے نبی کریم ﷺ کی غیر مشروط فکری، علمی، نظری اور عملی  
اطاعت اور اتباع کے قائل ہیں۔ آپ بجا طور پر سمجھتے ہیں کہ کامل اتباع کے بغیر ملت اسلامیہ کے  
غموں کا علاج ممکن نہیں۔ اس حقیقت کو واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر ترقی کی آرزو ہے تو خدا  
سے لو لگا کر محمد مصطفیٰ ﷺ کے راہِ مستقیم پر گامزن ہو جاؤ پھر تمہیں وہ عروج ملے گا جس کا تصور بھی



محال ہے۔

بمزل کوش مانندِ مہ نو  
دریں نیلی فضا ہر دم فزوں شو  
مقامِ خویش اگر خواہی دریں دہر  
بجق دل بند و راہِ مصطفیٰ رو

وہ اس ضمن میں حضرت بایزید بسطامیؒ کی مثال دیتے ہیں کہ ان کی اتباع رسولؐ اور تقلید نبویؐ کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے ساری عمر محض اس لیے خر بوزہ نہ کھایا کہ انہیں معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ رسول خدا ﷺ نے خر بوزہ کس طرح کھایا تھا۔

کاملِ بسطام در تقلید فرد  
اجتناب از خوردنِ خر بوزہ گرد  
عاشقی؟ محکم شو از تقلید یار  
تا کند تو شود یزداں شکار

اسی طرح آپ ایک غزوہ میں حاتم طائیؓ کی بیٹی کے قید ہونے اور حضور نبی کریم ﷺ کا ان کے سر پر ردائے رحمت رکھنے کا پیغام دے کر فرزند ان اسلام کو اس حوالے سے اطاعتِ مصطفیٰ کا دل نشیں سبق دیتے ہیں۔

در مصافے پیش آں گردوں سریر  
دخترِ سردارِ طے آمد اسیر  
پائے در زنجیر و ہم بے پردہ بود  
گردن از شرم حیا خم کردہ بود  
دخترک را چوں بنی بے پردہ دید  
چادرِ خود پیش روئے او کشید  
ما ازاں خاتونِ طے عریاں تریم  
پیش اقوامِ جہاں بے چادریم  
روزِ محشر اعتبارِ ماست او  
در جہاں ہم پردہ دار ماست او

یہ سوال ہر صاحبِ نظر کے لبوں پر ابھرتا ہے وہ اقبال جو تمام زندگی عشقِ مصطفیٰ ﷺ کے



آداب سکھاتا رہا، وہ اقبال جس کی شاعری کا روانِ اسلام کو منزلِ حجاز کی جانب گامزن کرتی رہی، وہ اقبال جس کے شب و روز محبتِ رسولؐ کے تذکار سے عبارت تھے۔ وہ اقبال جو محبتِ رسولؐ کے حوالے سے کسی سمجھوتے یا قیل و قال کا قائل نہ تھا۔ وہ اقبال کہ جس کی حضور ﷺ سے محبت کسی جواز یا دلیل کی محتاج نہیں تھی جو حضور کے نام پر جیتا رہا اور آخری دم تک محبتِ رسولؐ کے سرمدی نغموں سے سرمست ہی نہیں رہا بلکہ ایک زمانے کو سرمستی کے آداب سکھاتا رہا..... وہ اقبال بارگاہِ رسولؐ میں حاضری سے کیوں محروم رہا؟

مختلف تذکرہ نگاروں نے اس کی کئی وجوہات لکھی ہیں۔ کسی نے کہا کہ وہ نغمہٴ عشق کی لے کو تیز سے تیز تر کرتے گئے اور اسی میں زندگی بیت گئی۔ کسی نے لکھا کہ جب وہ گول میز کانفرنسوں کے سلسلہ میں باہر جاتے ہوئے فلسطین سے بھی گزرے تو خیال آیا کہ حجاز مقدس کا سفر بطورِ خاص ہونا چاہیے۔ کسی اور سفر کو اس سفر کے لیے وسیلہ نہیں بنانا چاہیے۔ ایک صاحبِ ذوق نے لکھا کہ ان کا عشقِ رسولؐ اس مقام کو پہنچا ہوا تھا کہ اگر وہ وہاں پہنچ جاتے تو پھر وہیں جان دے دیتے۔ ایک اور صاحبِ عشق نے کہا کہ اقبال کی مہجوری ایک زمانے کو لذتِ بخشنے کا بہانہ بن گئی۔ سب کی تاویلات اپنی جگہ بہر حال یہ امر انتہائی مسلمہ اور طے شدہ ہے کہ اقبال کا عشقِ رسولؐ اصحابِ نظر کی آبرو اور اہل شوق کے لیے حاصلِ جستجو تھا۔ فقیر سید وحید الدین لکھتے ہیں:

”جب ڈاکٹر صاحب راؤنڈ ٹیبل کانفرنس سے واپس آئے تو

والد صاحب مرحوم ان سے ملنے گئے۔ بڑی مدت بعد ایک دوسرے سے ملاقات ہوئی تھی اس لیے بڑے تپاک سے ملے اور ڈاکٹر صاحب سے ان کے سفر کے تجربات کے متعلق گفتگو ہونے لگی۔ والد صاحب مرحوم نے اثنائے گفتگو میں کہا ”اقبال! اگر تم یورپ ہو آئے، مصر اور فلسطین کی بھی سیر کی، کیا اچھا ہوتا کہ واپسی پر روضہٴ اطہر کی زیارت سے بھی آنکھیں نورانی کر لیتے۔“ یہ سنتے ہی ڈاکٹر صاحب کی حالت دگرگوں ہو گئی۔ چہرے پر زردی چھا گئی اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ چند لمحے تک یہی کیفیت رہی پھر کہنے لگے فقیر! میں کس منہ سے روضہٴ اطہر پر حاضر ہوتا۔“

مرزا جلال الدین بیرسٹر لکھتے ہیں:

”حضرت علامہ کی طبیعت کا یہ سوز و گداز عمر کے ساتھ ساتھ

بڑھتا گیا اور عشقِ رسولؐ میں ان کی سرشاری اور استغراق کمال کے درجے



پر جا پہنچا۔ آخر میں تو یہ حال ہو گیا تھا کہ ذرا حضورؐ کا نام کسی کی زبان پر آیا اور آپؐ کی آنکھیں پر غم ہو گئیں۔ اسی طرح آپؐ کو فریضہ حج کی ادائیگی اور روضہ مبارک کی زیارت کی شدید آرزو تھی جو وقت کے ساتھ ساتھ ترقی کرتی جاتی تھی۔ آخر زمانے میں بیماریوں اور ضعف کی وجہ سے چلنا پھرنا مشکل ہو گیا تھا مگر اس وقت بھی یہی لگن تھی کہ شاید طاقت عود کر آئے اور مجھے یہ مقدس سفر نصیب ہو جائے۔“

میر غلام بھیک نیرنگ تحریر فرماتے ہیں:

”اقبال کا قلبی تعلق حضور سرور کائناتؐ کی ذاتِ قدسی صفات سے اس قدر نازک تھا کہ حضور کا ذکر آتے ہی ان کی حالت دگرگوں ہو جاتی تھی اگرچہ وہ فوراً ضبط کر لیتے تھے۔ چونکہ میں بارہا ان کی یہ کیفیت دیکھ چکا تھا اس لیے میں نے ان کے سامنے تو کچھ نہیں کہا مگر خاص لوگوں سے بطور راز ضرور کہا کہ یہ اگر حضور پاکؐ کے مرقد پر حاضر ہوں گے تو زندہ واپس نہیں آئیں گے۔ وہیں جاں بحق ہو جائیں گے۔ میرا اندازہ یہی تھا اللہ بہتر جانتا ہے۔“

علامہ محمد اقبال دسمبر ۱۹۳۷ء کے ایک خط میں حضرت علامہ مخدوم الملک سید غلام میراں شاہ کو لکھتے ہیں:

”الحمد للہ کہ آپ خیریت سے ہیں اور حج کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ خدا تعالیٰ آپ کو یہ سفر مبارک کرے اور اس کے فرشتوں کی رحمتیں آپ کے شریک حال ہوں۔ کاش کہ میں بھی آپ کے ساتھ چل سکتا اور آپ کی صحبت کی برکت سے مستفیض ہوتا لیکن افسوس ہے کہ جدائی کے ایام ابھی کچھ باقی معلوم ہوتے ہیں۔ میں تو اس قابل نہیں ہوں کہ حضور ﷺ کے روضہ مبارک پر یاد بھی کیا جاؤں تاہم حضور ﷺ کے اس ارشاد سے جرأت ہوتی ہے کہ فرمایا ”الطالعون لی“ (گنہگار میرے لیے ہیں) امید ہے کہ آپ اس دربار میں پہنچ کر مجھے فراموش نہیں کریں گے۔“

یہ تمام اقتباسات اس حقیقت کی گواہی ہیں کہ اقبالؒ محبتِ رسولؐ میں دیوانہ وار تڑپ رہے



ہیں۔ ان کے تخیلات اور تصورات کی دنیا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے جلوؤں سے آباد ہے۔ ان کے افکار کا مرکز اور ان کے احساسات کا معدن حب رسول ہے۔ یہی محبت رسول ان سے زندگی بھر عشق و عقیدت کا خراج لیتی رہی۔ ان کی شبوں کا گداز، ان کی صبحوں کا نیاز، ان کی شاعرانہ تگ و تاز ان کی عاشقانہ جذباتیت سب کے پس پردہ سلطانِ مدینہ ﷺ کی چاہت جلوہ ریز نظر آتی ہے۔ ان کی نظم ”ذوق و شوق“ کا انداز اس امر کی علامت تھا کہ وہ خود کو دربارِ رسولؐ میں حاضری کے لیے تیار کر رہے ہیں۔ اقبال جسمانی طور پر تو دیارِ مصطفیٰ ﷺ میں حاضر نہ ہو سکے مگر زندگی کے آخری دور میں انہوں نے ”ارمغانِ حجاز“ کی دنیا آباد کر لی۔ انہوں نے تصورات کے دوش پر سفر کرتے ہوئے مدینہ طیبہ کی حاضری کا عزم کر لیا۔

یہ عجیب سفر نور تھا کہ اقبال کا جسم تو لاہور میں تھا مگر ان کے تخیلات شہرِ مدینہ کی جانب رواں دواں تھے۔ انہوں نے اپنے عشق و عقیدت کے سہارے تصورات کی دنیا آباد کر کے اس طور سفر کا آغاز کیا کہ اگر کوئی حقیقتِ حال سے آگاہ نہ ہو تو اسے خبر ہی نہیں ہوتی کہ اقبال کا یہ سفر جسمانی نہیں بلکہ سراسر روحانی تھا۔ انہوں نے روحانی طور پر خود کو مسافرِ مدینہ اور زیارت کے لیے شدت کے ساتھ تڑپنے والا زائر تصور کر کے ان تمام تراکیب، استعارات، اشارات، جذباتی تڑپ، والہانہ کسک، بے تابی و بے قراری، مدہوشی و سرشاری، فکری لگن، روحانی لگاؤ اور والہانہ پن سے کام لیا ہے جو ایک مسافرِ شوق کا خاصہ ہوتی ہیں۔ قاری جوں جوں اقبال کا ہمنوا اور فکری طور پر ہمسفر بن کر آگے بڑھتا ہے اقبال جیسی بے قراری اس پر بھی طاری ہونے لگتی ہے۔

”ارمغانِ حجاز“ آپ کی آخری تصنیف ہے جو آپ کی وفات کے بعد نومبر ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں صفحات ۲۵ سے ۷۶ تک جو رباعیات اور قطعات درج ہیں۔ ان کا عنوان ہے ”حضور رسالت“۔ اقبال اپنی داستانِ شوق کا آغاز کرتے ہیں کہ بڑھاپے اور ضعف کے عالم میں، میں نے مدینہ کا سفر اختیار کیا ہے۔ میں اس پرندے کی طرح ہوں جو شام کے وقت صحرا میں اپنے گھونسلے میں اترنے کے لیے اپنے پروں کو کھولتا ہے:

بایں پیری رہِ یثرب گرفتم

نوا خواں از سرودِ عاشقانہ

چوں آں مرغی کہ در صحرا سرِ شام

کشاید پر بہ فکرِ آشیانہ

ایک بند میں اپنے نغمات اور نالوں کے مقامات کا ذکر کرتے ہیں۔ میں نے صحرا میں ڈیرا



جمایا ہے تاکہ خلوت کو آباد کر کے اکیلا ہی سلطانِ دو عالم کی مدح سرائی کیا کروں۔

چہ پرسی از مقاماتِ نوایم  
ندیمایاں کم شناسد از کجایم  
کشادم زحمتِ خود را اندریں دشت  
کہ اندر خلوتش تنہا سرایم

اب صحرا کی تعریف کرتے ہیں کہ کیا خوبصورت صحرا ہے کہ درود و سلام کے نعمات پیش کئے جا رہے ہیں۔ اس صحرا کی گرم گرم ریت پر جبینیں ٹکا دو تاکہ یہ سجدے تمہاری پیشانیوں کا اعزاز بن جائیں۔

چہ خوش صحرا کہ در دے کارواں ہا  
درودے خواند و محمل براند  
بہ رنگِ گرم او آمد سجودے  
جبیں را سوز تا داغ بماند

جوں جوں اقبال کا راہوارِ تخیل سر زمینِ حجاز کی طرف آگے کو بڑھتا ہے نعت کی لے تیز سے تیز تر ہونے لگتی ہے۔ بدن لرزیدہ اور قدم لغزیدہ ہونے لگتا ہے۔ ہر لمحہ احترامِ حضور ﷺ دلوں میں اجاگر ہونے لگتا ہے کہ میں کدھر کو جا رہا ہوں۔ یہاں تو ملائک بھی خمیدہ سر حاضر ہوتے ہیں۔ جیسا کہ عرفی شیرازی نے کہا ہے:

عرفی مشاب ایں رہ نعت است نہ صحرا است  
آہستہ کہ رہ بر دم تیغ است قدم را  
اسی کیفیت کو امام احمد رضا خاں یوں بیان کرتے ہیں۔

حرم کی زمیں اور قدم رکھ کے چلنا  
ارے سر کا موقع ہے او جانے والے

اقبال بھی اپنے ناقہ سے احتیاط سے قدم آگے کو بڑھانے کو کہتے ہیں کہ اے ناقہ اپنے سوار کی حالت کو مد نظر رکھ اور اس کے اندر احترام و عقیدت کا جو سمندر موجزن ہے اس کو اپنی رُوح میں سمو کر آگے بڑھ۔

سحر با ناقہ گفتم نرم تر رو  
کہ راکب خستہ و بیمار و پیراست



قدم مستانہ زد چنڈاں کہ گوئی  
پائش ریگ ایں صحرا حریر است  
یہی مضمون عقیدت اس رباعی میں بھی نئے انداز سے جلوہ گر ہے۔

چہ خوش صحرا کہ شامش صبح خند است  
شبش کوتاہ و روز او بلند است  
قدم اے راہرو آہستہ تر نہ  
چو ماہر ذرہ او دردمند است

اقبال خود پر غور کرتے ہیں اور امیر کارواں سے اپنے بارے میں پوچھتے ہیں کہ یہ عجی کون ہے؟ یہ عربی نہ ہو کر بھی اپنے شاداب نعمات سے دلوں کو زندگی کی طراوت عطا کر رہا ہے۔

امیر کاروں آں عجی کیست  
سرود او باہنگ عرب نیست  
زند آں نغمہ کز سیرابیء او  
خنک دل در بیابانے توای زیت

اقبال کہتے ہیں کہ اے ساتھی آتا کہ ہم دونوں باہم آہ وزاری کریں۔ ہم دونوں کسی کے جمال جہاں آرا کے طلب گار ہیں۔ آ کہ ہم دونوں اپنے آقا و مولا کے قدموں سے اپنی آنکھیں ملیں اور دلوں کے درد کا اظہار کریں۔

بیا اے ہم نفس باہم بنالیم  
من و تو کشتہ شان جمالیم  
دو حرفے او مراد دل بگوئیم  
پپائے خواجہ چشماں را بہالیم

آگے عرض کرتے ہیں کہ یہاں اہل دانش کی حاجت نہیں۔ کیسی خوش قسمتی اور کیسا مبارک زمانہ ہے کہ مجھ فقیر بے نوا کو آستان شاہ پر حاضری میسر آ گئی۔

حکیمایں را بہا کتر نہادند  
بناداں جلوہ مستانہ دادند  
چہ خوش بختے، چہ خرم روزگارے  
در سلطان بہ درویشے کشادند



اقبال عظمتِ رسول کو گواہ بنا کر بڑے ادب سے عرض کرتے ہیں کہ اے اللہ کے رسول! مسلمان اگر چہ فقیر ہے مگر کج کلاہی کی شان رکھتا ہے۔ اس کا سینہ جل رہا ہے۔ اے خدا کے محبوب رسول اس خستہ سامان کو نگاہِ کرم سے نوازیں۔

مسلمان آں فقیرے کج کلاہے

رمید از سینہ او سوزِ آہے

دلش نالد چرا نالد؟ نداند

نگاہے یا رسول اللہ! نگاہے

اقبال بارگاہِ حضور میں اپنی فریاد کو آگے بڑھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہمارے دلوں کی گرمی آپ کے سوزِ غم کی بدولت ہے۔ مجھے ہندوستان میں ایک بھی ایسا شخص نظر نہیں آتا جو آپ کے نظریات کا سچا پیروکار اور آپ کے اسرار سے آشنا ہو۔

تب و تابِ دل از سوزِ غم تست

نوائے من ز تاثیر دم تست

بنالم زانکہ اندر کشورِ ہند

ندیدم بندہ کو محرم تست

محبت رسول میں گم ہو کر اقبال کو عراقی اور جامی کے نغمہ ہائے عشق محبوب تر ہو جاتے ہیں اور وہ ساربان کے پر شوق نغموں کی حلاوت میں کھو جاتے ہیں۔

گہے شعرِ عراقی را بخوانم

گہے جامی زند آتش بجانم

ندانم گرچہ آہنگِ عرب را

شریکِ نغمہ ہائے سارہانم

سرزمینِ حجاز کی جانب سفر کرتے ہوئے ساربان سے کہتے ہیں کہ لمبے راستے سے ہو کر چل تاکہ جدائی کا سوز اور بھڑک سکے۔

غم راہِ نشاط آمیز تر کن

فغانش را جنوں آمیز تر کن

بگیر اے ساریاں راہے درازے

مرا سوزِ جدائی تیز تر کن

دنیا میں لادینی پھیلی ہوئی ہے۔ اقبال حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بارگاہِ بیکس نواز سے فقر



صدیقؒ طلب کرتے ہیں تاکہ ایمان کو سوز اور حرارت عطا ہو۔

دگر گوں کرد لادینی جہاں را  
ز آثارِ بدن گفتند جاں را  
ازاں فقرے کہ با صدیق دادی  
بشورے آور این آسودہ جاں را  
اقبال اپنی قوم کا نوحہ حضور کی بارگاہ میں عرض کرتے ہوئے اپنی فکری بے حسی کا سبب یہ  
بتاتے ہیں کہ یہ قوم دل تو رکھتی ہے مگر اس میں بسنے والا محبوب نہیں رکھتی۔

شے پیش خدا بگریستم زار  
مسلماناں چرا زارند و خوارند  
ندا آنمی دانی کہ این قوم  
دلے دارند محبوبے ندارند

اقبال سرورِ کائنات کو اپنی بے کسی کا ماجرا سناتے ہیں کہ اے شاہ کونین! آپ سے انصاف  
کا طالب ہوں۔ میرے یاروں نے مجھے غزل خواں سمجھ رکھا ہے مرے کھجور کے درخت سے کسی  
نے بھی اس کا میٹھا پھل نہیں کھایا۔

بآں رازے کہ گفتم پے نبردند  
ز شاخِ نخلِ من خرما نخوردند  
من اے میرا دم داد از تو خواہم  
مرا یاراں غزل خوانے شمرند

شاعر مشرق کی عاجزی انتہا کو چھونے لگتی ہے کہ یا رسول اللہ! ہمیں اپنے آستانہ سے نہ  
دھتکارئے۔ صبر کے علاوہ جو حکم چاہیں دیں اور صبر ہمارے لیے محال ہے۔ لذتِ حضوری سے بہرہ  
ور فرمائیں۔

مراں از در کہ مشتاقِ حضوریم  
ازاں دردے کہ دادی ناصبوریم  
بفر ماہر چہ می خواہی بجز صبر  
کہ ما از دے دو صد فرسنگ دارم

علامہ عرض کرتے ہیں کہ ابھی میری آگ میں چنگاری چھپی ہوئی ہے۔ آپ میری آنکھوں پر اپنی



تجلی آشکار فرما کر دیکھیں کہ اس ضعف کے باوجود میرے اندر ابھی تابِ نظرِ ارامِ وجود ہے۔

ہنوز ایں خاک دارائے شرر ہست  
ہنوز ایں سینہ را آہِ سحر ہست  
تجلی ریز بر چشم کہ بنی  
بایں پیری مرا تابِ نظر ہست

ارشادِ مصطفیٰ ﷺ ہے ”مَنْ رَأَى فَقَدْ رَأَى الْحَقَّ“ (جس نے مجھے دیکھا اس نے خدا کا دیدار کیا) یہ حدیث پاک اقبال کے تصورات کی دنیا میں عشق و سرمستی کا آفتاب بن کر جگمگا رہی ہے۔ اسی لئے کمالِ ادب سے عرض کرتے ہیں کہ میری آنکھوں کی روشنی آپ کی عطا کردہ ہے۔ مجھے ”من رانی“ کی صبح سے فیضیاب فرمائیے کہ میری رات کی ظلمتوں کو کافور کرنے والے چاند کی چاندنی آپ ہی کی آوردہ ہے۔ یہ رباعی نعتیہ مضمون کے حوالے سے انتہائی متاثر کن اور جاذبِ فکر ہے۔

بچشم من نگہ آوردہ پست  
فروغ لا الہ آوردہ تست  
دو چارم کن یہ صبح من رانی  
ششم را تابِ مہ آوردہ تست

اقبال کہتے ہیں کہ عشق کی دولت آپ کے سینہ اقدس سے حاصل ہوتی ہے اور مجھے جبریلؑ کی بابت صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ بھی آئینہ رسالت کے ایک جوہر کا نام ہے۔

جہاں از عشق و عشق از سینہ تست  
سرور ش از مئے درینہ تست  
جز ایں چیزے نمی دانم ز جبریل  
کہ او یک جوہر از آئینہ تست

شاعر کا جذبہ عشق اور مچلتا ہے اور کہتا ہے کہ یا رسول اللہ! مرا سوزِ آپ ہی کا فیضان ہے۔ مرے انگوروں کی نیل کی شراب آپ ہی کے آبِ زمزم سے نکلی ہے۔ مری درویشی سے کسریٰ و جمشید شرماتے ہیں کیونکہ میرا دل آپ ہی کے اسرار کا محرم ہے۔

مرا ایں سوز از فیضِ دم تست  
بتا کم موجِ مے از زمزم تست



نجل ملک جم از درویشی من  
کہ دل در سینہ من محرم ثست  
آگے جا کر اقبال کی آرزو نیا آہنگ اختیار کرتی ہے اور کہتے ہیں کہ ادب دامنگیر ہے اور  
بات کو مختصر سے مختصر کرنا چاہتا ہوں۔

حضورِ ملت بیضا پسیدم  
نوائے دل گدازے آفریدم  
ادب گوید سخن را مختصر گوئے  
پسیدم ، آفریدم ، آرمیدم  
اقبال اپنے آنسوؤں کو لالہ کے خون میں ملا دینے کی آرزو کرتے ہیں کہ اگر میں حضرت  
علیؑ کی تلوار بننے کے قابل نہیں ہوں تو مجھے وہ نظر عطا کیجئے جو علیؑ کی طرح تیز ہو۔

گلستانے ز خاک من برانگیز  
نم چشم بخون لالہ آمیز  
اگر شایاں نیم تیغ علیؑ را  
نگاہے وہ چو شمشیر علیؑ تیز  
اگلی رباعی میں اقبال عشق و سرمستی کی انتہا کو چھونے لگتے ہیں۔ نعت و مدحت کے گلہائے  
سدا بہار بکھرنے لگتے ہیں۔ عرض کرتے ہیں کہ آپ کے کوچہ میں دل پر سوز کی ایک ہی صدا کافی  
ہے۔ میرے لئے یہی ابتدا ہے یہی انتہا۔ میں اس رند پاک باز کی جرأت پر آفرین کرتا ہوں اور  
حیرت زدہ ہوں کہ وہ کیسے بڑے مقام پر تھا جو اس نے خدا سے برملا کہہ دیا تھا کہ ”ہمارے لیے  
مصطفیٰ کافی ہیں۔“ ہمیں اور کچھ نہیں چاہیے ظاہر ہے کہ عشق و عقیدت مصطفیٰؐ کی بلندیوں کو چھونے  
والا رند پاک باز اقبال کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے۔

بکوائے تو گداز یک نوا بس  
مرا ایں ابتدا ایں انتہا بس  
خراب جرأت آں رند پاکم  
خدا را گفت ”ما را مصطفیٰ بس“

روضہ رسول ﷺ جانِ قلب و نظر، راحتِ جان و دل ہے۔ نورِ آگہی ہے، جمالِ بزمِ ہستی  
ہے۔ مخزنِ انوارِ قدرت ہے، مرکزِ اسرارِ فطرت ہے۔ وہ روضہ اقدس کہ جس کے حضور تصور سے



ہی پیشانیاں عرق آلود ہو جاتی ہیں کہ یہ اس ہستی کی خواب گاہ ہے جس کی ذات روح کائنات اور جس کا وجود دو عالم میں سرمایہ نجات ہے۔ روضہ رسول کی عظمت و جلالت کا احساس شہنشاہوں کے جسموں پر ہی نہیں بلکہ افکار پر بھی کپکپی طاری کر دیتا ہے۔ عشاق پر شہر مدینہ کو دیکھ کر اور روضہ رسول کی تجلیات کو دلوں میں بسا کر کیا گزرتی ہے اس کا اندازہ سیدنا امام مالکؒ کے جذبہ احترام کو دیکھ کر ہو جاتا ہے۔ ایک شاعر نے کیا خوب کیا ہے:

نبیؐ کا جس جگہ پر آستاں ہے

زمین کا اتنا ٹکڑا آسماں ہے

اقبال کے لیے بھی شہر مدینہ اور روضہ رسول ﷺ قلب و نظر کی معراج کا درجہ رکھتے ہیں۔ دوسرے عشاق کی طرح ان کا دل بھی چاہتا ہے کہ شہر مدینہ کے ذرات ریگزار کو پلکوں سے بو سے دیں۔ روضہ رسول پر پلکوں سے جاروب کشی کریں مگر ظاہر بین اور تنگ نظر اصحاب کی جانب سے مخالفت کا خدشہ بھی دامن گیر ہے جو محبوب کے حضور فرط عقیدت سے جھکنے کو سجدے سے بغیر کر کے ان کے ذوق و شوق کو پابند احتساب بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اقبال اس رباعی میں سلطانِ حجاز عبدالعزیز اور دیگر مستسبین تک اپنا قلبی مدعا پہنچاتے ہیں کہ یہ سجدہ ہر گز نہیں سجدہ تو خدا کے علاوہ کسی کو جائزہ نہیں میں تو پلکوں سے محبوب کے در کی جاروب کشی کر رہا ہوں۔

تو ہم آں نے بگیر از ساغرِ دوست

کہ باشی تا ابد اندر بر دوست

سجودے نیست اے عبدالعزیز ایں

برو بم از مژہ خاکِ درِ دوست

مدینہ طیبہ کی عظمتیں اس حقیقت کا اعلان عام ہیں کہ

یہ کوچہ حبیب ہے پلکوں پہ چل کے آ

یہی حقیقت اقبال کے پیش نظر ہے۔ مدینہ طیبہ کے حوالے سے اقبال کا تصور کہیں سے

کہیں جا پہنچتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ مدینہ سلطانِ دو عالم ﷺ کا مسکن ہے جہاں سے زائرین کو ہر

پل مژدہ شفاعت عطا ہوتا ہے۔ مکہ مکرمہ کی عظمت اپنی جگہ۔ وہاں بیت اللہ ہے۔ مقام حج ہے۔

مکہ مکرمہ قبلہ گاہِ اسلامیاں ہے مگر اسے قبلہ گاہِ اسلامیاں اس ہستی والا صفات نے بنایا ہے جو آج

مدینہ طیبہ کے پرانوار ماحول میں آرام کر رہی ہے۔ احادیث گواہ ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام

حالتِ نماز میں تھے۔ امامت فرما رہے تھے۔ صحابہ مقتدی تھے۔ دل میں خیال آیا، الہی اب بیت



المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کو جی نہیں چاہتا، میرا قبلہ تبدیل کر دے۔ اسی لمحہ وحی نازل ہوئی کہ اے محبوب تم جدھر کو رخ کرو گے وہی تمہارا قبلہ بن جائے گا۔ اس وحی کے ساتھ ہی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنا رخ انور بیت اللہ کی طرف کر لیا۔ گویا بیت اللہ کا قبلہ گاہ بننا بھی رضائے مصطفوی کا اعجاز ہے اور نعت گو شعراء نے اس مضمون کو اپنے اپنے انداز میں محسوس کیا ہوگا مگر اقبال نے اس سے یہی پیغام لیا۔

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر

وہی فرقاں وہی قرآں وہی یسین وہی طہ

”ارمغانِ حجاز“ میں اقبال عشق و عقیدتِ مصطفیٰ کے حوالے سے اس مضمون کو اس

اچھوتے، منفرد اور ایمان افروز انداز میں بیان کرتے ہیں کہ عشاقِ حضور ﷺ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے عظمتِ مصطفوی ﷺ کی لافانی سر بلندیوں سے آگاہ کر گئے۔

در آں دریا کہ اُور را ساحلے نیست

دلیلِ عاشقاں غیر از دلے نیست

تو فرمودی رہ بطنِ گرفتار

دگر نہ جز تو مارا منزلے نیست

اقبال کے دل میں عشق و مستی کی شمع فروزاں رہی ہے۔ اس لئے وہ انفرادی اور اجتماعی غم

سلطانِ مدینہ کو سناتے ہیں انہیں ایسا لگتا ہے جیسے سناتے سناتے قرار آ گیا ہو۔ قلبِ مہجور کو تسلی مل گئی

ہو اور امتِ اسلام کی مشکلات کے آسان ہو جانے کا وقت آ گیا ہو۔ عشقِ محمد ﷺ ان کے رگ و

پے میں اس طرح جاری و ساری ہے کہ ان کے اشعار نعت کے مروجہ اسالیب نہ رکھتے ہوئے بھی

کمالِ درجہ کی نعت معلوم ہوتے ہیں۔ درج ذیل اشعار کا مطالعہ کیجئے اور اقبال کی غایت درجہ محبت

رسول ﷺ کی لطافت محسوس کیجئے۔ فرماتے ہیں:

اے تو ما بے چارگاں را ساز و برگ

وار ہاں ایں قوم را از ترسِ مرگ

اے مقام و منزل ہر راہ رو

جذبِ تو اندر دلِ ہر راہ رو

ایں مسلمان زادہ روشن دماغ

ظلمتِ آباد و ضمیرش بے چراغ



قَمِ بَاذَنی گونِی و اُو را زنده کن  
در دلش اللہ ہو را زنده کن  
شہسوارا! یک نفس در کش عنان  
حرفِ من آساں نیاید بر زباں  
گردِ تو گردِ حریم کائنات  
از تو خواہم یک نگاہ التفات  
ذکر و فکر و علم و عرفانم توئی  
کشتی و دریا و طوفانم توئی  
اے پناہ من حریم کوئے تو!  
من بامیدے رمیدم سوئے تو  
چوں بصیری از تو می خواہم کشود  
تا بمن باز آید آں روزے کہ بود  
مہر تو بر عاصیاں افزوں تر است  
در خطا بخشی چو مہر مادر است

اقبال ایک نظم میں جس کا نام ”ایک حاجی مدینے کے راستے میں“ ہے۔ ایک زائر مدینہ طیبہ کی ٹرپ کا حال بیان کرتے ہیں اس دور میں حجاز مقدس کا سفر غیر محفوظ تھا اور لوگ محفوظ قافلوں کی صورت میں سفر کرتے تھے۔ مگر ایسے جانباز محب رسول بھی ہوتے تھے جنہیں سفر مدینہ میں کسی حفاظت کی آرزو نہ ہوتی تھی کہ اس مبارک سفر میں اگر وہ قربان بھی ہو جائیں تو یہ ان کے لیے عین سعادت کی بات تھی ایسے ہی ایک مسافر پر شوق کا حال دیکھیے جس کے قافلے کو ڈاکوؤں نے لوٹ لیا اور کئی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

اس بخاری نوجواں نے کس خوشی سے جان دی  
موت کے زہراب میں پائی ہے اس نے زندگی  
خجر رہزن اسے گویا ہلالِ عید تھا  
”ہائے شرب“ دل میں لب پر نعرہ توحید تھا  
خوف کہتا تھا کہ ”یغرب کی طرف تنہا نہ چل“  
شوق کہتا تھا کہ تو مسلم ہے بے باکانہ چل



”بے زیارت سوئے بیت اللہ پھر جاؤں گا کیا  
عاشقوں کو روزِ محشر منہ دکھلاؤں گا کیا“  
خوف جاں رکھتا نہیں کچھ دشتِ پیائے حجاز  
ہجرتِ مدفونِ یثرب میں یہی مخفی ہے راز

کچھ ایسی ہی کیفیت معروف نظم ”شفاخانہ حجاز“ میں نظر آتی ہے۔ کہتے ہیں مولانا ظفر علی خاں تک یہ اطلاع پہنچی کہ انگریز سرزمین حجاز (مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ) میں انگریزی شفاخانے کھولنے لگے ہیں۔ مولانا فوراً علامہ اقبال کے پاس آئے۔ تمام صورت بتا کر بڑے غمگین لہجے میں کہا کہ ان شفاخانوں کے ساتھ ہی یورپ کی طرف سے الحاد بے دینی اور بے غیرتی کا سیلاب بھی آئے گا۔ علامہ اقبال نے تسلی دی کہ مطمئن رہیے ایسا نہیں ہوگا۔ وہ چلے گئے تو آپ نے یہ نظم انہیں ”زمیندار“ میں اشاعت کے لیے بھیج دی۔ یہ نظم دھوم دھام سے زمیندار کے صفحہ اول پر چھپی۔ انگریز نے مسلمانوں کے جذبات سے لرز کر منصوبہ ختم کر دیا۔ اقبال کہتے ہیں کہ جب ایک پیشوائے قوم نے مجھے صورتِ خال سے آگاہ کیا تو میں نے کہا۔

میں نے کہا کہ موت کے پردے میں ہے حیات  
پوشیدہ جس طرح ہو حقیقت حجاز میں  
تلخابہ اجل میں جو عاشق کو مل گیا  
پایا نہ خضر نے مئے عمرِ دراز میں  
اوروں کو دیں حضور یہ پیغامِ زندگی  
میں موت ڈھونڈتا ہوں زمینِ حجاز میں  
آئے میں آپ لے کے شفا کا پیام کیا  
رکھتے ہیں اہلِ درد مسیحا سے کام کیا

معراجِ مصطفیٰ (ﷺ) ایک عظیم معجزہ اور تاریخِ عشق و ایمان کا حیرت انگیز واقعہ ہے۔ نعت گو شعراء نے معراجِ حضور کو اپنے اپنے انداز سے دیکھا اور قلم بند کیا۔ شاید ہی کوئی نعت گو شاعر ہو جس نے اپنے اشعار میں معراج کے واقعہ کو موضوعِ نعت نہ بنایا ہو بعض نے تو اس پر طویل نعتیں لکھیں اور بعض نے ”معراج نامے“ لکھ دیئے مگر اقبال کا اسلوب یہاں بھی منفرد اور بے مثال ہے مختصر مگر انتہائی نتیجہ خیز۔ کہتے ہیں:



اخترِ شام کی آتی ہے فلک سے آواز  
سجدہ کرتی ہے سحر جس کو وہ ہے آج کی رات  
رویک گام ہے ہمت کے لیے عرشِ بریں  
کہہ رہی ہے یہ مسلمان سے معراج کی رات

چونکہ معراج کی عظمت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ملی تو حضور سرور کائنات امت اسلام کے آقا و مولا ہیں۔ اس لیے اقبال معراج رسول کے حوالے سے امت اسلام کو ہمت و جرأت اور فلک پیائی کا پیغام دے رہے ہیں۔

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیٰ سے مجھے  
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں  
معراج نبوی کی عظمت و جلالت دیکھ کر کائنات دنگ ہے۔ جن و ملک، ماہ و انجم سب عالم حیرت میں گم ہیں۔

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہے جاتے ہیں  
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارامہِ کامل نہ بن جائے  
جوں جوں اقبال کی شاعری کا سفر نئی منزلوں کی جانب بڑھتا گیا۔ آپ کے افکار کی وسعتیں بھی اپنی معراج کو چھونے لگیں۔ آپ نے زمانے بھر کے علوم و فنون پڑھے مگر محبتِ رسول کی تجلیات کو کسی بھی بحث یا تاویل کا محتاج نہیں ہونے دیا۔ ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ آپ کی نعت مروجہ اسالیب سے ہٹ کر ہے۔ جہاں تک مقاماتِ رسول کی بلندیوں کا تعلق ہے۔ آپ ان کی رسائی کے لیے کسی بھی محبِ صادق یا نعت گو شاعر سے آگے نظر آتے ہیں مگر آپ نے نعت کو پیرایہِ اظہار بناتے ہوئے ہمیشہ امت اسلام تک ذاتِ رسول کے حوالے سے کوئی نہ کوئی پیغام پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ آپ کی نعتیہ شاعری کے ابتدائی دور میں آپ کے اشعار میں روایتی نعت گوئی کا اثر نمایاں نظر آتا ہے مگر جلد ہی اقبال اس انداز سے گزر گئے اور اپنی آفاقی سوچ کے ذریعے اُردو شاعری میں نعت گوئی کی روایت کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ اقبال کے ابتدائی اسلوبِ نعت کا جائزہ لینے کے لیے ان کی ایک نعت سے کچھ اشعار پیش ہیں تاکہ علامہ اقبال کے ابتدائی نعتیہ رنگ کی ایک جھلک بھی قارئین کے سامنے آجائے۔

جو تیرے کوچے کے ساکنوں کا فضائے جنت میں دل نہ بہلا  
تسلیاں دے رہی ہیں حوریں خوشامدوں سے منا منا کر



لحد میں سوتے ہیں تیرے عاشق تو حور جنت کو اس میں کیا ہے  
 کہ شورِ محشر کو بھیجتی ہے خبر نہیں کیا سکھا سکھا کر  
 تری جدائی میں خاک ہونا اثر دکھاتا ہے کیمیا کا  
 دیارِ یثرب میں آ ہی پہنچے صبا کی موجوں میں مل ملا کر  
 رکھی ہوئی کام آ ہی جاتی ہے جنسِ عصیاں عجیب شے ہے  
 کوئی اسے پوچھتا پھرے ہے زیرِ شفاعت دکھا دکھا کر  
 یہ پردہ داری تو پردہ در ہے مگر شفاعت کا آسرا ہے  
 دیک کے محشر میں بیٹھ جاتا ہوں دامنِ تر میں منہ چھپا کر  
 ترے ثنا گو عروسِ رحمت سے چھیڑ کرتے ہیں روزِ محشر  
 کہ اس کو پیچھے لگا لیا ہے گناہ اپنے دکھا دکھا کر  
 خیالِ راہِ عدم سے اقبال تیرے در پر ہوا ہے حاضر  
 بغل میں زادِ سفر نہیں ہے، صلہ مری نعت کا عطا کر

اس نعت کے تمام اشعار اسی سلوبِ نعت میں لکھے گئے ہیں جو مدتوں سے مروج ہے۔  
 غزلیہ انداز ہے مگر محبوب وہی ذاتِ مصطفیٰ ﷺ ہے جو تمام زندگی اقبال کے افکار اور محسوسات کا  
 محور بنی رہی اگرچہ نعت قدیم انداز میں ہے مگر مضمون آفرینی کا حسن اپنی جگہ۔ مقطع میں اس قدر  
 عاجزی ہے کہ پلکیں نم آلود ہو جاتی ہیں:

بغل میں زادِ سفر نہیں ہے صلہ مری نعت کا عطا کر

اقبال کوئی بھی پیغام دیتے ہیں۔ خودی یا بے خودی کا تذکرہ کرتے ہیں۔ مردِ مومن یا  
 شاہین کا ذکر چھیڑتے۔ فقر و سرمستی یا آزادی برصغیر کی بات کرتے ہیں، اتحادِ عالمِ اسلام یا  
 تہذیبِ مغرب کے خلاف جہاد کے عزم کا اعلان کرتے ہیں، ان کی ہر گفتگو اور ہر جستجو کا حاصل  
 ذاتِ مصطفیٰ اور نعتِ مصطفیٰ ہی ٹھہرتی ہے۔ یہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے محبت کی انتہائی پختگی کا  
 ثمر تھا، فقیر سید وحید الدین نے آپ سے پوچھا کہ آپ شعر کیسے کہتے ہیں تو علامہ اقبال نے فرمایا:

”ایک مرتبہ فارمن کر سچن کالج لاہور کا سالانہ اجلاس ہو رہا تھا۔ کالج کے  
 پرنسپل ڈاکٹر لوکس نے مجھے بھی اس میں شرکت کی دعوت دی۔ اجلاس کا  
 پروگرام ختم ہونے کے بعد چائے کا بندوبست کیا گیا۔ ہم لوگ چائے پینے  
 بیٹھے تو ڈاکٹر لوکس میرے پاس آئے اور کہنے لگے چائے پی کے چلے نہ



جانا مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔ ہم لوگ چائے پی چکے تو ڈاکٹر لوکس آ گئے اور مجھے اپنے ساتھ ایک گوشے میں لے گئے اور کہنے لگے اقبال مجھے بتاؤ کہ تمہارے پیغمبر پر قرآن حکیم کا مفہوم نازل ہوا تھا اور چونکہ انہیں صرف عربی زبان آتی تھی انہوں نے قرآن حکیم عربی زبان میں منتقل کر دیا یہ عبارت ہی اس طرح اتری تھی۔ میں نے کہا یہ عبارت ہی اتری تھی۔ ڈاکٹر لوکس نے حیران ہو کر کہا کہ اقبال تم جیسا پڑھا لکھا انسان اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ یہ عبارت ہی اس طرح اتری ہے۔ میں نے کہا: ڈاکٹر لوکس! یقین ہی نہیں بلکہ میرا تجربہ ہے مجھ پر شعر پورا اترتا ہے تو پیغمبر پر عبارت پوری کیوں نہیں اتری ہوگی۔“

دیکھئے! اقبال کے جواب میں کوئی بحث طلب یا الجھا دینے والی بات نہیں انہیں اپنے رسول کریم اور قرآن حکیم پر ایمان و یقین کی پختگی ہی اس طرح عطا ہوئی تھی کہ وہ دوسرا جملہ کہنے کے بھی روادار نہیں ہوئے تھے۔

شاعر مشرق کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے غیر معمولی وابستگی کا ثمریوں عطا ہوا کہ ان کے نعتیہ اشعار بقائے دوام حاصل کر گئے۔ زمانہ صدیوں کی مسافتیں طے کرتا رہے گا مگر اقبال کے نعتیہ کلام کی تب و تاب میں کمی رونما نہیں ہوگی بلکہ ہر آنے والا دور اس سے فیضیاب ہوتے ہوئے فخر محسوس کیا کرے گا۔ مروجہ اسلوب میں باقاعدہ نعت گوئی نہ کرنے کے باوجود بھی علامہ اقبال توصیف مصطفیٰ ﷺ میں اتنا کچھ کہہ گئے ہیں کہ زمانے بھر کے نعتیہ دواوین سے ان کے نعتیہ اشعار کا مقام و مرتبہ اولیٰ تر ہے کیونکہ انہوں نے کوئی بھی نعتیہ کلام نعت برائے نعت کے حوالے سے نہیں لکھا بلکہ ان کی نعت مفاہیم و مضامین کا قلزم بے کنار اپنے دامن میں لیے ہوئے تھی۔ نئے سے نیا پیغام، نئی سے نئی بات، نئی سے نئی تجلی۔ غرضیکہ تجلیات نعت کی فراوانی نے ان کی نعت کو عالمگیریت عطا کر دی ہے۔

سلطانِ دو عالم ﷺ سے غیر معمولی محبت اور عشق و عقیدت نے انہیں تاریخ اسلام کا مردِ مومن بنادیا۔ وہ مردِ مومن کہ جس کی عظمتوں کو وقتِ آخر نے یوں سلام کیا تھا:

نشانِ مردِ مومن ہا تو گویم

چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

اور پھر اقبال کی وہ رباعی جو انہوں نے اپنے وصال سے چند منٹ پیشتر پڑھی۔ یہ وہ وقت تھا کہ سانس بھی رُک رُک کر چل رہا تھا۔ بعض اوقات آنکھوں کے اشارے اور ہاتھ کی جنبش سے



کچھ سمجھاتے تھے۔ آپ کے ایک بزمِ آشکارِ اجہ حسن اختر صاحب کا بیان ہے کہ علامہ مرحوم نے انتقال سے تقریباً دس منٹ قبل اپنا حسبِ ذیل قطعہ پڑھ کر وقت آ جانے کا اعلان کر دیا تھا۔

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید؟  
نسیمے از حجاز آید کہ ناید؟  
سر آمد روزگارے ایں فقیرے  
دگر دانائے راز آید کہ ناید؟

بلاشبہ وصال سے قبل اس نوعیت کی رُبائی کہہ جانا اقبال کے لیے بہت بڑا انعام ہے اور یہ مدحتِ مصطفیٰ ﷺ ہی کا صدقہ ہے کہ رب کریم نے اقبال کو وقتِ آخریہ توفیق بخش دی کہ وہ اپنی مدحت طراز یوں کو ”نسیمے از حجاز آید کہ ناید“ کا نام دے کر محبتِ رسول کی خوشبوئے دل نواز سے زمانے بھر کو مہکائے کا اہتمام کر جائیں۔ اقبال کے قلب و نظر میں، افکار و محسوسات میں عمر بھر محبتِ رسول ﷺ نے اپنا مقام بنائے رکھا۔ یہی محبت رسول ﷺ ان سے زندگی بھر تو صیف و ثنا کا خراج لیتی رہی۔ اقبال نے جو سرمایہ مدحتِ رسول چھوڑا ہے، ہم نے اس سے اجمالاً خوشہ چینی کی ہے ورنہ وہاں تو ہر ساعت ”جہانِ دیگر“ کا احساس ہوتا ہے۔ ایسا ”جہانِ دیگر“ کہ جس میں نعتِ مصطفیٰ ﷺ کے حوالے سے ہر ورق اور ہر صفحہ پر زمانے بھر کے تو صیف نگاروں سے ہٹ کر نئے ہی اسلوب میں نعت اور تعلیماتِ حضور ﷺ کے ستارے بکھرے ہوئے ہیں۔ وہ عصرِ حاضر کے اسلوب طرازوں سے کہیں زیادہ رومی، عرفی اور جامی و بصیری کے قافلے کا خوش بخت مسافر تھا۔ اس کی نعت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے غیر معمولی محبت کا والہانہ پن عطا کر رہی ہے اور وہ مردِ مومن کو محبتِ رسول ﷺ کا آفاقی پیغام دیتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر تو میری بات پر غور کرے اور حضرت صدیق اکبرؓ کی رمز شناس آنکھوں سے دیکھے تو حضور نبی کریم ﷺ تیرے لیے دل و جگر کی قوت بن جائیں گے اور ان کی ذات گرامی خدا سے زیادہ محبوب بن جائے گی۔

معنی حرمِ کنی تحقیق اگر بنگری با دیدہ صدیقِ گر  
قوتِ قلب و جگر گردِ ددِ نبی از خدا محبوب تر گردد نبی  
سیدنا صدیق اکبرؓ کے لیے نبی کریم ﷺ اس لیے محبوب تر تھے کہ انہوں نے اپنے محبوب ﷺ کی سیرت و صورت میں خدا کو دیکھا۔ اقبال کا عشق رسول اور اقبال کی نعتیہ شاعری بھی ہمیں نعتِ رسول ﷺ کے حوالے سے مقاماتِ مصطفیٰ کو پہچان کر خدا شناسی کا پیغام دے رہی ہے۔





## امام احمد رضا خاں فاضل بریلویؒ

کارواں سالارِ نعت۔ فنی و تحقیقی جائزہ

امام احمد رضا خاں فاضل بریلویؒ کو خدا نے جن لازوال علمی و فقہی کمالات، باطنی و نظری خصوصیات اور علمی و ادبی خصائص سے نواز رکھا تھا ان میں سے ایک صفت خاص آپ کی منفرد نعت گوئی ہے۔ اگر ایسے اساتذہ فکر و فن کی فہرست تیار کی جائے جنہوں نے اس صدی میں ثنائے مصطفیٰ ﷺ کا پرچم لہرانے والوں کو سب سے زیادہ متاثر کیا تو ان میں یقیناً سرفہرست حضرت فاضل بریلوی کا اسم گرامی ہوگا کہ جن کی نعت گوئی کا اعتراف اپنوں نے ہی نہیں بلکہ بیگانوں نے بھی کیا ہے۔ بلکہ ان نابغہ روزگار ثنا گو یاں کو چہء مصطفیٰ ﷺ میں سے بیشتر نے انہیں فنِ نعت کے حوالے سے امامِ سخن گویاں قرار دیا ہے۔ آپ کی نعتیہ شاعری کا سورج جب ایک بار چمکا تو پھر اس کی روشنی کبھی بھی نہ ماند پڑ سکی، بلکہ ہر آنے والے دور کا شاعر جب مدحت رسول کی خاطر ذہن و فکر کو آمادہ کرتا ہے تو احمد رضا خاں فاضل بریلوی کے کلام بلاغت نظام سے راہنمائی ضرور حاصل کرتا ہے۔ جب ایشیا کی مساجد سے لے کر یورپ کے اسلامی مراکز تک ہر جگہ ”مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام“ کی صورت میں وجد آفریں سلام کی صدائیں اُبھرتی ہیں تو جہاں اصحابِ نظر کی پلکیں عشق و عقیدت کے آنسوؤں سے نم ہو جاتی ہیں وہاں تصورات کے نہاں خانوں میں نعت گو احمد رضا خاں کا جو روشن سراپا اُبھرتا ہے وہ اس قدر سر بلند اور سرفراز ہوتا ہے کہ ان کے معاصرین اور عصر حاضر کے نعت گو شعراء کا وجود اپنی تمام بلند قامتی کے باوجود اس کے سامنے مختصر محسوس ہوتا ہے۔

اس غیر معمولی مقبولیت، حیرت انگیز مرجعت، لافانی شہرت اور انمٹ قدر و منزلت کی حقیقی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے نعتیہ شاعری کے لئے قرآن حکیم سے اکتساب فیض کیا ہے۔ قرآن حکیم بذاتِ خود نعتِ مصطفیٰ ﷺ کا سب سے اہم ماخذ ہے جس کے ہر پارے، سورت اور آیت سے صفت و ثنائے حضور ﷺ کی مہک پھوٹ رہی ہے۔ احمد رضا خاں فقط ایک شاعر ہی نہ تھے۔ نامور عالم دین یگانہ روزگار محدث اور بے مثل مفسر قرآن بھی تھے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ذوق



وشوق کی کیف آفریں وادیوں میں کھو کر جب قرآن حکیم کا مطالعہ کیا تو انہیں نعت مصطفیٰ ﷺ کی رفعتیں اپنے قلب و جان کا احاطہ کرتی ہوئی محسوس ہونے لگیں قرآن حکیم کے مطالعہ سے آگے بڑھے تو شریعت مصطفویٰ ان کی خضر راہ بن گئی اور وقت کا یہ عظیم ترین فقیہ نعت کی گلرنگ وادیوں میں سفر کرتے ہوئے بے اختیار عظمت کلام خداوندی اور شریعت حضور کے حوالے سے پکارا تھا۔

پیشہ مرا شاعری نہ دعویٰ مجھ کو  
ہاں شرع کا البتہ ہے جنبہ مجھ کو  
مولیٰ کی ثنا میں حکم مولیٰ کا خلاف  
لوزینہ میں سیر تو نہ بھایا مجھ کو

احمد رضا خاں چونکہ بہت بڑے عالم دین اور علوم شریعت سے غیر معمولی آگاہی رکھنے والے نعت گو شاعر تھے اس لئے انہوں نے نعت کے حقیقی مقام و مرتبہ کو اجاگر کیا اس ضمن میں آپ نے نعت کی جو تعریف کی ہے وہ اصحاب ذوق کے لئے شمع ہدایت ہے۔

”حقیقتاً نعت شریف لکھنا بڑا مشکل کام ہے جس کو لوگوں نے آسان سمجھ لیا ہے اس میں تلوار کی دھار پر چلنا پڑتا ہے۔ اگر بڑھتا ہے تو انوہیت میں پہنچ جاتا ہے اور کمی کرتا ہے تو تنقیص ہوتی ہے، البتہ حمد آسان ہے کہ اس میں صاف راستہ ہے جتنا چاہے بڑھ سکتا ہے۔ غرض حمد میں اصلاً حد نہیں اور نعت شریف میں دونوں جانب حد بندی ہے۔“ رضا بریلوی نے نعت کی شرعی حدود و قیود کا پورا پورا پاس کیا ہے۔ ان کا راہوار قلم جب عشق و عقیدت کی جولاں گاہ میں محو سفر ہوتا ہے تو ہر گام پر دلوں کے تڑپنے، جذبوں کے مچلنے، تمناؤں کے غنچے چٹکنے کی صدا میں اُبھرتی ہیں، مگر حضرت رضا بریلوی نے عشق و عقیدت کی انتہائی سر بلندیوں پر پہنچ کر بھی آداب شریعت اور ادب کے ساتھ احتیاط کو مد نظر رکھا ہے۔ کئی بلند پایہ نعت گو شاعر افراط و تفریط کے معاملہ میں ٹھوکر کھا گئے مگر اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی نے قرآن حکیم سنت مصطفیٰ ﷺ اور اسوۂ رسول کو خضر راہ بنا کر جب نعت کہی تو ایوانِ نعت جگمگا اٹھا۔

امام احمد رضا کی نعت عشق و عقیدت کی حسین داستان ہے۔ ایسی داستان کہ جس کا ایک ایک لفظ ذوق و شوق کی کیفیات سے بہرہ ور کرتا اور عنایات مصطفویٰ ﷺ کا حق دار ٹھہراتا ہے۔ نعت میں عشق و عقیدت کو وہی حیثیت حاصل ہے جو پھول میں خوشبو کو حاصل ہے۔ خوشبو پھول کے باطنی حسن کو اجاگر کرتی اور اس کی حقیقی پہچان بن جاتی ہے۔ احمد رضا بریلوی بہت بڑے عاشق رسول تھے یہی عشق ان کا سرمایہ حیات اور یہی ادب و احترام ان کا اثاثہ عمل اور روحانی گدازان



کے لئے ذریعہ نجات تھا۔ احمد رضا خاں عشق مصطفیٰ ﷺ کی بارات کس طور سجاتے ہیں اس کی ایک جھلک ملاحظہ ہو:

لحد میں عشق رخ شہ کا داغ لے کے چلے  
اندھیری رات سنی تھی چراغ لے کے چلے  
اللہ کی سر تا بقدم شان ہیں یہ  
ان سا نہیں انسان وہ انسان ہیں یہ  
قرآن تو ایمان بتاتا ہے انہیں  
ایمان یہ کہتا ہے مری جان ہیں یہ  
الہی منتظر ہوں وہ خرام ناز فرمائیں  
بچھا رکھا ہے فرش آنکھوں نے کجواب بصارت کا

مضمون آفرینی کو شاعری کی جان کہا جاتا ہے۔ شاعر جتنا بلند مضمون باندھے گا اس کا کلام اتنا ہی زیادہ قبولیت عام اور فکری و فنی شوکت کا مقام حاصل کرے گا۔ اعلیٰ حضرت نے نعت مصطفیٰ ﷺ رقم کرتے ہوئے مضامین آفرینی کی سر بلندیوں کو چھوتے ہوئے بھی ادب و احترام مصطفیٰ ﷺ کو فراموش نہیں کیا کیونکہ آپ سمجھتے تھے کہ کوچہ ارادت و عقیدت میں معمولی سی ٹھوکر بھی انہیں بلند مقام سے نیچے گرا سکتی ہے۔ نہ صرف یہ کہ آپ نے خود نعت کے تقدس کو ملحوظ رکھا بلکہ دوسرے شعراء کی بھی راہنمائی فرمائی۔ چنانچہ اردو کے بلند پایہ شاعر حضرت اطہر ہاپوڑی نے ایک نعت لکھ کر آپ کی خدمت میں بھیجی جس کا مطلع یہ تھا:

کب ہیں درخت حضرت والا کے سامنے  
مجنوں کھڑے ہیں خیمہ لیلیٰ کے سامنے

اعلیٰ حضرت نے سن کر ناراضگی کا اظہار کیا کہ دوسرا مصرعہ مقام نبوت کے لائق نہیں ہے۔ آپ نے قلم برداشتہ اصلاح فرمائی۔

کب ہیں درخت حضرت والا کے سامنے  
قدسی کھڑے ہیں عرش معلیٰ کے سامنے

اعلیٰ حضرت کی اس اصلاح سے اطہر ہاپوڑی کی مضمون آفرینی اور رفعت تخیل کو چار چاند لگ گئے۔ اب ہم اعلیٰ حضرت کے کلام سے مضمون آفرینی تخیل اور شوکت فکر کی چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔



واہ کیا جود و کرم ہے شہ بطحا تیرا  
نہیں سنتا ہی نہیں مانگنے والا تیرا  
میں تو مالک ہی کہوں گا کہ ہو مالک کے حبیب  
یعنی محبوب و محبت میں نہیں میرا ، تیرا



مالک کو نین ہیں گو پاس کچھ رکھتے نہیں  
دو جہاں کی نعمتیں ہیں ان کے خالی ہاتھ میں  
مرے کریم گنہ زہر سہی لیکن  
کوئی تو شہید شفاعت چشیدہ ہونا تھا  
پریشانی میں نام ان کا دل صد چاک سے نکلا  
اجابت شانہ کرنے آئی گیسوئے توسل کا

حضرت احمد رضا خاں صفت و ثنائے حضور ﷺ میں اس درجہ محو ہوئے کہ تمام زیست نعت  
کے علاوہ کسی اور طرزِ سخن کی جانب توجہ نہ کی۔ حضور آقائے دو عالم ﷺ تو سلطانِ اقلیم دو عالم  
ہیں۔ افتخارِ آدم و نبی آدم ہیں رحمتِ پناہ عاصیاں اور چارہ بے چارگاں ہیں۔ آپ کا دربار وہ دربارِ  
معلیٰ ہے جہاں سے گداؤں کو شہنشاہی اور بوریائشینوں کو عشق و عقیدت کے نام پر کجکلا ہی عطا ہوتی  
ہے، اس لئے کون چاہے گا کہ ایک بار اس دربارِ معلیٰ سے نسبت حاصل کر کے کسی اور دروازے کی  
طرف دیکھے یا اپنے دور کے کسی سلطان یا امیر کا قصیدہ کہے۔ شاہ احمد رضا کو حضور ﷺ سے نسبت پر  
اس قدر ناز تھا کہ اس کا اظہار ان کے کلام میں جا بجا ملتا ہے:

کروں مدح اہل دول رضا پڑے اس بلا میں مری بلا  
میں گدا ہوں اپنے کریم کا مرادین پارہ ناں نہیں

اعلیٰ حضرت نے نعت کو ان بلندیوں پر پہنچا دیا ہے کہ زمانے کو ان کی عظمت تسلیم کرتے ہی  
بنی۔ نعتِ مصطفیٰ ﷺ وہ افتخار ہے کہ نعتِ گو شاعر بے اختیار اس کے احساس سے اپنے جذبات کو  
وجد میں لے آتا ہے۔ اس لیے شاہ احمد رضا خاں فرماتے ہیں:

ملک سخن کی شاہی تم کو رضا مسلم  
جس سمت آ گئے ہو سکے بٹھا دیئے ہیں



یہی کہتی ہے بلبلِ باغِ جناں کہ رضا کی طرح کوئی سحر بیاں  
نہیں ہند میں واصف شاہِ ہدیٰ مجھے شوخی طبعِ رضا کی قسم  
گونج گونج اٹھے ہیں نعماتِ رضا سے بوستاں  
کیوں نہ ہو کس پھول کی مدحت میں وا منقار ہے

حضور سرورِ کائنات فخرِ موجودات محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذات گرامی میں قدرت نے ازل  
سے ابد تک کے تمام محامد و محاسن جمع کر دیئے ہیں۔ آپ کے ظاہری و باطنی فضائل عقل و خرد سے  
ماورئی اور آپ کے کمالات ذہنِ انسانی سے کہیں بلند ہیں۔ شاعر کی فکر کمتر کمالاتِ مصطفیٰ ﷺ کا  
احاطہ کرنے کے لئے آگے بڑھتی ہے مگر بے بس و ناتواں ہو کر اپنی معذوری و مجبوری کا اعتراف  
کرنے لگتی ہے۔ مولانا احمد رضا خاں کے قلم حقیقت رقم نے حضور نبی کریم ﷺ کے حسن ظاہری  
اور باطنی تجلیات کو جی بھر کر خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ ان کا یہ خراجِ عقیدت اشعار کا ایک ایسا  
گلکدہ ہے جس کا ہر پھول سدا بہار اور ہر غنچہ محبت رسول ﷺ سے مشکبار ہے۔ آپ نے اپنے آقا  
و مولانا ﷺ کے حسن صورت کو اس شان سے اپنی شاعری کا اعزاز بنایا ہے کہ افقِ شاعری پر عظمت  
و شانِ مصطفیٰ ﷺ کے نجومِ تاباں ہر لحظہ نئی آب و تاب کے ساتھ طلوع ہوتے اور اصحابِ نظر کے  
افکار کو مستنیر کرتے نظر آتے ہیں۔ حسن و جمالِ مصطفیٰ ﷺ کے حوالے سے ان کے چند اشعار  
ملاحظہ ہوں:

حسنِ یوسف پہ کٹیں مصر میں انکشتِ زناں  
سرکھاتے ہیں ترے نام پہ مردانِ عرب  
یہ کمالِ حسنِ حضور ہے کہ گمانِ نقصِ جہاں نہیں  
یہی پھول خار سے دور ہے یہی شمع ہے کہ دھواں نہیں  
سر تا بقدم ہے تن سلطانِ زمنِ پھول  
لب پھول دہن پھول ذہن پھول بدن پھول  
واللہ جو مل جائے مرے گل کا پسینہ  
مانگے نہ کبھی عطر نہ پھر چاہے دہن پھول  
ہے کلامِ الہی میں شمس و صبحی ترے چہرہ نور فزا کی قسم  
قسمِ شبِ تاری میں راز یہ تھا کہ حبیب کی زلفِ دوتا کی قسم



خامہ قدرت کا حسن دستکاری واہ واہ  
کیا ہی تصویر اپنے پیارے کی اتاری واہ واہ  
نور کی خیرات لینے دوڑتے ہیں مہر و ماہ  
اُٹھتی ہے کس شان سے گردِ سواری واہ واہ

جب اعلیٰ حضرت بریلوی حضور سرور کائنات ﷺ کے حسن باطنی اور جمالِ سیرت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو ان کا اندازِ بیان دیدنی ہوتا ہے۔ ان کی نگاہوں میں حضور نبی کریم ﷺ کے تمام خصائص و کمالات گھومنے لگتے ہیں۔ حضور ﷺ کی عظمتِ کردار، رفعتِ گفتار، بے پایاں رحمۃ للعالمین، میدانِ محشر میں آپ کی شفیع المذنبین، گنہگارِ اُمت کے لئے حضور کی گریہ و زاری، خطا کاروں کی بخشش کے لئے رحمتِ شعاری، جود و کرم کی فراوانی، لطف و عنایات کی فراخ دامانی، اخلاقِ عالیہ کی رفعت، سیرت و کردار کی عظمت، خدا کی اپنے محبوب پر بے پایاں عنایت اور حضور نبی کریم ﷺ کا اُمت کے لئے ہر آن اُمنڈتا ہوا بحرِ شفاعت، یہ سب خصائص جب احمد رضا خاں کے قلم میں سماتے ہیں تو ان کے خامہِ عنبر فشاں کوئی توانائی اور ان کے ذوقِ مدحت کو حیرت انگیز گہرائی عطا ہوتی ہے۔ آپ کے کلام سے چند اشعار نذرِ قارئین ہیں۔

چور حاکم سے چھپا کرتے ہیں یاں اس کے خلاف  
تیرے دامن میں چھپے چور انوکھا تیرا  
ایک میں کیا میرے عصیاں کی حقیقت کتنی  
مجھ سے سو لاکھ کو کافی ہے اشارا تیرا



جب آگئی ہیں جوشِ رحمت پہ ان کی آنکھیں  
جلتے بجھا دیئے ہیں روتے ہنسا دیئے ہیں  
اللہ کیا جہنم اب بھی نہ سرد ہو گا  
رو رو کے مصطفیٰ نے دریا بہا دیئے ہیں



جس کی دو بوند ہیں کوثر و سلسبیل  
ہے وہ رحمت کا دریا ہمارا نبی



جس کے تلووں کا دھون ہے آبِ حیات  
ہے وہ جانِ مسیحا ہمارا نبی



پیش حق مژدہ شفاعت کا سناتے جائیں گے  
آپ روتے جائیں گے ہم کو ہنساتے جائیں گے  
آنکھ کھولو غمزدو، دیکھو وہ گریاں آئے ہیں  
لوہِ دل سے نقشِ غم کو اب مٹاتے جائیں گے

شاہ احمد رضا خاں کی نعتیہ شاعری کا وہ حصہ دلوں کو بے اختیار گداز آشنا کرتا ہے جب آپ  
حرمین الشریفین کی جانب سفر کی تیاری کرتے ہیں۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کو دیکھنے کی تمنا ہر  
صاحبِ ایمان کے دل میں مچلتی ہے اور پھر جب وہ شخصیت اس مبارک سفر پر روانہ ہو رہی ہو، جس  
نے عمر بھر عشقِ مصطفیٰ ﷺ کا درس دیا ہو۔ توحیدِ خداوندی کے آداب سکھائے ہوں، احترام  
و عقیدت رسول کی چمک عطا کی ہو۔ دلوں میں شمعِ عشقِ رسول ﷺ جلا کر اُجالا کیا ہو، جس کی اپنی  
زندگی عشقِ مصطفویٰ ﷺ کی تصویر اور محبتِ رسول ﷺ کی عملی تفسیر ہو۔ جس کے شب و روز بیت اللہ  
کے طواف اور حرمِ نبوی کی زیارت کے تصور میں گزرتے ہوں تو پھر اس پر کیفِ سامانی کا آفتاب  
کس شان سے پرتو فگن ہوگا۔ اس کا تذکرہ بہارِ آفریں بھی ہے اور روحانی لطف و سرور کا باعث  
بھی، آئیے ہم بھی احمد رضا خاں کی اس کیفِ سامانی سے چند اشعار کا عصری حسن مستعار لے کر  
دلوں کو شاد کام کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔

شکرِ خدا کہ آج گھڑی اس سفر کی ہے  
جس پر نثارِ جانِ فلاح و ظفر کی ہے  
اس کے طفیل حج بھی خدانے کرا دیئے  
اصلِ مرادِ حاضری اس پاک در کی ہے

جب آپ حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کر کے مدینہ منورہ حاضر ہوتے ہیں تو آپ کی  
کیفیت دیدنی ہوتی ہے اور مدینہ منورہ کا تصور ان سے کس طور خراجِ عقیدت حاصل کرتا ہے اس کی  
جھلک ملاحظہ ہو:

حاجو آؤ شہنشاہ کا روضہ دیکھو  
کعبہ تو دیکھ چکے کعبے کا کعبہ دیکھو



غور سے سن تو رضا کعبہ سے آتی ہے صدا  
مری آنکھوں سے مرے پیارے کا روضہ دیکھو  
مدینہ منورہ کے بارے میں احترام و عقیدت کا کس شان سے اظہار کرتے ہیں، انداز  
دیکھئے:

مدینے کے خطے خدا تجھ کو رکھے  
غریبوں فقیروں کے ٹھہرانے والے  
حرم کی زمیں اور قدم رکھ کے چلنا  
ارے سر کا موقع ہے او جانے والے  
اور مدینہ منورہ کی گلیوں میں اس عاشق رسول کے دل پر کیا گزرتی ہے۔ آنکھیں کس طرح  
اشکوں کی لڑیاں پروتی ہیں۔ انہیں یہاں ہر گام پر سرکارِ دو عالم ﷺ کے جلوے نظر آتے ہیں۔  
ایک طرف آپ کی بے قراری ہے اور دوسری طرف آقا و مولا کی نوازشوں کا احساس، اسی احساس  
سے سرشار ہو کر مدینہ طیبہ کے گلی کو چوں کا طواف کرتے ہیں۔ گنبدِ خضریٰ کی زیارت کرتے کرتے  
جی نہیں بھرتا، دل مکینِ گنبدِ خضریٰ کی زیارت کے لئے مچلتا رہا، یہی بے قراری رنگ لائی اور  
حضور ﷺ کی عنایاتِ بے کراں سے نوازے گئے۔ اس کیفیت کا اظہار کرتے ہیں۔

وہ سوئے لالہ زار پھرتے ہیں  
تیرے دن اے بہار پھرتے ہیں  
اس گلی کا گدا ہوں میں، جس میں  
مانگتے • تاجدار پھرتے ہیں  
پھول کیا دیکھوں مری آنکھوں میں  
دشتِ طیبہ کے خار پھرتے ہیں

شاہ احمد رضا خاں کا نعتیہ مجموعہ ”حداائق بخشش“ ہے جس کا اولین سال اشاعت ۱۳۲۵ھ  
ہے۔ رضا بریلوی کے نعتیہ کلام کا ایک دلاویز اور خوبصورت حصہ نعتیہ قصائد پر مشتمل ہے۔ ان میں  
سے قصیدہ نوریہ، قصیدہ معراجیہ اور آپ کا طویل سلام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ قصیدہ نوریہ  
میں بطور خاص حضور نبی کریم ﷺ کی ولادت اقدس کے حوالے سے آپ کی صفات عالیہ کو موضوع  
شاعری بتایا گیا ہے۔ یہ قصیدہ اس قدر جامع اور اثر آفریں ہے کہ بے شمار عشاقِ مصطفیٰ ﷺ اسے  
وظیفہ عقیدت جان کر پڑھتے ہیں۔



صبح طیبہ میں ہوئی بٹا ہے باڑا نور کا  
صدقہ لینے نور کا آیا ہے تارا نور کا  
تاج والے دیکھ کر تیرا عمامہ نور کا  
سر جھکاتے ہیں الہی بول بالا نور کا  
تیری نسل پاک سے ہے بچہ بچہ نور کا  
تو ہے عین نور تیرا سب گھرانہ نور کا

”قصیدہ معراجیہ“ میں نبی کریم ﷺ کے سفر معراج کے حوالے سے آپ کی عظمت و فضیلت کا ذکر کیا گیا ہے یہ قصیدہ بذاتِ خود فکر و فن کا شہکار اور کاروانِ مدحت و نعت کا افتخار ہے۔ طویل بحر میں لکھا گیا یہ قصیدہ تشبیہات استعارات اور برجستہ تراکیب کے حوالے سے اردو ادب کے لئے سرمایہٴ اعزاز ہے۔ یہ قصیدہ آپ کی جودت و جدتِ طبع کا آئینہ دار ہے۔ ادائیگی و تسلسل اور زبان کی لطافت و پاکیزگی کے اعتبار سے معاصرین کے معراجیہ قصائد میں سب سے بلند ہے۔ اعلیٰ حضرت کے ہم عصر مشہور نعت گو شاعر محسن کا کوروی نے انہی دنوں معراج پر قصیدہ ”سمت کاشی سے چلا جانبِ متھر ابادل“ لکھا تھا:

محسن کا کوروی اپنا قصیدہ سنانے کے لئے بریلی میں مولانا احمد رضا خاں کے پاس گئے۔ ظہر کے وقت دو شعر سننے کے بعد طے ہوا کہ محسن کا کوروی کا پورا قصیدہ عصر کی نماز کے بعد سنا جائے، عصر کی نماز سے قبل مولانا نے خود یہ قصیدہ معراجیہ تصنیف فرمایا۔ نماز عصر کے بعد جب یہ دونوں بزرگ اکٹھے ہوئے تو مولانا نے محسن کا کوروی سے فرمایا کہ پہلے میرا قصیدہ معراجیہ سن لو، محسن کا کوروی نے جب مولانا کا قصیدہ سنا تو اپنا قصیدہ لپیٹ کر جیب میں ڈال لیا اور کہا مولانا، آپ کے قصیدے کے بعد میں اپنا قصیدہ نہیں سنا سکتا۔ اس عالمانہ و عارفانہ نکات کے حامل اور شاعرانہ کمالات سے لبریز قصیدے کے چند اشعار سے قارئین بھی اپنے گلشنِ ایمان کو بہار درکنار کر لیں۔

وہ سرورِ کشور رسالت جو عرش پر جلوہ گر ہوئے تھے  
نئے نزلے طرب کے ساماں عرب کے مہمان کے لئے تھے  
ادھر سے پیہم تقاضے آنا ادھر سے مشکل قدم بڑھانا  
جلال و ہیبت کا سامنا تھا جمال و رحمت ابھارتے تھے



یہ پھوٹ پڑتی تھی ان کے رخ کی کہ عرش تک چاندنی تھی چٹکی  
وہ رات کیا جگمگا رہی تھی جگہ جگہ نصب آئینے تھے  
ثنائے سرکار ہے وظیفہ قبول سرکار ہے تمنا  
نہ شاعری کی ہوس نہ پروا روی تھی کیا کیسے قافیے تھے

مولانا احمد رضا خان کا سلام ہر لحاظ سے ادب عالیہ کا ایک حصہ ہے۔ اسے فن شاعری کے حوالے سے دیکھیں، یا محبت و عقیدت کے حوالے سے، ثنائے مصطفیٰ ﷺ کی روشنی میں دیکھیں یا الفاظ و تراکیب کی برجستگی کے حوالے سے۔ حسن زبان و بیان کے آئینے میں دیکھیں یا شکوہ تراکیب و استعارات کی جلوہ گری کے پیمانے سے اس کے فنی و شعری محاسن کا جائزہ لیں یہ سلام دلوں کو محبت رسول ﷺ کی دولت عطا کرتا، پتھر دلوں کو روحانی گداز بخشتا اور اپنے مخصوص صوتی آہنگ میں دلوں کے تار چھیڑتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ کوثر و تسنیم کی دھلی ہوئی زبان، مشک و عنبر سے بسا ہوا قلم، جمال عقیدت سے آباد و سرشار لہجہ اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ سلام حضور ﷺ کے نورانی سراپا کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ کے ایک ایک عضو پر عقیدت کی مہکبار پتیاں نچھاور کی گئی ہیں۔ قارئین کے ذوق کی جلا کے لئے چند اشعار پیش ہیں۔

شہر یارِ ارم تاجدارِ حرم  
نو بہارِ شفاعت پہ لاکھوں سلام  
صاحبِ رجعتِ شمس و شق القمر  
نائبِ دستِ قدرت پہ لاکھوں سلام  
قد بے سایہ کے سایہِ مرحمت  
ظلمِ ممدودِ رافت پہ لاکھوں سلام  
دور و نزدیک کے سننے والے وہ کان  
کانِ لعلِ کرامت پہ لاکھوں سلام  
جس کے ماتھے شفاعت کا سہرا رہا  
اس جبینِ سعادت پہ لاکھوں سلام  
پتلی پتلی گلِ قدس کی پتیاں  
ان لبوں کی نزاکت پہ لاکھوں سلام

غیر معمولی جذبہ عشق رسول ﷺ علوم شرعیہ پر مکمل عبور، روحانی سوز و گداز، شدت



احساس اور خلوص جذبات کی ہم آہنگی نے فاضل بریلوی علیہ الرحمۃ کے کلام کو حسن تغزل عطا کر دیا ہے جو آپ سے پہلے کسی نعت گو شاعر میں نظر نہیں آتا، آپ وہ پہلے نعت گو شاعر ہیں جنہوں نے نعت کو غزل کا آہنگ اور لہجہ عربی عطا کیا۔ ردیف اور قوافی کے اہتمام سے نعت جیسی پاکیزہ صنف کو غزل پر فوقیت عطا کر دی۔ آپ نے اس عروسِ سخن کو مجازی محبوب کی دہلیز سے اٹھایا، شاعری کو غزل کے شہستانِ ہوس سے نکالا اور ایوانِ نعت کے دلکش ماحول میں اس سے چراغِ ہدیٰ کا کام لیا نعت اس وقت تک حسن تغزل سے محروم رہتی ہے جب تک اس میں عشق اپنی انتہا کو نہ چھونے لگے اور سوز و گداز کا پھوٹتا ہوا سرچشمہ آنکھوں سے محبوب کی محبت کے نام پر اشکوں کا خراج نہ لینے لگے۔ حضرت احمد رضا خاں کی نعتیہ شاعری میں تو سوزِ بلالؓ کی تڑپ تھی، عشقِ اولیسؑ کی جلوہ گری تھی، رومی و جامی کی تڑپ تھی۔ آپ نے اپنے معاصرین کی نعت گوئی کے مقابلے میں کہ جو زیادہ تر مولود ناموں اور نظم گوئی پر مشتمل تھی ایک نیا راستہ نکالا۔ یہ راستہ وہی تھا جس پر سے سیدنا حسان بن ثابتؓ کی قیادت میں پہلا کاروانِ نعت گزرا تھا۔ اس کاروانِ نعت کے قدموں سے اُبھرنے والی گرد کے ایک ایک ذرے نے بے شمار ستارے تخلیق کئے تھے۔ امام احمد رضا خاں نے اپنی عقیدت کی پلکوں سے ان ستاروں کو چنا۔ فیاضی قدرت نے ان کی شاعری کو وہ حسن تغزل عطا کر دیا کہ ایک زمانہ بیت جانے کے باوجود آپ کا کلام حالات کے ظلمت کدوں میں اسمِ محمد ﷺ کے اُجالے بکھیر رہا ہے۔ حسن تغزل کے نام پر چند اشعار ملاحظہ ہوں:

نہ آسمان کو یوں سرکشیدہ ہونا تھا  
حضورؐ خاکِ مدینہ خمیدہ ہونا تھا  
نعمتیں بانٹتا جس سمت وہ ذیشان گیا  
ساتھ ہی منشیؑ رحمت کا قلمدان گیا  
دل ہے وہ دل جو تری یاد سے معمور رہا  
سر ہے وہ سر جو تیرے قدموں پہ قربان گیا  
دل اپنا بھی شیدائی ہے اس ناخنِ پا کا  
اتنا بھی مہِ نو پہ نہ اے چرخِ زمن پھول  
اہلِ صراطِ روحِ امیں کو خبر کریں  
جاتی ہے اُمتِ نبویؐ فرشِ پر کریں



ان کی حرم کے خارکشیدہ ہیں کس لئے  
آنکھوں میں آئیں سر پہ رہیں دل میں گھر کریں

چونکہ احمد رضا فاضل بریلوی نامور محدث اور علوم شریعت کے عالم کامل تھے۔ تاریخ اور سیرت مصطفوی ﷺ کے روشن ادوار پر آپ کی گہری نظر تھی۔ اس لئے آپ نے جہاں حسن تغزل کی بہار بکھیرتے ہوئے اپنے آقا و مولا ﷺ کے لامتناہی فیوض و برکات کا تذکرہ کیا ہے وہاں آپ نے اپنے علمی کمالات اور علوم دینیہ پر گہری گرفت رکھنے کی بنا پر بہت سے ایسے واقعات اور معجزات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جن سے عظمت و شان رسول ﷺ کا اظہار ہوتا ہے۔ اس ضمن میں ان کی قرآن فہمی اور احادیث نبوی پر عبور نے انہیں بہت مدد دی ہے۔ بعض نعتیہ اشعار تو آیات قرآنی اور احادیث نبوی کا منظوم ترجمہ معلوم ہوتے ہیں۔ آپ نے قرآنی آیات اور احادیث کو اس خوبی سے اپنی نعتوں میں سمویا ہے کہ ہر صاحب فکر کو ان کی قدرت فن کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ بعض نعتوں میں تو عربی کے الفاظ اس طرح جگہ پا چکے ہیں کہ مستقل طور پر انہی کا حصہ معلوم ہوتے ہیں۔ ان نعتوں میں عربی الفاظ کی آمیزش نے کس طرح ان نعتوں کے حسن کو دو بالا کیا ہے اس کی بہترین مثال ان کی یہ شہرہ آفاق نعت ہے

لَمْ يَأْتِ نَظِيرُكَ فِي نَظَرٍ مِثْلٍ تَوْنُهُ شَدِيدًا جَانًا

جگ راج کو تاج تو رے سر سو ہے تجھ کو شہ دوسرا جانا

اب چند مثالیں خصائص نبوی اور معجزات و کمالات مصطفی ﷺ کے حوالے سے پیش ہیں۔

تیری مرضی پا گیا سورج پھرا اُلٹے قدم

تیری انگلی اٹھ گئی مہ کا کلیجہ چر گیا

تیری رحمت سے صفی اللہ کا بیڑا پار تھا

تیرے صدقے سے نجی اللہ کا بیڑا تر گیا

تیری آمد تھی کہ بیت اللہ مجرے کو جھکا

تیرے ہیبت تھی کہ ہر بت تھر تھرا کر گر گیا

کیوں جناب بوہریرہ تھا وہ کیسا جام شیر

جس سے ستر صاحبوں کا دودھ سے منہ پھر گیا

ترے خلق کو حق نے عظیم کیا ترے خلق کو حق نے جمیل کیا

کوئی تجھ سا ہوا ہے نہ ہوگا شہا ترے خالق حسن و ادا کی قسم



مولا علی نے داری تری نیند پر نماز  
اور وہ بھی عصر سب سے جو اعلیٰ خطر کی ہے  
صدیق بلکہ غار میں جان اس پہ دے چکے  
اور حفظ جاں تو جان فروض غرر کی ہے  
ہاں تو نے ان کو جان انہیں پھیر دی نماز  
پر وہ تو کر چکے تھے جو کرنی بشر کی ہے  
کھائی قرآن نے خاک گزر کر قسم  
اس کف پا کی حرمت پہ لاکھوں سلام

امام احمد رضا کی حیثیت اس صدی کے نعت گو شعراء میں میر کارواں کی ہے۔ آپ کی نعتوں نے فقط آپ کے دور کو نہیں بلکہ آنے والے ادوار کو بھی متاثر کیا۔ فقہی اور شرعی امور میں آپ سے شدید اختلاف رکھنے والے حضرات بھی جب نعت مصطفیٰ ﷺ کا تذکرہ کرتے ہیں تو تمام تر تعصب کے باوجود انہیں بھی ایوان نعت کی سب سے سر بلند مسند پر حضرت رضا بریلوی کو ہی جگہ دینی پڑتی ہے۔ ایک مضمون کہ جہاں صفحات کی تنگ دامانی راہوار قلم کو آگے بڑھنے سے روک رہی ہو بھلا آپ کے تمام تر شعری اوصاف کا کس طور احاطہ کر سکتا ہے۔ آج فاضل بریلوی کی اثر آفریں نعت گوئی اپنی تاثر انگیزی کی گرفت کو اس قدر مضبوط کر چکی ہے، کہ فقط برصغیر میں ہی نہیں بلکہ دنیا بھر کے مسلم ممالک میں آپ کی شخصیت اور کلام پر تحقیقی کام کا سلسلہ جاری ہے۔ اس ضمن میں شفیق بریلوی کی کتاب ارمغان نعت کے حوالے سے کراچی میں ۱۹۷۵ء میں منعقد ہونے والی تعارفی تقریب میں مولانا کوثر نیازی کی یہ رائے خاص اہمیت رکھتی ہے۔

”بریلی میں ایک شخص پیدا ہوا جو نعت گوئی کا امام تھا اور احمد رضا خاں جس کا نام تھا۔ ان سے ممکن ہے بعض پہلوؤں میں لوگوں کو اختلاف ہو۔ عقیدوں میں اختلاف ہو، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عشق رسول ﷺ ان کی نعتوں میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔“

مولانا احمد رضا خاں نے نعت گوئی میں قرآن حکیم سے بھرپور راہنمائی لی۔ اس ضمن میں ان کے فتاویٰ رضویہ بخوبی شاہد ہیں کہ وہ نعت گوئی کے تقاضوں کو کس درجہ سمجھتے تھے اور نعت گو شعراء سے کس درجہ احتیاط اور ادب کی توقع رکھتے تھے۔ قرآن حکیم اور اپنی شعر گوئی کے حوالے سے کہتے ہیں۔

ہوں اپنے کلام سے نہایت محفوظ

بے جا سے ہے المنة للہ محفوظ



قرآن سے میں نے نعت گوئی سیکھی

یعنی رہے احکام شریعت ملحوظ

شاعری میں ان کے پیش نظر مداح رسول ﷺ سیدنا حسان بن ثابتؓ کی ذات گرامی مشعل راہ تھی اور موجودہ دور کے شعراء میں مولانا کفایت علی کافی کی نعت گوئی سے متاثر تھے۔ اکابر کے ہاں جس قدر ادب و احتیاط کا غلبہ تھا۔ ویسا ہی منظروہ ہر دور کے نعت گو شعراء کے ہاں دیکھنا چاہتے تھے۔ اس حوالے سے ان کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

توشہ میں غم و اشک کا سماں بس ہے

افغانِ دل زار و حدی خواں بس ہے

رہبر کی رہ نعت میں گر حاجت نہ ہو

نقشِ قدم حضرتِ حسانؓ بس ہے

احتیاط اور ادب کا یہ عالم تھا کہ ایک صاحب نے آپ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر اپنے اشعار سنانے کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا میں اپنے چھوٹے بھائی حسن میاں یا حضرت کافی بدایونی کا کلام سنتا ہوں (اس لیے کہ ان کا کلام میزان شریعت پر ٹٹلا ہوتا ہے) اگرچہ حضرت کافی کے ہاں لفظ ”رعنہ“ استعمال ہوا ہے لیکن اگر وہ اپنی غلطی پر آگاہ ہو جاتے تو یقیناً اس لفظ کو بدل دیتے۔ پھر خیال خاطر احباب کے پیش نظر ان صاحب کو کلام سنانے کی اجازت عطا کر دی۔ ان کا ایک مصرعہ یوں تھا۔

شانِ یوسف جو گھٹی ہے تو اسی در سے گھٹی

آپ نے فوراً اس شاعر کو ٹوک دیا اور فرمایا حضور اکرم ﷺ کسی نبی کی شان گھٹانے کے لیے نہیں بلکہ انبیائے کرام کی شان و شوکت کو سر بلند سے سر بلند کرنے کے لیے تشریف لائے تھے۔ مصرعہ یوں بدل دیا جائے۔

شانِ یوسف جو بڑھی ہے تو اسی در سے بڑھی

یہ احکام شریعت کو حد درجہ ملحوظ رکھنے ہی کا کمال تھا کہ مصرعہ کی تبدیلی سے مضمون انتہائی جاندار اور شریعت کے تقاضوں کے عین مطابق ہو گیا۔

رضا بریلوی کا دور مسلمانوں پر انتہائی مصیبت اور ابتلا کا دور تھا۔ حکومت تو ہاتھوں سے چھن چکی تھی۔ بد قسمتی سے مسلمان احساسِ زیاں سے بھی محروم ہو چکے تھے۔ غیر مسلم قوتیں ان پر اپنے نظریات ٹھونس رہی تھیں اور دوسری طرف نیشنلسٹ مسلم زعماء و علماء جبہ و دستار اور منبر و محراب کے



وارث ہونے کے باوجود اسلامی نظریات کی شوکت دیرینہ کے تصور کو بھی پاش پاش کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ ایسے عالم میں احمد رضا کا ذہن جاگ رہا تھا۔ ان کی نظریاتی سوچ بلند یوں کو چھو رہی تھی۔ انہوں نے مسلمانوں کے نظریاتی اعتقادات سے بغاوت کرنے والی ہر قوت کو للکارا اور انہیں پیغام دیا۔

سونا جنگل رات اندھیری چھائی بدلی کالی ہے  
سونے والو جاگتے رہو چوروں کی رکھوالی ہے  
آنکھ سے کا جل صاف چرائیں یاں وہ چور بلا کے ہیں  
تیری گٹھڑی تاکی ہے اور تو نے نیند نکالی ہے

اور یہ نعت مصطفیٰ ﷺ کا عملی فیضان ہی تھا کہ آپ کی آواز تاریخ کے سب سے بڑے حدی خوان کی صدائے دردناک بن کر برصغیر کے مسلمانوں کے دلوں میں گھر کر گئی۔ آپ کو دشنام طرازیوں اور طعنوں کے طوفان سے گزرنا پڑا مگر آپ کی نظم اور نثر نے حیرت انگیز انقلاب برپا کر دیا۔ وہ محبت رسول میں کسی سمجھوتے کے قائل نہیں تھے اور اس سلسلہ میں انہیں اپنے قلم کی قوت اور سرکارِ دو عالم ﷺ کی تائید و کرم کا پورا پورا احساس تھا۔

وہ رضا کے نیزے کی مار ہے کہ عدو کے سینے میں غار ہے  
کسے چارہ جوئی کا دار ہے کہ یہ واردار سے پار ہے

اور اس حقیقت میں کلام نہیں کہ رضا کے نیزے کی مار نے کتنے ہی اسلام دشمنوں کے عزائم کو خاک میں ملا دیا۔ دو قومی نظریہ کے دشمنوں سے مثالی جنگ لڑی۔ گاندھی اور سبھاش چندر بوس کو راہنما بنانے والوں کا تعاقب کیا۔ پاکستان دشمنوں کو بے نقاب کیا۔ اس ضمن میں انہوں نے بڑے بڑے رہنماؤں کی پروا نہیں کی اور ان کو سرعام للکارا۔ ان کی نعت گوئی نے ایک موثر ہتھیار کا کردار ادا کیا۔ جس طرح حضور ﷺ نے حسان بن ثابتؓ کو اپنی شاعری سے کفر کے خلاف شمشیر و سنان کا کام لینے کا مشورہ دیا تھا اور واقعی انہوں نے ایسا ہی کر دیا۔ اسی طور پر رضا بریلوی نے اپنی نعت گوئی سے ایک زبردست نظریاتی حصار قائم کر دیا۔ اس سلسلہ میں ان کی زبان دانی فصاحت و بلاغت، تراکیب و تشبیہات، ضائع بدائع پر بھرپور گرفت اور اسلام سے غیر متزلزل وابستگی نے اہم کردار ادا کیا۔ رضا بریلوی کی زبان شستگی اور روانی میں اپنے سے پہلے کے ادوار اور اپنے دور کے اساتذہ فن میں کسی سے کم نہیں بلکہ بعض حوالوں سے سبقت لے جاتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

ملاحظہ کیجئے۔



دل ہے وہ دل جو تری یاد سے معمور رہا  
سر ہے وہ سر جو ترے قدموں پہ قربان گیا  
لے خبر جلد کہ غیروں کی طرف دھیان گیا  
میرے مولیٰ میرے آقا ترے قربان گیا  
جان و دل ہوش و خرد سب تو مدینے پہنچے  
تم نہیں چلتے رضا سارا تو سامان گیا



ہے لب عیسیٰ سی جاں بخشی زالی ہاتھ میں  
سنگ ریزے پاتے ہیں شریں مقالی ہاتھ میں  
مالک کونین ہیں گو پاس کچھ رکھتے نہیں  
دو جہاں کی نعمتیں ہیں لن کے خالی ہاتھ میں



کس کے جلوے کی جھلک ہے یہ اُجالا کیا ہے  
ہر طرف دیدۂ حیرت زدہ تکتا کیا ہے  
محمد ﷺ منظرِ کامل ہے حق کی شانِ عزت کا  
نظر آتا ہے اس کثرت میں کچھ انداز وحدت کا

ممتاز نقاد نیاز فتح پوری آپ کے علم و فضل اور شعری محاسن پر آپ کی بھرپور گرفت کے قائل تھے۔ انہوں نے فاضل بریلوی کو قریب سے بھی دیکھا اور ان کی شخصیت کا مشاہدہ کیا تھا ان کا کہنا ہے کہ ”اُردو نعت کی تاریخ میں اگر کسی فردِ واحد نے شعرائے نعت پر سب سے زیادہ گہرے اثرات مرتسم کئے ہیں تو وہ بلاشبہ مولانا احمد رضا کی ذات ہے۔“ اسی حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے مزید کہتے ہیں۔

”حجرِ علمی“ زورِ بیان اور وابستگی و عقیدت کے عناصر ان کی نعت میں یوں گھل مل اور رچ بس گئے ہیں کہ اُردو نعت میں ایسا خوشگوار امتزاج کہیں اور دیکھنے میں نہیں آیا..... اُردو نعت کی ترویج و اشاعت میں ان کا حصہ سب سے زیادہ ہے۔ کسی ایک شاعر نے اُردو نعت پر وہ اثرات نہیں ڈالے جو مولانا احمد رضا خاں کی ذات نے۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ اعلیٰ معیاری نعتیں تخلیق کیں بلکہ ان کے زیر اثر نعت کے ایک منفرد دبستان کی تشکیل ہوئی۔“



شاہ احمد رضا خاں نے مدحت سر کا صلی اللہ علیہ وسلم کے جس دبستان کی بنیاد ڈالی تھی اس کی بدولت آج ایک زمانہ ان کا ہمنوا نظر آتا ہے اور ہر دور میں ان کے ہمنواؤں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ فاضل بریلوی کو اول و آخر مدحت سر کا صلی اللہ علیہ وسلم سے سروکار تھا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی کے یہ جملے خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

”نعت کے مشمولات میں خصائل و شمائل کا ذکر ہر نعت گو کے ہاں مرغوب رہا ہے۔ اس لیے کہ ان کا شمار ہی عظمت کا احساس دلاتا ہے۔ فاضل بریلوی کے ہاں خصائص میں وجہ تخلیق ہونا، سراپا نور ہونا، قاسم عطایا ہونا، سب سے افضل ہونا، سر تا بقدم شان حق ہونا، جان ایمان ہونا، کائنات ہست و بود کی رونق و جلا ہونا اور مرکز عقیدت و محبت ہونا بہت نمایاں ہیں۔ یہ خصائص ان کے ایمان کا حصہ ہیں۔ اسی لیے ردیف اور قافیہ کے تنوع کے باوجود تذکرہ انہی کا ہوتا رہا۔“

(نعت رنگ، ۱۸)

اسی حوالے سے دیکھیں تو رضا بریلوی مداحی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں لہجہ بدل بدل کر نئے نئے مضامین کے پھول کھلاتے نظر آتے ہیں۔

وہی نور حق وہی ظل رب ہے انہی کا سب سے انہیں سے سب  
نہیں ان کی ملک میں آسماں کہ زمیں نہیں کہ زماں نہیں



پردہ اس چہرہ انور سے اٹھا کر اک بار  
اپنا آئینہ بنا اے مہ تاباں ہم کو



وہ جو نہ تھے تو کچھ نہ تھا وہ جو نہ ہوں تو کچھ نہ ہو  
وہ جاں ہیں دو جہان کی جان ہے تو جہان ہے



شہا کیا ذات تیری حق نما ہے فرد امکاں ہے  
جلتے بجھا دیئے ہیں روتے ہنسا دیئے ہیں



رضا پل سے اب وجد کرتے گزرے  
کہ ہے رب سلم صدائے محمد صلی اللہ علیہ وسلم





شفاعت کرے حشر میں جو رضا کی  
سوا تیرے کس کو یہ قدرت ملی ہے



فریاد اُمتی جو کرے حالِ زار پر  
ممکن نہیں کہ خیر بشر کو خبر نہ ہو

مدعا طلبی یا طلبِ شفاعت شعرائے نعت کا خاص جزو رہا ہے۔ استغاثہ اور پھر توسل انہیں اپنے مددِ وح کی عظمت کے اظہار اور اپنی بے کسی و بے بسی کے اقرار کا قرینہ بن چکا ہے۔ اگر مدعا طلبی شاہانِ دنیا سے ہو تو یہاں بڑے سے بڑا قصیدہ بھی پست نظر آتا ہے لیکن اگر مدعا طلبی محبوبِ دو عالم ﷺ سے ہو تو بھر نعت گو کی ہر فکری کاوش ادبِ عالیہ کی بلندیوں کو چھوتی نظر آتی ہے۔ نعت میں بات فقط قوافی و اوزان کی نہیں بلکہ یہاں تو توسل اور شفاعت طلبی کے لیے شاعر کی بلند خیالی بطور خاص مد نظر رکھی جاتی ہے۔ فاضل بریلوی کے ہاں یہ مضمون ہر بار نئے انداز اور نئے حسن سے جلوہ گر نظر آتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مرکز و محور ہی حضور ﷺ کی رحمتِ بے کراں کا حصول ہے۔ فاضل بریلوی کے ہاں علمِ شریعت، قرآن و حدیث اور سچے جذبوں کا توازن ہے۔ وہ استغاثہ بھی پیش کرتے ہیں تو آقا و مولانا ﷺ کی سیرت نگاری کو بھی مد نظر رکھتے ہیں کہتے ہیں۔

عرش سے مژدہ بلیقش شفاعت لایا  
طار۔ سدرہ نشین مرغِ سلیمانِ عرب



مجرم ہوں اپنے عفو کا ساماں کروں شہا  
یعنی شفیع روزِ جزا کا کہوں تجھے



سنتے ہیں کہ محشر میں صرف اُن کی رسائی ہے  
گر اُن کی رسائی ہے لو جب تو بن آئی ہے



اُنت فہم نے عدو کو بھی لیا دامن میں  
عیش جاوید مبارک تجھے شیدائی دوست





مجرم کو بارگاہ عدالت میں لائے ہیں  
تکتا ہے بے کسی میں تری راہ لے خبر



اہل عمل کو ان کے عمل کام آئیں گے  
میرا ہے کون تیرے سوا آہ لے خبر



مانگیں گے مانگے جائیں گے منہ مانگی پائیں گے  
سرکار میں نہ ”لا“ ہے نہ حاجت اگر کی ہے



لب واہیں آنکھیں بند ہیں پھیلی ہیں جھولیاں  
کتنے مزے کی بھیک ترے پاک در کی ہے  
منگتے کا ہاتھ اٹھتے ہی داتا کی دین تھی  
دوری قبول و عرض میں بس ہاتھ بھر کی ہے

جب ہم امت اسلام پر پناہ ہونے والے صدمات اور مصائب کا ذکر کرتے ہیں تو الطاف  
حسین حالی کی یہ مناجات ہر عہد کی ترجمانی کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

اے خاصہ خاصانِ رُسل وقتِ دعا ہے  
امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے

یہ استغاثہ یا نوحۃ امت اسلام سقوطِ بغداد سے لے کر سقوطِ ڈھاکہ تک ہر عہد اور ہر زمانے  
میں زوال آورہ مسلمانوں کے رنج و الم کا ترجمان ہے۔ حالی کے اس استغاثے نے اردو ادب  
میں باقاعدہ استغاثہ نگاری کی بنیاد رکھی اسی کیفیت کی ترجمانی کرتی ہوئی رضا بریلوی کی صدائے  
غمناک ابھری۔

البحر علیٰ والتموج طغئے من بے کس و طوفان ہوش ربا

منجد ہار میں ہوں بگڑی ہے ہوا، موری نیا پار لگا جانا

پُر شکستہ لمحات میں غم کے ماروں کی نگاہیں سوئے مدینہ ہی اُٹھتی ہیں۔ یہاں فاضل بریلوی  
کے آنسو بارگاہِ رسول ﷺ میں شرح غم بیان کر رہے ہیں۔



نعت کہتے ہوئے فاضل بریلوی کہیں بھی یاس و قنوطیت کا شکار نہیں ہوتے۔ ان کا حضور ﷺ سے عشق و ارادت کا رشتہ اس قدر مضبوط، غیر متزلزل اور مستحکم ہے کہ وہ راہ حیات سے لے کر میدانِ حشر تک کہیں بھی مایوس و ناامیدی کو قریب نہیں آنے دیتے۔ وہ جانتے ہیں کہ انہوں نے جس ذات والا صفات کو اپنا رہبر و راہنما مانا ہے وہ محبوبِ دو عالم اور ممدوحِ خدا و ملائکہ ہے۔ یہ وہ ذات ہے جس کے سر اقدس پر شفاعت کا نور آفریں تاج جگمگا رہا ہے۔ جس کے ماتھے پر عفو و درگزر اور لطف و کرم کا جمال اپنی بہار دکھا رہا ہے۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر سلام سندیلوی کی رائے ملاحظہ کیجئے۔

”جہاں تک امام احمد رضا خاں کی شاعری کا تعلق ہے وہ رسمی یا روایتی نہیں۔ آپ کو مذہب سے زبردست علاقہ تھا۔ آپ کو بزرگانِ دین سے عقیدت تھی۔ آپ حبِ رسول ﷺ میں غرق تھے۔ اس لیے آپ کی شاعری میں صداقت موجود ہے۔ آپ کی شخصیت اور شاعری کے درمیان فاصلہ نہیں ہے بلکہ آپ کی شخصیت آپ کی شاعری ہے اور آپ کی شاعری آپ کی شخصیت، شخصیت اور شاعری میں اس قدر ہم آہنگی اُردو کے بہت کم شعراء کے یہاں نکلے گی۔“ (المیزان، امام احمد رضا نمبر ص ۴۶۶)

اسی بات کو آگے بڑھانے میں سید شان الحق حقی کی رائے کا مطالعہ کیجئے۔

”میرے نزدیک مولانا کا نعتیہ کلام ادبی تنقید سے مُبرا ہے۔ اس پر کسی ادبی تنقید کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی مقبولیت اور دل پسندی ہی اس کا سب سے بڑا ادبی کمال اور مولانا کے مرتبے پر دل ہے۔“ (خیابانِ رضا ص ۶۶)

ان دونوں آراء کو دیکھئے تو ہماری متذکرہ بالا رائے کو تقویت ملتی ہے کہ رضا بریلوی کی روحانی اور فقہی شخصیت اور آپ کی شاعری ایک دوسرے میں گم ہو گئی تھیں۔ حضور ﷺ کی رحمت بے کراں پر آپ کا بھروسہ فقط آپ کی شاعری کا خاصہ ہی نہیں تھا بلکہ آپ اپنی شخصیت اور نظریات کے لحاظ سے اس پر کامل ایمان بھی رکھتے تھے۔ حضور ﷺ کی نگاہِ عنایت بے کراں پر آپ کا کس قدر بھروسہ تھا اس کو آپ نے مکالماتی اسلوب میں بیان کیا ہے۔ کمال کی روانی ہے۔ غضب کا لسانی خرام ہے کہ پڑھنے والا آپ کی فکر کی بلند پروازی کے ساتھ ساتھ محو پرواز نظر آتا ہے۔

بے بسی ہے جو مجھے پرسشِ اعمال کے وقت

دوستو کیا کہوں اس وقت تمنا کیا ہے



کاش فریاد مری سن کے یہ فرمائیں حضور  
ہاں کوئی دیکھو! یہ کیا شور ہے! غوغا کیا ہے  
کون آفت زدہ ہے؟ کس پہ بلا ٹوٹی ہے  
کس مصیبت میں گرفتار ہے صدمہ کیا ہے  
کس سے کہتا ہے کہ اللہ خبر لیجئے میری  
کیوں ہے بے تاب یہ بے چینی کا رونا کیا ہے  
یوں ملائک کریں معروض کہ اک مجرم ہے  
اس سے پرسش ہے بتا تو نے کیا کیا کیا ہے  
سامنا قہر کا ہے دفتر اعمال میں پیش  
ڈر رہا ہے کہ خدا حکم سناتا کیا ہے  
آپ سے کرتا ہے فریاد کہ یا شاہِ رسل  
بندہ بے کس ہے شہا رحم میں وقفہ کیا ہے  
سن کے یہ عرض مری بحرِ کرم جوش میں آئے  
یوں ملائک کو ہو ارشاد ٹھہرنا کیا ہے  
پھر وہ آیا مرا حامی مرا غم خوار اُمم  
جانِ تن بے جاں میں یہ آنا کیا ہے  
اب یہاں احمد فاضل بریلوی کی روح بے قرار کو قرار آنے لگتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

پھر مجھے دامنِ اقدس میں چھپالیں سرور  
اور فرمائیں ہٹو اس پہ تقاضا کیا ہے  
بندہ آزاد شدہ ہے یہ ہمارے در کا  
کیسے لیتے ہو حساب اس پہ تمہارا کیا ہے  
صدقے اس رحم کے اس سایہ دامن پہ نثار  
اپنے بندے کو مصیبت میں بچایا کیا ہے  
اے رضا جانِ عنادل ترے نغموں کے نثار  
بلبلِ باغِ مدینہ ترا کہنا کیا ہے

چھوٹی زمینوں میں دل نشیں اشعار کہنا بہت مشاق شاعر کا کام ہے۔ اس میں زبان بہت



آسان اختیار کرنی پڑتی ہے۔ کم از کم لفظوں میں بڑے سے بڑے مضمون کو قلم بند کرنا ہوتا ہے۔ اساتذہ فن کے ہاں بہت سے ایسے اشعار ملتے ہیں جو چھوٹی زمینوں میں کہے گئے مگر قبولیت دوام پا گئے۔ رضا بریلوی نے چھوٹی زمینوں میں نہایت آسان زبان میں کامیاب نعتیں کہی ہیں۔ مثال کے طور پر چند اشعار درج کئے جاتے ہیں تاکہ آپ کی قادر الکلامی کا یہ پہلو بھی سامنے آ سکے۔

غم ہو گئے بے شمار آقا  
بندہ تیرے شمار آقا  
مجبور ہیں ہم تو فکر کیا ہے  
آقا آقا سنوار آقا



عاصیو تھام لو دامن ان کا  
وہ نہیں ہاتھ جھٹکنے والے  
ارے یہ جلوہ گہ جاناں ہے  
کچھ ادب بھی ہے پھڑکنے والے



دل کو ان سے خدا جدا نہ کرے  
بے کسی لوٹ لے خدا نہ کرے



لطف ان کا عام ہو ہی جائے گا  
شاد ہر ناکام ہو ہی جائے گا  
بے نشانوں کا نشان مٹا نہیں  
مٹتے مٹتے نام ہو ہی جائے گا



زہے عزت و اعتلائے محمد ﷺ  
کہ ہے عرش حق زیر پائے محمد ﷺ  
محمد ﷺ برائے جناب الہی  
جناب الہی برائے محمد ﷺ





حرزِ جاں ذکرِ شفاعت کیجئے  
 نار سے بچنے کی صورت کیجئے  
 آپ ہم سے بڑھ کے ہم پر مہرباں  
 ہم کریں جرم آپ رحمت کیجئے



مصطفیٰ خیر الوری ہو  
 سرورِ ہر دوسرا ہو  
 ہم وہی تنگ جفا ہیں  
 تم وہی جانِ وفا ہو



انبیاء کو بھی اجل آنی ہے  
 مگر ایسی کہ فقط آنی ہے  
 پاؤں جس خاک پہ رکھ دیں وہ بھی  
 پاک ہے روح ہے نورانی ہے



وہ سوئے لالہ زار پھرتے ہیں  
 تیرے دن اے بہار پھرتے ہیں

مولانا احمد رضا خاں کی شاعری کو وہ کمال حاصل ہوا کہ آج تک اس کی مقبولیت و دل پسندی میں کمی واقع نہیں ہو سکی بلکہ تمام اصحابِ تنقید و تاریخ کے مطابق ہر آنے والا دور اُن کی نعتیہ شاعری کی مقبولیت و ہر دلعزیزی میں اضافہ کر رہا ہے صرف آپ کی نعت گوئی پر ہی ڈاکٹریٹ اور ایم فل کی ڈگریوں کے علاوہ یونیورسٹیوں کے مقالہ جات کا شمار کرنے بیٹھیں تو عقلِ محو حیرت ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر ریاض مجید نے آپ کی نعتیہ شاعری کا احاطہ کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے۔

”کسی ایک نعت گو نے اُردو نعت پر وہ اثرات نہیں ڈالے جو مولانا احمد رضا خاں کی نعت گوئی نے، انہوں نے نہ صرف یہ کہ اعلیٰ معیاری نعتیں تخلیق کی ہیں بلکہ ان کے زیر اثر ایک منفرد دبستان کی تشکیل ہوئی۔“



ان کی نعت گوئی کی مقبولیت اور شہرت نے دوسرے شاعروں کو نعت گوئی کی ترغیب دی۔ سبھی تسلیم کرتے ہیں کہ عاشقانِ رسول ﷺ کے لیے آج بھی ان کا کلام ایک موثر تحریکِ نعت کا درجہ رکھتا ہے۔ ”جوں جوں ہم رضا بریلوی کی نعتیہ شاعری کی گہرائیوں میں اترتے ہیں ان کا وجود ایک رجحان ساز شاعر کی حیثیت سے سامنے آتا ہے انہوں نے برصغیر پاک و ہند کی ملتِ اسلامیہ کے باطنی جذبات کو اپنی قلبی واردات سے ہم آہنگ اور مربوط کر کے صنفِ نعت کو نئے تخلیقی امکانات سے روشناس کرایا۔ قلبی تطہیر، ذہنی طہارت، ایمان افروزی کی بدولت ان کی نعتیں دنیائے شعرو سخن کے نعتیہ ادب کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔ بہت سے تذکرہ نگاروں نے انہیں اپنی ذات میں ایک پوری کائنات اور نعت کا ایک مکمل دبستان تسلیم کیا ہے۔ بلاشبہ ”حدائقِ بخشش“ فن کا معجزہ اور سرچشمہ فیض ہے۔ حدائقِ بخشش میں حضرت رضا بریلوی نے بعض مشہور اساتذہ فن کی زمینوں میں بھی طبع آزمائیاں کی ہیں اس سے ان کا مقصد تفاخرِ فن کا اظہار نہیں تھا بلکہ وہ توصیفِ رسول ﷺ کے حوالے سے ہر رنگ اور ہر پیرایہ اختیار کرنا چاہتے تھے۔ اسد اللہ خاں غالب نے ”کیوں“ کی ردیف میں ایک غزل کہی جبکہ امام احمد رضا نے اس ردیف میں دو نعتیں کہی ہیں۔ کالی داس گیتارضا نے غالب اور رضا بریلوی کے ایک ایک شعر کے حوالے سے موازنہ پیش کیا ہے۔

غالب

ہاں نہیں وہ خدا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی  
جس کو ہو جان و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

رضا

پھر کے گلی گلی تباہ ٹھو کریں سب کی کھائے کیوں  
دل کو جو عقل دے خدا تیری گلی میں جائے کیوں

کالی داس گیتارضا لکھتے ہیں۔ مولانا نے ”میں“ کو ”سے“ سے بدل کر نعت کہنے کا حق ادا کر دیا ہے۔ نعت اور غزل کو یک جان کرنا اسی کو کہتے ہیں۔ (سہو سراغ، المیزان کا امام احمد رضا نمبر) ان کا موازنہ ایک اور شعر میں دیکھئے۔

غالب

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں  
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں



یادِ حضور کی قسم غفلتِ عیش ہے ستم  
خوب ہیں قیدِ غم میں ہم کوئی ہمیں چھڑائے کیوں  
دونوں کے ہاں اسلوب کا بانگپن خوب ہے لیکن غالب کے یہاں قنوطیت ہے اور رضا کے  
ہاں رجائیت دوسری نعت کے دو تین اشعار میں اسلوب کا بانگپن دیکھئے۔

یادِ حرم ستم کیا دشتِ حرم ہے لائی کیوں  
بیٹھے بیٹھائے بد نصیب سر پہ بلا بٹھائی کیوں  
کس کی نگاہ کی حیا پھرتی ہے میری آنکھ میں  
زگرس مست ناز نے مجھ سے نظر چرائی کیوں  
اس طرح غالب کی ایک غزل ”کہ یوں“ کی ردیف میں ہے۔ یہ نہایت مشکل ردیف ہے  
جس سے غالب جیسا بلند فکر ہی عہدہ برآ ہو سکتا تھا مگر یہاں بھی امام احمد رضا کا قلم اپنے فنِ نعت  
گوئی کی جولانیاں دکھاتا نظر آتا ہے۔

قصرِ دنی کے راز میں عقلیں تو گم ہیں جیسی ہیں  
روحِ قدس سے پوچھیے تم نے بھی کچھ سنا کہ یوں  
دل کو ہے فکر کس طرح مُردے جلاتے ہیں حضور  
اے میں فدا لگا کر ایک ٹھوکر اسے بتا کہ یوں  
اسی طرح آپ کی بعض نعتیں امیرِ مینائی، داغ دہلوی کی زمین اور ردیفوں میں بھی ملتی ہیں۔  
جن میں آپ نے اسلوب کے بانگپن سے اشعار کے ایسے ایسے گل و سمن کھلائے ہیں جن سے ان  
کی معنی آفرینی اندازِ بیان، سر بلند تخیل اور لطافت خیال کا اظہار ہوتا ہے ورنہ جہاں تک تقابل کا  
تعلق ہے تو نہ وہ امام احمد رضا کے پیش نظر تھا اور نہ ہی ہمارا موضوع ہے۔

سراپا نگاری ہر دور کے شعراء کے پیشِ نظر رہی ہے۔ عربی، فارسی، اردو اور پنجابی سمیت تمام  
زبانوں کے شعراء نے اپنے اپنے اندازِ فکر کے مطابق حضور ﷺ کے سراپائے اقدس کے بارے  
میں اشعار رقم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اردو میں محسن کا کوروی کی شاعری اس کی روشن مثال ہے۔  
لیکن اس ضمن میں جو کمال امام احمد رضا کے حصے میں آیا وہ کسی اور کا مقدر نہیں بن سکا۔ متفرق نعتیہ  
اشعار اپنی جگہ ان کی نعتوں میں تو بعض مقامات پر سراپا نگاری کے حوالے سے مسلسل اشعار  
جگمگاتے نظر آتے ہیں۔ قصیدہ سلامیہ میں تو سراپا نگاری کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ اس ضمن



میں چند ایسے اشعار پیش کئے جاتے ہیں جن میں حضور ﷺ کے سراپائے مبارک کی نورانی جھلکیاں دلوں کے ایوانوں کو جگمگاتی محسوس ہوتی ہیں۔ محبوبان مجازی کا سراپا لکھتے ہوئے مبالغہ آرائی اپنی بلندیوں کو چھوئے لگتی ہے مگر نعت میں تو مبالغہ آرائی بھی پابند شریعت ہو کر رہ جاتی ہے اور پھر امام احمد رضا کا قلم جو شریعت کی حدود سے لمحہ بھر بھٹکنے کو بھی تیار نہیں ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

سر تا بقدم ہے تن سلطانِ زمن پھول  
لب پھول دہن پھول ذقن پھول بدن پھول  
دندان و لب و زلف و رخِ شہ کے فدائی  
ہیں دُرِ عدن لعلِ یمن مشکِ ختن پھول  
کیا غازہ ملا گردِ مدینہ کا جو ہے آج  
نکھرے ہوئے جو بن میں قیامت کی پھبن پھول  
دل اپنا بھی شیدائی ہے اس ناخنِ پا کا  
اتنا بھی مہِ نو پہ نہ اٹے چرخِ کہن پھول  
دل بستہ و خوں گشتہ نہ خوشبو نہ لطافت  
کیوں غنچہ کہوں ہے مرے آقا کا دہن پھول

☆

حسن کھاتا ہے جس کے نمک کی قسم  
وہ ملیحِ دل آرا ہے ہمارا نبی

☆

گلزارِ قدس کا گلِ رنگیں کہوں تجھے  
درمانِ دردِ بلبلی شیدا کہوں تجھے

☆

نارِ دوزخ کو چمن کر دے بہارِ عارض  
ظلمتِ حشر کو دن کر دے نہارِ عارض  
میں تو کیا چیز ہوں خود صاحبِ قرآن کو شہا  
لاکھ مصحف سے پسند آئی بہارِ عارض

ہم تفصیلات سے گریز کرتے ہوئے فقط یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ ”حدائقِ بخشش“ کے



دوسرے درجنوں اشعار کے ساتھ ساتھ آپ کے قصیدہ سلامیہ کے پہلے حصے کا بغور مطالعہ کیا جائے  
قصیدہ سلامیہ کے اشعار میں آپ کے سراقص کے گیسوؤں سے لے کر آپ کے پائے اقدس  
کے ناخنوں تک کو شعری حسن عطا کیا گیا ہے۔

لیلۃ القدر میں مطلع الفجر میں  
مانگ کی استقامت پہ لاکھوں سلام  
جس کے سجدے کو محراب کعبہ جھکی  
ان بھوؤں کی لطافت پہ لاکھوں سلام  
جس طرف اٹھ گئی دم میں دم آ گیا  
اس نگاہ عنایت پہ لاکھوں سلام

غرضیکہ اس حوالے سے بھی امام احمد رضا کی شاعری کا مطالعہ کریں تو یہاں بھی ایک حیرت  
کدہ نظر آتا ہے کہ آپ کے قلم نے جدھر بھی رخ کیا اپنی قادر الکلامی اور شعری سرفرازی کے سکے  
بٹھا دیئے۔ آپ نے سراپا نگاری میں اگرچہ تشبیہات و تراکیب اور دوسرے صنائع بدائع کا استعمال  
کیا ہے مگر دامن شریعت کو کہیں بھی ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا یہاں بھی آپ کی انفرادی احتیاط  
پسندی شعریت اور شریعت کے امتزاج کا خراج لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ امام احمد رضا نے  
قصائد بھی رقم کئے مگر شاہان عجم کے نہیں۔ قصیدہ ایک مشکل صنفِ سخن ہے جو بہت سے لوازمات کا  
تقاضا کرتی ہے مگر احمد رضا تو بہت پہلے ہی یہ اعلان کر چکے ہیں۔

کرے مدح اہل دول رضا پڑے اس بلا میں مری بلا

میں گدا ہوں اپنے کریم کا مرا دین پارہ ناں نہیں

آپ کی فضیلت ادبی اور علمی مقام و مرتبہ کو دیکھتے ہوئے کئی ریاستوں کے اُمرا اور سلاطین  
نے آپ سے اپنے ہاں آنے کی درخواست کے ساتھ ساتھ ہی یہ استدعا بھی کی کہ وہ آپ کے  
علمی اشغال کے تسلسل کے لیے مستقل اعزازی وظائف بھی مقرر کریں گے مگر جو محبت مصطفیٰ ﷺ  
بازارِ حسن حضور ﷺ میں بک چکا ہو وہ کسی اور خریدار کی طرف کیا دیکھے۔ آپ نے بعدِ خلوص انکار  
فرما دیا یہ کہتے ہوئے کہ میرے رب کریم نے اپنے حبیب کریم ﷺ کی جانب سے اتنا کچھ عطا کر  
رکھا ہے کہ اب کسی اور جانب نظر ہی نہیں اٹھتی..... شاہان عجم اور سلاطین ہند کی پیش کشوں کو آپ  
نے پائے استحقار سے ٹھکرا دیا اور پھر جب سلطان عالم علیہ السلام کی قصیدہ نگاری کی جانب متوجہ ہوئے تو  
انوار کی برسات ہونے لگی۔ کس کس قصیدہ کا ذکر کیجئے ہر جگہ ہی عقیدت اور محبت و وارفتگی کا حسن



پھیلا ہوا ہے۔ چند قصائد کے مطلعے پیش نظر ہیں۔  
قصیدہ نوریہ

صبح طیبہ میں ہوئی بٹا ہے باڑا نور کا  
صدقہ لینے نور کا آیا ہے تارا نور کا

قصیدہ سلامیہ

مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام  
شمعِ بزمِ ہدایت پہ لاکھوں سلام

قصیدہ معراجیہ

وہ سرورِ کشورِ رسالت جو عرش پر جلوہ گر ہوئے تھے  
نئے نرا لے طرب کے سماں عرب کے مہمان کے لیے تھے

قصیدہ درود

کعبہ کے بدر الہجی تم پہ کروڑوں درود  
طیبہ کے شمس الضحیٰ تم پہ کروڑوں درود

ان طویل قصائد کے علاوہ آپ نے حضرت صدیق اکبرؓ حضرت فاروق اعظمؓ، حضرت علی المرتضیٰؓ، سیدہ خاتونِ جنت اور سیدہ عائشہ صدیقہؓ کی شان میں بھی مختصر قصائد کہے ہیں۔ ان قصائد کے علاوہ آپ نے ایک قصیدہ ”اصلاحات ہیئت“ بھی کہا ہے۔ یہ بھی نعتیہ قصیدہ ہے جس میں تمام تر علم ہیئت اور علم نجوم کی اصطلاحات ہیں۔ پورا قصیدہ ۱۵۵ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس قصیدہ کی بدولت جہاں آپ صنفِ قصیدہ پر غیر معمولی دسترس رکھتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہاں علم ہیئت اور علم نجوم آپ کے افکار کی کاسہ گدائی کرتے نظر آتے ہیں۔ سچ ہے کہ

یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

آپ کی علمی و فقہی اور شعری سر بلندیوں کے حوالے سے فکرِ رضا کے عظیم نقاد اختر الہامدی کی

رائے ملاحظہ ہو۔

”آپ کا مجموعہ نعتِ حدائق بخشش نہ صرف عشقِ حبیب کی شعری تصویر ہے بلکہ نعتِ حبیب کا وہ مشرق ہے جس سے آفتابِ عرب کی شعاعیں پھوٹ رہی ہیں جو آنکھوں کے راستے دل میں اتر کر کائناتِ حیات کو منور کر دیتی ہیں۔ سوز و درد اور جذب و اثر نے الفاظ کو گویا زبان دے دی ہے اور وہ کوئے حبیب کی حدیثِ عشق سنار ہے ہیں۔ یہ خصوصیت یہ انداز بیان، یہ سلیقہ



نعت آپ کے علاوہ اور کسی کے ہاں نظر نہیں آتا۔ آپ نے الفاظ میں عشق حبیب کا وہ طلسم پھونک دیا ہے کہ مفاہیم کی پرت پرت کھولتے چلے جائے مگر شاعر کے جذبے کی گہرائی ہاتھ نہیں آنے پاتی۔“  
(معارف رضا سالنامہ ۱۹۸۶ ص ۱۶۷)

جس سلیقہ نعت کا اختر الحامدی نے تذکرہ کیا ہے اسے اسلوب کی انفرادیت اور بیان کی یکتائی سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کے مدد سے شاعر اپنے حسنِ تخیل اور حقائق کے امتزاج سے زبان و بیان کا حسن بکھیر کر اس انداز میں بات کہہ جاتا ہے کہ پڑھنے والا حیرت میں گم ہو جائے۔ ایک حقیقت کو شاعری کا ملبوس عطا کر دینا یا ایک مسلمہ بات کو اسلوب کی ندرت کی بدولت ایسے بیان کرنا کہ کسی اور کو سوچھی ہی نہ ہو۔ طرزِ ادا کی یہی رنگینی اور طرفگی ہی رضا بریلوی کے کلام کو دوام بخش رہی ہے۔ شاہ احمد رضا نے اپنے علم و فضل زبان و بیان کی مہارت شعری حرکت اور ان سب پر مستزاد محبت رسول ﷺ کی حدت و شدت کو بروئے کار لا کر اپنی شاعری کا بانگپن بخشا ہے۔

عرش جس خوبیِ رفتار کا پامال ہوا

دو قدم چل کے دکھا سروِ خراماں ہم کو

جس تبسم نے گلستاں پہ گرائی بجلی

پھر دکھا دے وہ ادائے گلِ خنداں ہم کو

تنگ آئے ہیں دو عالم تیری بے تابی سے

چین لینے دے تپ سینہ سوزاں ہم کو

حضور ﷺ کی ختم المرسلینی امت اسلام کا مسلمہ ایمان ہے۔ رضا بریلوی کے ہاں یہ مضمون

ایک نئے انداز میں دیکھئے۔

نہ رکھی گل کے جوشِ حسن نے گلشن میں جا باقی

چٹکتا پھر کہاں غنچہ کوئی باغِ رسالت کا

درج ذیل شعر دیکھئے کہ آپ نے امتناعِ النظیر کے مشکل مسئلہ کو کس ادا سے آسان اور زود

فہم بنا دیا ہے۔

تراقد تو نادرِ دہر ہے کوئی مثال ہو تو مثال دے

نہیں گل کے پودوں میں ڈالیاں کہ چمن میں سرو چماں نہیں

فاضل بریلوی اپنی دلی کیفیت اور قلبی واردات کا اظہار طرزِ ادا کی کس رنگینی اور بانگپن سے

کرتے ہیں۔ ایک نظر دیکھئے۔



دل کو ان سے خدا جدا نہ کرے  
بے کسی لوٹ لے خدا نہ کرے  
دل کہاں لے چلا حرم سے مجھے  
ارے تیرا برا خدا نہ کرے

حسین تشبیہات اور استعارات کے ساتھ اسلوب بیان کا انوکھا پن دیکھئے۔ زمین بھی مشکل ہے اور یہ اشعار وصف گیسوئے رسول میں کہے گئے ہیں۔

کعبہ جاں کو پہنایا ہے غلافِ مشکیں  
اُڑ کے آئے ہیں جو ابرو پہ تمہارے گیسو  
سلسلہ پا کے شفاعت کا جھکے پڑتے ہیں  
سجدہ شکر کے کرتے ہیں اشارے گیسو  
مژدہ ہو۔ قبلہ سے گھگھور گھٹائیں آئیں  
ابروں پر وہ جھکے مجھوم کے پیارے گیسو

امام احمد رضا کی اسی قادر الکلامی اور زبان و بیان کی ندرت کے لحاظ سے معروف محقق ٹمس بریلوی کی اس رائے کو پیش نظر رکھیے۔

”جناب رضا قدس سرہ خاصانِ بارگاہِ مصطفوی ﷺ میں بہت ممتاز تھے۔ آپ کے یہاں منزلِ عشق کے تمام مدارج موجود ہیں۔ آپ نے اس راہ کو بڑی احتیاط سے طے فرمایا ہے۔ آپ نے فراق کا بیان بھی ملاحظہ فرمایا اور فراق کی ستم رانیوں کا ذکر بھی سنا۔ دیارِ محبوب کا اشتیاق بھی ہے اور درِ محبوب پر عرض بھی فرما رہے ہیں لیکن تقدیس و تکریم کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں چھوٹتا اور یہی وہ خصوصیت ہے جو جناب رضا کو تمام نعت گو شعراء میں اسی طرح ممتاز کرتی ہے جس طرح علمِ شریعت و طریقت میں آپ کا مقام دیگر علمائے کرام سے بہت ارفع و اعلیٰ تھا۔“

(علامہ ٹمس بریلوی حدائقِ بخشش کا ادبی جائزہ ص ۲۲۵)

گویا تمام محققین اور صاحبانِ اسرارِ تحقیق اس امر پر متفق ہیں کہ حضرت احمد رضا خاں کے مضامین میں غیر معمولی تنوع پایا جاتا ہے۔ انہوں نے نعت کے میدان کو چنا اور اس میں ہر قسم کے مضامین بیان کر کے ثابت کر دیا کہ نعت ہر قسم کے تخیلات کو شعری جامہ پہنانے کی قوت رکھتی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ صنفِ نعت کے تقدس اور پاکیزگی کو کسی لمحہ نگاہوں سے اوچھل نہ ہونے دیا جائے اور ممدوحِ نعت ﷺ کے مقاماتِ عالیہ کے انوار سے دل و جاں کو ہر آن بسا کر رکھا جائے۔



احمد رضا خاں کی شعری بلندیوں کا کیا کہنا۔ آپ نے تو پامال سے پامال مضامین کو بھی محبت رسول ﷺ کے حوالے سے تروتازہ اور حاصل ادب بنا دیا ہے۔

یہاں ہم احمد رضا خاں کے چند ایسے اشعار درج کر رہے ہیں جو ان کے فکری شکوہ کی علامت ہیں اور جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حسن بیان نے مضمون کو کیا سے کیا بنا دیا۔ آپ نے حضور ﷺ کی آمد کا تصور نگاہوں میں بسا رکھا ہے۔

الہی منتظر ہوں وہ خرامِ ناز فرمائیں  
بچھا رکھا ہے فرش آنکھوں نے کم خوابِ بصارت کا  
رضائے خستہ جوش بحرِ عصیاں سے نہ گھبرانا  
کبھی تو ہاتھ آجائے گا دامن اُن کی رحمت کا  
اور یہاں بھی رحمتِ مصطفیٰ ﷺ کا تصور دیکھئے۔

بیچ ہے آگ کا دریا حائل  
قصد اس پار ہے کیا ہوتا ہے  
کیوں رضا کڑھتے ہو ہنستے اٹھو  
جب وہ غفار ہے کیا ہوتا ہے  
عرش جس خوبیء رفتار کا پامال ہوا  
دو قدم چل کے دکھا سروِ خراماں ہم کو  
جس تبسم نے گلستان پہ ہے گرائی بجلی  
پھر دکھا دے وہ ادائے گلِ خنداں ہم کو

پھر تکوینِ عالم پر یہ اشعار دیکھئے

انہی کی بو مایہ سمن ہے انہی کا جلوہ چمن چمن ہے  
انہی سے گلشن مہک رہے ہیں انہی کی رنگت گلاب میں ہے  
وہ گل ہیں لب ہائے نازک ان کے ہزاروں جھڑتے ہیں پھول جن سے  
گلاب گلشن میں دیکھے بلبل یہ دیکھ گلشن گلاب میں ہے

خدا بھی کریم ہے اس نے اپنے محبوب ﷺ کو ہمہ تن کرم بنایا ہے۔ خدا تو خالق کائنات ہے۔ محمد رسول ﷺ محبوبِ شش جہات، رب دو عالم نے اپنے محبوب کو عظمتوں کی وہ بلندیاں عطا کیں کہ انسانی عقل ان کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ حضور ﷺ تمام تر نورانی اور بشری سرفرازیاں حاصل کر



کے بھی کمال عجز سے خود کو خدا کے سامنے شکر گزار بندہ تصور کرتے ہیں۔ نعت میں افراط و تفریط کی گنجائش نہیں بڑے بڑے صاحبانِ فکر فرطِ عشق میں جادۂ حق سے بھٹک گئے اور حمد و نعت میں قدرے شوخ بیانی کا مظاہرہ کر گئے مگر یہاں تھے اُمت اسلام کے سب سے بڑے فقیہ اور شریعت پر حد درجہ دسترس رکھنے والے احمد رضا خاں جو اپنے اشعار اور نثر میں زمانے بھر کو حمد و نعت کا امتیاز سکھا رہے ہیں آئیے ہم اس ایمان آفریں ماحول کا ایک جلوہ دیکھنے کے لیے ان کے تین چار اشعار پیش کرتے ہیں۔

سرور کہوں کہ مالک و مولا کہوں تجھے  
باغِ خلیل کا گلِ زیبا کہوں تجھے  
اللہ رے تیرے جسمِ منور کی تابشیں  
اے جانِ جاں میں جانِ تجلا کہوں تجھے  
تیرے تو وصفِ عیبِ تنہا ہی سے ہیں بری  
جیراں ہوں میرے شاہا میں کیا کیا کہوں تجھے  
گلزارِ قدس کا گلِ رنگیں ادا کہوں  
درمانِ دردِ بلبَل شیدا کہوں تجھے

اس طویل نعت کا یہ مقطع ہمیں شاہ احمد رضا خاں کی زبان سے آدابِ عبدیت سکھا جاتا ہے۔

لیکن رضا نے ختمِ سخن اس پہ کر دیا  
خالق کا بندہ خلق کا مولا کہوں تجھے

تاریخِ نعت گوئی کا مطالعہ جہاں ہمیں امام احمد خاں فاضل بریلوی کے شعری کمالات سے آگاہی بخشتا ہے۔ وہاں یہ احساس بھی عطا کرتا ہے کہ احمد رضا خاں کو یہ شعری مقبولیت اور تاریخ میں ہر دلعزیزی کس طور عطا ہوئی اگر ہم اس حقیقت کا سراغ لگانے کے لیے آگے بڑھیں تو صاف نظر آتا ہے کہ فاضل بریلوی کی جملہ شعری خوبیوں کا حقیقی ماخذ ان کی قرآنِ فہمی تھی۔ آپ قرآنِ حکیم کے مترجم ہی نہیں مفسر بھی تھے، زندگی بھر قرآنِ حکیم کی تجلیات سے ظلمت زدہ دلوں کو منور کرتے رہے۔ قرآنِ حکیم کے مطالعہ نے ہی کمال درجہ کی احتیاط پسندی سکھائی یہ آپ کا کمال ہے کہ حد درجہ احتیاط پسندی کے باوجود آپ کا کلام مقبولیت عام کی آخری منازل کو چھو رہا ہے اور تحدیثِ نعمت کے طور پر اس حقیقت کا اظہار فرما رہے ہیں۔



رہا نہ شوق کبھی مجھ کو سیر دیواں سے  
 ہمیشہ صحبتِ اربابِ شعر سے ہوں نفور  
 نہ اپنے کاموں سے تضييع وقت کی فرصت  
 نہ اپنی وضع کے قابل کہ اس میں ہوں مشہور  
 رہی وبال سے اس کے مجھے سبک دوشی  
 کہ ویسے ہی ہے سر پہ گراں بار جرم و قصور  
 مگر جو ہاتفِ غیبی مجھے بتاتا ہے  
 زباں تک اسے لاتا ہوں میں بدمرغ حضور

یہ ہاتفِ غیبی ہی ہے جو ان سے ایسی نعتیہ شاعری لکھوا رہا ہے جس کا ہر شعر دوام کا حامل ہے  
 کس حسنِ بیان سے اپنی نعت گوئی کا تذکرہ کر رہے ہیں۔

گونج گونج اٹھے ہیں نعماتِ رضا سے بوستاں  
 کیوں نہ ہو کس پھول کی مدحت میں وامنقار ہے

قرآن حکیم سے آگے بڑھے تو شریعتِ مصطفوی ﷺ نے دامنِ نور کشادہ کر دیا۔ قرآن  
 حکیم اور قرآن ناطق جدا جدا تو نہیں ہیں۔ ایک قرآن میں پاروں کی صورت میں انوارِ کرم لٹا رہا  
 ہے جبکہ قرآن ناطق حضور ﷺ قرآن مجید کی شرح روشن ہیں۔ فاضل بریلوی نے قرآن حکیم اور  
 صاحبِ قرآن ﷺ کی تعلیمات قدسیہ سے بھرپور روشنی اور راہنمائی لی اور تمام زندگی اس پر نازاں  
 رہے کہ انہیں نعت نگاری کی بدولت ہی قرآن اور تعلیمات حضور ﷺ کو عوام الناس تک پہنچانے کی  
 سعادت عطا ہوئی ہے لیکن یہاں بھی عاجزی اور فروتنی پیش نظر ہے اور زمانے بھر سے بے نیاز ہو کر  
 مدح رسول ہی میں فنا ہو جانا چاہتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

کس منہ سے کہوں رشکِ عنادل ہوں میں  
 شاعر ہوں فصیح بے مماثل ہوں میں  
 حقا کہ کوئی صنعت نہیں آتی مجھ کو  
 ہاں یہ ہے کہ نقص میں کامل ہوں میں

آج تمام نعت گو حضرت فاضل بریلوی کو ”امامِ سخن گویاں“ قرار دیتے ہیں۔ آپ کی نعتیہ  
 شاعری کا سورج جب ایک بار چمکا تو پھر اس کی روشنی کبھی بھی ماند نہ پڑ سکی بلکہ ہر آنے والے دور کا



شاعر جب مدحتِ رسول ﷺ کی خاطر ذہن و فکر کو آمادہ کرتا ہے تو احمد رضا خاں فاضل بریلوی کے کلام بلاغت نظام سے راہنمائی ضرور حاصل کرتا ہے۔ جب ایشیا کی مساجد سے لے کر یورپ کے اسلامی مراکز تک ہر جگہ ”مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام“ کی صدائیں ابھرتی ہیں تو جہاں اصحاب نظر کی پلکیں عشق و عقیدت کے آنسوؤں سے نم ہو جاتی ہیں وہاں تصورات کے نہاں خانوں میں نعت گو احمد رضا خاں کا جو روشن سراپا ابھرتا ہے وہ اس قدر سر بلند اور سرفراز ہے کہ اُن کے معاصرین اور عصرِ حاضر کے نعت گو شعراء کا وجود اپنی تمام تر بلند قامتی کے باوجود اس کے سامنے سرعقیدت خم کرتا نظر آتا ہے۔ آپ نے زندگی بھر عشقِ رسول ﷺ ہی کو حاصل ایمان سمجھے رکھا اور خدا گواہ ہے کہ اس سے بڑی حقیقت کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ ہم اسی موضوع سے متعلق آپ کے اس جادواں جادواں شعر پر اس تحریر کا اختتام کر رہے ہیں۔

انہیں جانا انہیں مانا نہ رکھا غیر سے کام  
لہ الحمد میں دنیا سے مسلمان گیا

☆☆☆



## مہر عالم تابِ نعت

### سید پیر مہر علی شاہ گولڑوی

نعت بلاشبہ وہ نعمت خداوندی ہے جو قدرت کی طرف سے بندگانِ خاص کو عطا ہوتی ہے۔ نعت صاحبِ ایمان کا سرمایہ اعزاز اور ایک مردِ مومن کا افتخار ہے۔ جب الفاظِ عقیدت کا نم حاصل کرتے ہیں تو نعت ہوتی ہے۔ جب تراکیب اور استعارات کو حسنِ آرزو کی چمک عطا ہوتی ہے تو نعت ہوتی ہے۔ جب لفظوں کو مرضعِ کاری و دیعت ہوتی ہے تو نعت ہوتی ہے۔ نعت پلکوں کی جھلملاہٹ، اشکوں کی جلوہ گری اور حضور نبی کریم ﷺ سے روحانی وابستگی کا نام ہے، جس طرح محبت کے لیے کچھ خاص دل مخصوص ہوتے ہیں کیوں کہ یہ نغمہ ہر ساز پر گایا نہیں جاسکتا۔ اسی طرح نعت مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء کا نزول بھی ہر انسان کے قلب و فکر پر نہیں بلکہ نعت مصطفیٰ ﷺ دل کے کوہِ فاران سے پھوٹتی ہے تو مشامِ جان معنبر ہو جاتے ہیں۔

کوچہٴ نعت میں ایک انتہائی سر بلند لہجہ سر زمینِ گولڑہ کے تاجدار قبلہٴ عالم سیدنا پیر مہر علی شاہ گولڑوی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ سرکارِ گولڑوی نامور عالمِ دین، جلیل القدر محدث، عظیم دانائے راز اور معرفت و تصوف کے انوارِ بکھیرنے والی شخصیت تھے۔ ایک زمانہ برسوں آپ کے گلستانِ علوم معرفت سے خوشہ چینی کرتا رہا۔ آپ نے باطلِ نظریات کے خلاف جہاد کیا۔ آپ وہ رجلِ رشید تھے جن کے لیے بزمِ ہستی مدتوں محدود عمارت تھی۔ آپ وہ بطلِ جلیل تھے جن سے مسندِ ارشاد کو اس کا حقیقی حسن عطا ہوتا ہے۔ آپ وہ رہبرِ یگانہ تھے کہ جن کی جنبش لب، تقدیرِ خداوندی کا پرتو ہوتی ہے، آپ وہ نابغہٴ روزگار تھے کہ جن کا ہر قول، قولِ فیصل ہوتا ہے، آپ اسلام کی آبرو اور کاروانِ زندگی کا کمالِ جستجو تھے۔ صورت و سیرت میں شوکتِ اسلاف کا عکس جمیل، غرضیکہ آپ اپنے علمی و فقہی کارناموں، نظریاتی کاوشوں اور مخلوقِ خدا کو معرفتِ الہی سے آشنا کرنے کے حوالے سے اپنے ہی اس شعر کا مصداق معلوم ہوتے ہیں۔

از لطفِ خلاقِ زماں داریم ممتاز از جہاں  
وضع دگر طرزے دگر، ذوقے دگر شوقے دگر



حضرت قبلہ عالم گولڑوی کی تمام صفات کا تذکرہ بجا مگر یہ حقیقت ہے کہ آپ کی تمام فکری رفعتوں اور روحانی بلندیوں کا مرکز و محور ذات محمد مصطفیٰ ﷺ ہے۔ سرکار ابد قرآن ﷺ سے آپ کی محبت ان رفعتوں کو چھوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے جہاں تک عام آدمی کے تصور کی پرواز بھی ممکن نہیں۔ یہی محبت جب شاعری کے پیرائے میں جلوہ گر ہوتی ہے تو پھر نعت رسول ﷺ کے زمزے پھوٹتے ہیں۔ مدحت مصطفیٰ ﷺ کے ترانے اُبھرتے ہیں۔ توصیف حضور ﷺ کے گلاب کھلتے ہیں اور پھر آپ کی نعت نگاری کے ذریعے عشق رسول ﷺ کے ایسے ایسے روحانی اسرار منکشف ہوتے ہیں کہ قاری بحر حیرت میں گم ہو جاتا ہے۔

محبت رسول ﷺ کی یہی شدت تھی جو انہیں باطل قوتوں کا مقابلہ کرتے کرتے سلطنت انگلشیہ کے خود کاشتہ پودے مرزا غلام احمد قادیانی کی خانہ ساز نبوت کے مقابلے پر لے آئی۔ بزم آرائی سے رزم آرائی کی جانب سفر تھا۔ تحریری مقابلے تو مدت سے جاری تھے۔ مناظرے بھی ہو رہے تھے کہ یکا یک مباہلہ تک نوبت آ پہنچی تو یہ سید زادہ اپنے جد اعلیٰ حضور محمد ﷺ کی سنت تازہ کرتے ہوئے مباہلہ کے میدان میں ڈٹ گیا۔ برصغیر کے تمام مسالک کے علمائے اور جملہ مشائخ کرام نے آپ کی علمی فضیلت اور روحانی سرفراہی کو دیکھتے ہوئے آپ کو اسلام کا نمائندہ قرار دے دیا۔ آپ اس شان مرتضویٰ کے ساتھ میدانِ عمل اترے کہ مرزا غلام احمد قادیانی اس مباہلہ میں آ جاتا تو قہر خداوندی سے ہلاک ہو جاتا۔

اسی طرح جب ایک مرتبہ غلام احمد قادیانی نے آپ کو تحریری مقابلہ کی دعوت دی تو آپ نے اس مقابلہ کو قبول کرتے ہوئے یہ تاریخی کلمات فرمائے:

”علمائے کرام کا اصل مقصود تحقیق حق اور اعلائے کلمۃ اللہ ہوتا ہے فخر و تعالیٰ مقصد نہیں ہوتا۔ ورنہ جناب نبی کریم ﷺ کی امت میں اس وقت بھی ایسے خادمِ دین موجود ہیں کہ اگر قلم پر توجہ ڈالیں تو وہ خود بخود کاغذ پر تفسیر قرآن لکھ جائے۔“

ظاہر ہے اس سے آپ کا اشارہ اپنی جانب تھا۔ چنانچہ بعد میں اس چیلنج کے متعلق فرمایا کرتے تھے کہ ”میں نے یہ دعویٰ از خود نہیں کیا تھا بلکہ عالم مکاشفہ میں جناب نبی کریم ﷺ کے جمالِ باکمال سے میرا دل اس قدر قوی اور پختہ ہو گیا تھا کہ مجھے یقین کامل تھا کہ اگر اس سے بھی بڑا دعویٰ کرتا تو اللہ تعالیٰ مجھے ضرور سچا ثابت کر دیتا۔“

ظاہر ہے کہ جب عشقِ مصطفویٰ پیر سید مہر علی شاہ کے ہر بن مو سے اُبھر رہا تھا تو پھر آپ کا جملہ جو شانِ رسول ﷺ میں کہا گیا نعتِ مرصع کی صورت نظر کیوں نہ آتا۔ آپ کی یہ مشہور زمانہ



نعت ایک عرصہ سے بے شمار اہل ایمان کے لیے وظیفہ عشق حضور ﷺ بنی ہوئی ہے۔

”اج سک متراں دی ودھیری اے“

یہ نعت اس قدر خوب صورت اور معانی و مفاہیم کے لحاظ سے اس قدر جامع ہے کہ جب بھی نعت خواں خوش الحانی سے اس نعت کو محفل میں پڑھتا ہے تو سننے والے بے خود ہو جاتے ہیں اور پلکوں پر آنسوؤں کے موتی جھلملانے لگتے ہیں۔ اس نعت کی تاریخ ساز مقبولیت کے پس پردہ ایک داستانِ ایمان آفریں پوشیدہ ہے۔ ہم اس کا کچھ حصہ اصحابِ نظر کی نذر کرنا چاہیں گے۔ آپ فرماتے ہیں۔

مدینہ عالیہ کے سفر میں بمقام وادیِ حمراڈاکوؤں کے حملہ کی پریشانی کی وجہ سے عشا کی سنتیں مجھ سے رہ گئیں۔ مخلصی فی اللہ مولوی محمد غازی مدرسہ صولتیہ میں مشغلہ تعلیم و تدریس چھوڑ کر حسن ظن کی بنا پر بغرض خدمت اس مقدس سفر میں میرے شریک ہوئے تھے۔ ان رفقا کی معیت میں قافلہ کے ایک طرف سو گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ سرورِ عالم ﷺ سیاہ عربی جبہ زیب تن فرمائے تشریف لا کر اپنے جمال باکمال سے مجھے نئی زندگی عطا فرماتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوا کہ میں ایک مسجد میں بحالتِ مراقبہ دوزانو بیٹھا ہوں۔ آنحضور ﷺ نے قریب تشریف لا کر ارشاد فرمایا کہ ”آلِ رسول کو سنت ترک نہیں کرنا چاہیے۔“ میں نے اس حالت میں آنجناب ﷺ کی ہر دو پنڈلیوں کو جو ریشم سے بھی زیادہ لطیف تھیں اپنے دونوں ہاتھوں سے مضبوط پکڑ کر نالہ و فغاں کرتے ہوئے۔ الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ کہنا شروع کیا اور عالمِ مدہوشی میں روتے ہوئے عرض کیا ”حضور کون ہیں۔“ جواب میں وہی ارشاد ہوا کہ آلِ رسول ﷺ کو سنت ترک کرنا نہیں چاہئے۔ تین بار یہی سوال و جواب ہوتے رہے۔ تیسری بار میرے دل میں ڈالا گیا جب آپ ندائے یا رسول اللہ سے منع نہیں فرما رہے تو ظاہر ہے کہ خود آنحضرت ﷺ ہیں اگر کوئی اور بزرگ ہوتے تو اس کلمہ سے منع فرماتے۔ اس حسن و جمال باکمال کے متعلق کیا کہوں۔ اس ذوق و مستی و فیضانِ کرم کے بیان سے زبان عاجز ہے اور تحریر لنگ البتہ بادہ خوارانِ عشق و محبت کے حلق میں ان ابیات سے ایک جرعہ اور اس نافہ مشک سے ایک فحہ ڈالنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(اقتباس از ”مہر منیر“ تصنیف فیض احمد فیض، ص ۲۳۱، ۱۹۶۹ء)

حضرت گولڑوی کی یہ تحریر اور ابیات اس وقت کی سعادتِ عظمیٰ کی کیفیات کی بہت حد تک عکاسی کرتے ہیں۔ تحریر بالا سے واضح ہوتا ہے کہ آپ وصالِ نبوی کے مراتبِ عالیہ سے مشرف ہو



چکے تھے۔ آپ اس وقت جس کیفیت نور سے دوچار ہوئے اور حسنِ عقیدت کے انعام کے طور پر جلوہ ہائے محبوب سے جس طور نوازے گئے ان کی حلاوت آفریں صدائے بازگشت ”اج سک متراں دی ودھیری اے“ کی صورت ہی میں سنائی دے سکتی تھی۔ حضرت قبلہ کی طبیعت میں تواضع اور اخفائے راز کا غلبہ تھا۔ اس قسم کے واقعات کو شاذ و نادر ہی ظاہر فرماتے تھے اور وہ بھی کسی خاص مصلحت کے تحت، ورنہ ان انعامات بے کراں کا جو اس دربار گوہر بار سے مرحمت ہوئے یا ان نوازشات بے پایاں کا جو خانہ خلاق جہاں میں عطا ہوئیں ایک شمع تک بھی کہیں ظاہر نہیں ہونے دیا۔ وادی حرم میں پیش آنے والی کیفیات سردی میں انہیں جو لطف و سرور عطا ہوا اس کی جھلک اس شہرہ آفاق نعت کے علاوہ کئی دوسری نعتوں میں بھی نظر آتی ہے۔ حق تو یہ ہے کہ یہ نوازشیں بھلائی بھی تو نہیں جاسکتیں۔

سوارۂ بگذشتی و ما ہنوز از شوق

نہادہ روئے بخاکِ سم سمند تو ایم

اس نعت میں اتنا لوچ اور طرزِ بیان میں اتنی تاثر انگیزی ہے کہ دل و جان بہ یک وقت اس کی کیفیات میں ڈوب ڈوب جاتے ہیں۔ پوٹھوہاری زبان کی دل کشی و رعنائی اوپر سے عشق و عقیدت کی بہتات کی بدولت یہ نعت رگ و پے میں سمانے لگتی ہیں اور قاری اس کیف آگیں تاثر میں اس طور غرق ہو جاتا ہے کہ اس کی آنکھیں آنسوؤں کی مالائیں پرونے لگتی ہے۔ اتنی حلاوت، اتنی موسیقیت، اللہ اللہ، یوں لگتا ہے جیسے انسان نہیں بلکہ خود قدسی شانِ محبوب میں نغمہ پیرا ہوں۔ اس کی تاثر انگیزی کے حوالے سے مولانا فیض احمد فیض جو کہ سرکارِ گولڑوی کے تذکرہ نگار ہیں اپنی تصنیف لطیف مہر منیر میں ایک واقعہ یوں درج کرتے ہیں۔

متذکرہ بالا نعت کی عالم گیر اثر پذیری اب محتاجِ بیان نہیں رہی۔ پنجابی کلام سے لطف اندوز ہونے والی محفلوں میں ہمیشہ پڑھی جاتی ہے اور لوگوں کی فرمائش کے پیش نظر ریڈیو پر بار بار آتی ہے جب کبھی یہ نعت پڑھی جا رہی ہو تو شدتِ شوق و فراق سے ہر آنکھ اشک بار ہوتی ہے اور کیفیات کا نور و سرور سامعین کے قلوب میں موجزن ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ جن دنوں علامہ اقبال میکلوڈ روڈ پر رہتے تھے۔ شام کے دھند لکوں میں کوئی شخص اس نعت کا پہلا شعر ترنم سے کہتا جا رہا تھا۔ علامہ نے اپنے ملازم کو دوڑ کر اس گزرنے والے کو بلوا کر ساری نعت سنی اور جب مقطع میں:

سبحان اللہ ما اجملک، ما احسک ما اکملک

کہتے مہر علی کہتے تیری ثنا گستاخ اکھیاں کہتے جاڑیاں



میں حضرت قبلہ عالم قدس سرہ کا نام سنا تو کہا کہ اب معلوم ہوا کہ اس کلام میں اتنا بے پناہ درد و اثر کیوں ہے۔

شاعر مشرق علامہ محمد اقبال کا سرکار گولڑوی کو یہ خراج عقیدت اس سبب سے تھا کہ وہ ان کی شخصیت کے روحانی اور دینی کمالات سے بخوبی واقف تھے۔ اس ضمن میں علامہ محمد اقبال کا حضرت گولڑوی کے نام مکتوب درج ہے۔ اس مکتوب کو کئی تذکرہ نگاروں اور محققین نے اپنی کتابوں میں درج کیا ہے۔ اس مکتوب میں علامہ اقبال نے پیر صاحب سے اپنی ارادت مندی کا ذکر کرتے ہوئے وحدت الوجود کے حوالے سے ان سے راہنمائی کی استدعا کی ہے۔ ہم اس مکتوب کی ابتدائی سطور قارئین کی نذر کر دیتے ہیں۔ مقصود فقط علامہ اقبال کی پیر گولڑوی سے ارادت مندی کا اظہار ہے۔

لاہور ۱۸ اگست ۱۹۳۳ء

مخدوم و مکرم حضرت قبلہ السلام علیکم، اگرچہ زیارت اور استفادے کا شوق ایک مدت سے تھا تاہم اس سے پہلے شرفِ نیاز حاصل نہیں ہوا۔ اس محرومی کی تلافی اس عریضے سے کرتا ہوں گو مجھے اندیشہ ہے کہ اس خط کا جواب لکھنے یا لکھوانے میں جناب کو زحمت ہوگی۔ بہر حال آپ کی وسعتِ اخلاق پر بھروسہ کرتے ہوئے یہ چند سطور لکھنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اس وقت ہندوستان بھر میں کوئی اور دروازہ نہیں جو پیش نظر مقصد کے لیے کھٹکھٹایا جائے..... میں نے سنا ہے کہ جناب نے درس و تدریس کا سلسلہ ترک فرما دیا ہے۔ اس لیے مجھے یہ عریضہ لکھتے ہوئے تامل تھا، لیکن چوں کہ مقصود خدمتِ اسلام ہے، مجھے یقین ہے کہ اس تصدیعہ کے لیے جناب معاف فرمائیں گے اور جواب با صواب سے ممنون فرمائیں گے۔ التماس دعا۔ مخلص محمد اقبال

(نام و نسب از نصیر الدین نصیر گولڑوی، ۱۹۸۹ء درگاہ گولڑہ شریف)

بات ہو رہی تھی سید مہر علی شاہ گولڑوی کی نعت گوئی کی حکیم الامت علامہ اقبال بہت بڑے عاشقِ رسول ﷺ اور دانائے راز تھے۔ وہ بھلا ایسی عظیم شخصیت سے کیوں کرا جہنی رہ سکتے تھے جس کی زبان اور قلم نے برصغیر کی فضاؤں میں محبتِ رسول ﷺ کی لازوال مہک بکھیر دی ہو۔ اقبال لاہور میں رہتے تھے اور پیر گولڑوی کی تبلیغی سرگرمیوں کا بہت بڑا مرکز لاہور ہی تھا۔ یہ لاہور ہی تھا جہاں سرکار گولڑوی نے شاتمانِ رسول کے خلاف جہاد کیا۔ گستاخانِ بارگاہِ نبوت کا پوری قوتِ ایمان کے ساتھ مقابلہ کیا۔ باطل نظریات کے خلاف سدِ سکندری بن گئے۔ غیر مسلم قوتوں کا مقابلہ کیا اور سب سے بڑھ کر حکومتِ انگلشیہ کے خود کاشتہ پودے قادیانیت کے خلاف جس غیرت



ایمانی کا مظاہرہ کیا اس کی صدائے بازگشت صدیوں تک وقت کے ایوانوں میں محسوس ہوتی رہے گی۔ علامہ اقبال کا آپ کے مقام و مرتبہ سے آگاہ ہونا کوئی حیرت انگیز امر نہیں بلکہ حیرت تو تب ہوتی اگر علامہ آپ کی علمی فکری اور فقہی سر بلندیوں سے بے خبر ہوتے۔ علامہ اقبال کا یہ فرمانا کہ:

”اب معلوم ہوا کہ اس کلام میں اتنا درد کیوں ہے۔“ اسی باخبری کی روشن دلیل ہے۔

”اج سک متراں دی ودھیری“ ایسی نعت تھی جو آپ کے قلم گوہر بار سے ٹپکی تو اہل شوق کا وظیفہ بن گئی۔ زبان موثر، لہجہ حلاوت آفریں اور انداز دل نشیں تھا کہ دلوں میں اُترتی چلی گئی۔ اس نعت کو اس قدر سوز گداز اس لیے حاصل ہوا کہ اس کے پس منظر میں زیارتِ رسول کے جلوے مچل رہے ہیں۔ خوش بخت ہیں وہ آنکھیں جنہوں نے رخ محبوب کو دیکھا اور سعید بخت ہے وہ قلم جسے حسن محبوب کو شاعری کی زینت بنانے کی سعادت عطا ہوئی۔ اگر پیر گوڑوی کی اسی ایک نعت پر بات کی جائے تو داستانِ شوق بے اختیار پھیلتی چلی جائے گی۔ ایک صاحب دل نے خوب لکھا تھا کہ اگر پیر گوڑوی فقط یہی لکھ جاتے اور مزید کچھ نہ لکھتے تو یہی ایک نعت انہیں شہرتِ دوام عطا کرنے کا باعث بن سکتی تھی۔

یہ نعت کیا ہے؟ صحیفہ شوق ہے، جمالِ ذوق ہے۔ کمالِ آرزو ہے، حسنِ گداز ہے، فکر کی بلند پروازی ہے۔ جذبوں کی سرفرازی ہے۔ عشقِ رسول کی آتش شوق میں پگھل جانے کا نام ہے۔ حاصل سوز و گداز کے نام پر اپنے وجود کو بقائے دوام سے ہم کنار کرنے کا پیغام ہے۔ الفاظ کی پرشوق لے ہے۔ خم کدہ وارنگی کی زندگی بخش لے ہے۔ بلاغت کی جلوہ افروزی ہے۔ دل کا ترانہ ہے، حسن بیان کا فسانہ ہے۔ آنکھوں کا نم ہے۔ جب رسول ﷺ سے مہکتے ہوئے پھولوں پر رحمتِ مصطفویٰ کی برستی ہوئی شبنم ہے۔ خاموش لبوں کا نذرانہ ہے۔ مچلتے اشکوں کا پیمانہ ہے۔ جیسے کوئی ساربان وقت کے صحرا میں گم گنبدِ خضریٰ کا تصور کر کے اس صدائے شوق کے ساتھ اپنا راستہ تلاش کر رہا ہے۔

اج سک متراں دی ودھیری اے

کیوں دلڑی اداس گھنیری اے؟

لوں لوں وچ شوق چنگیری اے

اج نیناں لایاں کیوں جھڑیاں

یہ نعت مسافر کی کوک ہے۔ شمعِ عشق حضور میں جل جانے والے پروانے کی ہوک ہے۔

اس نعت کے بے شمار فکری اور ادبی محاسن اور صوتی کمالات اپنی جگہ، یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ نعت



بجائے خود سراپائے رسول ﷺ کا حسن لیے ہوئے ہے۔ ہر بند میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے جسم معطر کے کسی نہ کسی عضو نورانی کا تذکرہ ہے اور ایسا کیوں نہ ہو۔ جن آنکھوں میں دادی حمرہ میں عطا ہونے والی حضور ﷺ کی لمحہ افشائیاں بس رہی ہیں وہ تو ایسے ہی اشعار کا حسن لٹائیں گی۔  
مثال کے طور پر ملاحظہ ہو۔

مکھ چند بدر شعشانی اے  
متھے چمکے لاث نورانی اے  
کالی زلف تے اکھ مستانی اے  
مخمور اکھیں ہن مدھ بھریاں



دو ابرو قوس مثال دین  
جیں توں نوکِ مژہ دے تیر چھٹن  
لباں سرخ آکھاں کہ لعلِ یمن  
چٹے دند موتیاں دیاں ہن لڑیاں



اس صورت نوں میں جان آکھاں  
جان آکھاں کہ جانِ جہاں آکھاں  
سچ آکھاں تے رب دی شان آکھاں  
جس شان توں شاناں سب بنیاں  
امام احمد رضا فاضل بریلوی نے بھی کچھ ایسی ہی کیفیت کو قلم بند کیا ہے۔

اللہ کی سرتا بہ قدم شان ہیں یہ  
ان سا نہیں انسان وہ انسان ہیں یہ  
قرآن تو ایمان بتاتا ہے انہیں  
ایمان یہ کہتا ہے مری جان ہیں یہ

پیر گولڑوی کی اس نعت میں تشبیہات و تراکیب کی کثرت ہے مگر کوئی ترکیب بھی ذہن پر  
بوجھ نہیں بنتی بلکہ دل و دماغ کو روحانی فرحت عطا کرتی ہے۔ حضور اکرم ﷺ کے سراپائے اقدس



کے حوالے سے ان کے اشعار آیات قرآنی اور احادیث مقدسہ کی ترجمان ہیں۔ جوں جوں نعت آگے بڑھتی ہے آپ پر ذوق و شوق کا غلبہ ہونے لگتا ہے۔ اور آپ کا سر عقیدت بارگاہِ محمدیت میں بصد نیاز خم ہونے لگتا ہے کیوں کہ اسی بارگاہ سے انہیں انوارِ احدیت عطا ہوتے ہیں، فرماتے ہیں:

ایہ صورت ہے بے صورت تھیں  
بے صورت ظاہر صورت تھیں  
بے رنگ دے اس مورت تھیں  
دج وحدت پھٹیاں جد گھڑیاں



دے صورت راہ بے صورت دا  
توبہ راہ کی عین حقیقت دا  
پر کم نہیں بے سو جھت دا  
کوئی وریاں موتی لے تڑیاں

توصیفِ مصطفیٰ ﷺ میں لفظوں کے گلاب بکھیرتے بکھیرتے ان پر رقت طاری ہونے لگتی ہے۔ دیدارِ حضور کی تمنا پھر سے جاگنے لگتی ہے۔ جلوۂ رسول ﷺ سے دل و جان کو ضو بار کرنے کی آرزو پھر سے سراٹھانے لگتی ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے انوار کے بحر بے کنار میں غوطہ زن ہونے کا احساس پروان چڑھنے لگتا ہے اور پکار اٹھتے ہیں:

لاہو مکھ توں مخط بردِ یمن  
من۔ بھانوری جھلک دکھاؤ سخن  
ادھا مٹھیاں گالیں الاؤ مٹھن  
جو حمرا وادی سن کریاں



حجرے توں مسجد آؤ ڈھولن  
نوری جہات دے کارن سارے سکن  
دو جگ اکھیاں راہ دا فرش کرن  
سب انس و ملک حوراں پریاں





انہاں سکدیاں تے کرلاندیاں تے  
لکھ واری صدقے جاندیاں تے  
انہاں بردیاں مفت وکاندیاں تے  
شالا آدن وت بھی اوہ گھڑیاں



يُعْطِيكَ رَبُّكَ داسِ تاسِ  
فترضیٰ تھیں پوری آسِ اسِ  
لجِ پالِ کرلیسی پاسِ اسِ  
واشفعِ تشفعِ صحیحِ پڑھیاں

اور پھر حضرت گولڑوی کی نعت کا وہ مقطع آتا ہے جو سرکارِ دو عالم کی عظمتوں کا امین اور محبتِ صادق کی تڑپ کا راز دار ہے۔ آپ کو ایک طرف سلطانِ دو عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بے پناہ عظمتوں اور بلندیوں کا احساس ہے اور دوسری طرف اپنی کم مائیگی پر تڑپ تڑپ اُٹھتے ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ اس نعت کے مقطع تک پہنچتے پہنچتے قاری کو کئی مرتبہ کیف آفریں وارداتِ روحانی سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔ اس نعت کا آخری شعر فقط شعری رعنائیاں ہی نہیں بلکہ قلوبِ غم زدہ کی تمام تر آرزوؤں کی کسک اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ شاعر محبوبِ حقیقی کی شانِ محبوبیت اور اپنی بے چارگی کا تقابل کرتا ہے کہ کہاں وہ ممدوحِ دو عالم محبوبِ عرب و عجم، فخرِ آدم و نبی آدم ﷺ اور کہاں مجھ ساختہ حراماں مگر اس کے ساتھ ہی اس کے اندر اُمید کے چراغ بھی جھلملا رہے ہیں کہ میں جس سے مخاطب ہوں وہ سراپا رحمت و عطا ہے کہ حضرت گولڑوی اس شعر کی بدولت بے شمار الم رسیدگانِ ہستی کو سکون و قرار کی دولت عطا کر جاتے ہیں۔

سبحان اللہ ما اَجْمَلُكَ  
ما اَحْسَنَكَ ما اَكْمَلُكَ  
کھتے مہرِ علی کھتے تیری ثنا  
گستاخ اکھیں کھتے جا اڑیاں

حضرت گولڑوی کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو نعت کو نمودِ فن کا ذریعہ نہیں بناتے۔ آپ تو



خلوت گزینی اور حجرہ نشینی کو ترجیح دیتے تھے۔ مگر جس طرح خوش بو بھی بھی خلوت کدوں میں محبوس نہیں ہو سکتی اور اس نے زمانے بھر میں پھیلنا ہوتا ہے اسی طرح آپ کے فکر و نظر پر فیضان حضور ﷺ کی برسات اس طرح برس رہی تھی کہ آپ فنا فی الرسول ﷺ ہو گئے تھے۔ آپ کا ظاہر و باطن عشق حضور سے آباد تھا۔ اس لیے آپ کی خلوت گزینی بالآخر اس طرح روحانی بزم آرائی میں تبدیل ہوئی کہ آپ ہر شاتم رسول کے لیے شمشیر برہنہ اور ہر گستاخ و بے ادب کے لیے برقی اجل بن گئے۔ آپ کو رب کریم نے زبان و بیان کا حسن عطا کیا تھا۔ کئی زبانوں پر عبور تھا مگر زندگی بھر فخر و تعالیٰ سے دور رہے۔ عجز و انکسار کو اپنی فکر کا محور بنائے رکھا۔ یہی عاجزی انہیں بارگاہ رسول ﷺ میں قبولیت کا شرف عطا کر گئی۔ ہم پہلے ”سفر حمرا“ کا ذکر کر چکے ہیں کہ اس مبارک سفر میں آپ کو کس طرح زیارت رسول ﷺ نصیب ہوئی اور آپ کس شان سے نوازے گئے۔ ایک اور مقام پر اپنی خوش بختی کا اظہار کرتے ہیں:

مدینے میں بلا بھیجو قریب وادی حمرا

تڑپ کر ڈال لوں میں ہاتھ پھر سیمین ساقن میں

اس شعر میں ”سیمین ساقن“ کو ہاتھوں سے چھونے کی سعادت کی طرف اشارہ ہے۔ آگے آپ کا لہجہ عجز و انکسار میں ڈھل گیا ہے اور بارگاہ رسول ﷺ میں فریاد کناں ہونے لگتے ہیں:

حریف ساغر و مے ہوں غریق بحر عصیاں ہوں

سہارا ہے فترضیٰ کا مجھے محشر مکانن میں

مجھے کیا غم ہے محشر کا، مرا حامی ہے جب وہ شاہ

کہا لولاک دطہ و مزمل جس کی شانن میں

دلا مت رو غلام ہو کر تو محی الدین جیلٰی کا

مریدی لاتخف بس ہے سہارا ہر دو کونن میں

سرکار گولڑویٰ ایسی شخصیت تھی کہ جس کا وجود پورے زمانے کا اعزاز ہوتا ہے۔ آپ علوم دینیہ پر کمال درجے کی دسترس رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے نعتیہ اشعار میں سرکار دو عالم ﷺ کی عظمت و فضیلت کے اعلیٰ سے اعلیٰ نکات ملتے ہیں۔ جملہ عشاق سرور کونین کا عقیدہ ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نور خدائے کریم نے ہر چیز سے قبل تخلیق کیا۔ آپ نے فرمایا ”اول ما خلق اللہ نوری“ کہ خدا نے سب سے پہلے میرے نور کو اپنے نور سے تخلیق کیا اور یہ نور اس



وقت تخلیق ہوا جب زمان و مکاں نہیں تھے۔ زمین و زمان نہیں تھے۔ لوح و قلم اور کرسی و عرش کا وجود نہیں تھا۔ جب چاند سورج ستارے نہیں تھے۔ جب بحر و بر، شمس و قمر اور شجر و حجر کا وجود نہیں تھا۔ جب زندگی اپنے احساس اور کائنات اپنے ادراک سے محروم تھی تو اس وقت رب العالمین نے اپنے محبوب مصطفیٰ ﷺ کے نورِ مظہر کو جلوہ گر کیا اور پھر اسی نور سے بزمِ ہستی سجائی گئی۔ اس محبوب اور مرغوب موضوع کو بہت سے شعرا نے اپنے نعتیہ کلام میں قلم بند کیا ہے۔ جیسا کہ امیر خسرو فرماتے ہیں:

نمی دانم چه منزل بود شب جائیکہ من بودم  
بہر سو رقص بگل بود شب جائیکہ من بودم  
خدا خود میر مجلس بود اندر لامکاں خسرو  
محمد شمع محفل بود شب جائیکہ من بودم  
یہی مضمون ظفر علی خاں کے ہاں یوں نظر آتا ہے۔

پھوٹا جو سینہ شب تارِ الست سے  
اُس نورِ اولین کا اُجالا تہی تو ہو  
یا پھر امام احمد رضا خاں کی تخیل پرواز ملاحظہ کیجئے۔

زمین و زمان تمہارے لیے، چنیں و چناں تمہارے لیے  
مکین و مکاں تمہارے لیے، بنے دو جہاں تمہارے لیے  
دہن میں زباں تمہارے لیے، بدن میں ہے جاں تمہارے لیے  
ہم آئے یہاں تمہارے لیے اُنھیں بھی وہاں تمہارے لیے  
اور پھر ایک اور صاحبِ نظر کے ہاں اسی مضمون کا حسن ملاحظہ کیجئے:

فصل اللہ علیٰ نورِ کزو شد نور ہا پیدا  
زمین از حب او ساکن فلک در عشق او شیدا

غرضیکہ نورِ مصطفویٰ ﷺ کی تخلیق کے بارے میں عربی، اردو، فارسی اور پنجابی زبانوں کے شعرا صدیوں سے نعت کی صورت میں اظہارِ خیال کر رہے ہیں مگر جب مہر علی شاہ گولڑوی اس مضمون کو بیان کرتے ہیں تو بات کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتے ہیں۔ سرکارِ گولڑویؒ کے فکرِ معجز نما کی پرواز سمندر کو کوزے میں سمونے کا نظارہ پیش کرتی ہے۔ آپ کی فکرِ رسا عشقِ رسول ﷺ کی



بلندیوں کو اس شان سے چھوتی ہے کہ پڑھنے والا فرط عقیدت سے جھوم جھوم اٹھتا ہے۔ آپ نے خلقتِ نور محمدی ﷺ کے مضمون کو اپنے نعتیہ اشعار میں اس شان سے باندھا ہے کہ دلوں کو نور محمدی ﷺ کی تخلیق کے فلسفے تک پہلی مرتبہ رسائی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ سید مہر علی شاہ چند مصرعوں میں وہ کچھ بیان کر گئے ہیں جو بعض اوقات شاعر طویل نعتیہ مثنوی میں بیان کرنے سے قاصر رہتا ہے اور پھر سرکارِ گولڑوی کی انفرادیت یہ ہے کہ نور محمدی ﷺ کی اولیت کا تذکرہ کرتے کرتے اپنے والہانہ پن اور بے خودی و سرشاری کو بھی حاصلِ شوق بنا گئے ہیں۔ آپ کا نعتیہ انداز ملاحظہ کیجئے اور لطف و سرور کی کیفیات میں ڈوب جائیے، فرماتے ہیں:

کن فیکون تاں کل دی گل اے اساں اگے پریت لگائی  
توں میں حرف نشان نہ آہا جدوں دتی میم گواہی  
اجے وی سانوں اوہ پئے دسدے بیلے بوٹے کاہی  
مہر علی شاہ رل تاہیوں بیٹھے جہاں سک دوہاں نوں آہی

حضور سیدنا مہر علی شاہ کے نعتیہ اشعار میں ”سک“ کا لفظ بہت سے مقامات پر استعمال ہوا ہے۔ ”سک“ کا مطلب ”طلب، چاہت اور آرزو“ ہے۔ آپ کے نعتیہ اشعار کے حسن کے طفیل یہ لفظ بذاتِ خود اتنا حسین، دلآویز اور جامع نظر آتا ہے کہ نعت کا لازمی جز و دکھائی دینے لگتا ہے۔ یہ لفظ آپ سے پہلے بھی استعمال ہوتا تھا مگر چوں کہ آپ کے نعتیہ کلام نے غیر معمولی شہرت حاصل کی اس لیے یہ لفظ بھی آپ کی دل نواز نعت نگاری کے صدقے اس قدر مقبول ہو گیا کہ دورِ حاضر کے کئی شعرا کے نعتیہ مجموعوں کے ناموں کا حصہ بن گیا۔ اسی لیے ”کلام الامام الکلام“ یعنی ”امام کا کلام زمانے بھر کے کلام کا امام ہوتا ہے۔“ کا مقولہ آپ پر صادق آتا ہے۔

آپ کو فارسی زبان پر کمال درجے کا عبور حاصل تھا۔ چوں کہ آپ کے دور میں فارسی علماء فصلا کی زبان تھی اور تمام دینی سرمایہ عربی اور فارسی میں ہی موجود تھا اس لیے آپ کی نظم اور نثر فارسی زبان کے حسن استعمال کے لحاظ سے بہت اعلیٰ و ارفع نمونہ ہے۔ ہم فارسی زبان میں آپ کے چار ایسے اشعار نقل کر رہے ہیں جن میں مقاماتِ مصطفیٰ ﷺ کے حوالے سے حسنِ تغزل کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں:

بستہ شد اندر ازل خاطر بداں شورِ جہاں  
کز نسیم تاب زلفش نوریاں پیچد ہم



اُحل الیعنین اُلح و ازج الحاجین  
سرمہ گیس چشمے ، کماں ابرو ملیجے ارجمے  
روئے تاباں والضحی واللیل مولیش ذابجی  
وز فتنائش لوا یلین از تبسمے  
دوش در گوشم رسیدہ از سگانِ کوئے دوست  
مہر را کے سز دہر خود پرستے بے غمے

فارسی زبان پر قبلہ عالم گولڑوی کو کمال عبور تھا۔ آپ کے نعتیہ کلام میں حسنِ تغزل بصدشان کار فرما ہے۔ حسنِ تغزل کا جادو سرچڑھ کر بولتا ہے۔ حسنِ تغزل لفظوں کی گل کاری اور جذبات کی سحر کاری کا نام ہے۔ یہ جذبوں کی تپش اور دلِ شوریدہ کی خلش ہے۔ اس میں طالبِ بہت کچھ کہہ کر بھی یہی محسوس کرتا ہے کہ جیسے کچھ بھی نہیں کہا۔ حسنِ تغزل میں لفظوں کے پھول کھلتے ہیں اور افکار کی کلیاں چمکتی ہیں۔ ہر شعر بلاغت کا آئینہ دار اور نور و نکہت کا حسنِ پروقا نظر آتا ہے۔ سید مہر علی شاہ گولڑویؒ عام روایتی شاعر نہیں تھے جو کسی وقتی مجبوری کے تحت نعت و مدحت کے کوچے میں جمالِ باکمال کو تصور میں رکھتے ہیں۔ انہیں کی یادیں انہی کی باتیں۔ انہی کے لیے جیتے اور انہی کے ناموس پر مر مٹنے کا جذبہ رکھتے ہیں۔ آپ نے تو اپنے محبوب ﷺ کے جمالِ جہاں آرا کا نظارہ بھی کر رکھا ہے اور بار بار دیکھنے اور دیکھتے رہنے کی آرزو انہیں مسلسل بے قرار کیے ہوئے ہے۔ یہی بے قراری و اشک باری ان کے نعتیہ اشعار کو حسنِ تغزل کی معراج بخش دیتی ہے اس ضمن میں ان کی ایک اور نعت کے چند اشعار ملاحظہ ہوں جو آپ کی روحانی وارداتِ قلبی کے غماز ہیں:

صبا ز طرہ شبرنگِ مہوش طنار  
کشد نافہ مشکیں بروئے اہلِ نیاز  
کیم گدائے درِ مفلسی و کوتاہ دست  
کجا ایں عالیہ عطری و قصہ ہائے دراز  
توئی کہ ذرہ صفت را بآسماں بردی  
چگو نہ شکر تو گوید کمینہ بندہ نواز  
غرض ادائے نیاز است ورنہ حاجت نیست  
کمالِ شمتِ محمود را بجز ایاز



ربین ساقی چشم کہ جرعه بخشاند  
ز جام چہرہ ترکان مہو شان حجاز  
بہ بزم بادہ فروشاں بہ نیم جو نہ خرد  
متاع زاہد طماع چہ حج و صوم و نماز  
مزار پیر مغاں راز ہائے سر بستہ است  
فغاں ز واعظ خود ہیں کجا است محرم راز؟  
اگرچہ حسن تو از مہر غیر مستغنی است  
من آں نیم کہ ز ایمان خویش آیم باز

سید مہر علی شاہ گولڑویؒ جب پنجابی زبان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو آپ کے قلم معجز رقم میں اور ہی والہانہ پن سما جاتا ہے۔ زبان کی مٹھاس، لہجے کی چاشنی، بر محل الفاظ کا استعمال، دل نشیں تراکیب بر محل بولتے ہوئے مصرعے، آنسو بہاتے ہوئے جذبے، خیالات کی روانی، احساسات کی طغیانی، افکار کا بحر بے کنار اُچھلتا ہوا، معانی کا آہوئے تاتاری مچلتا ہوا۔ ان میں بعض تراکیب ایسی ہیں جو آپ کے اپنے علاقے سے مخصوص ہیں مگر آپ کے لہجے کی مٹھاس نے انہیں ایسا حلاوت آفریں بنا دیا کہ قلب و جان کو بوجھ نہیں بلکہ روحانی فرحت کا احساس ہوتا ہے۔ آپ کے کہے ہوئے مناقب میں بھی بہت سے اشعار نعتیہ ہیں اور آپ کی منظومات میں بھی نعت رسول ﷺ کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ آپ نے پنجابی زبان میں جو بھی لکھا وہ حاصلِ کلام ٹھہرا اور ایسے قبولیت عام کی خلعت عطا ہوئی۔ آپ نے نعتیہ ماہیا بھی لکھا۔ نعتیہ ڈھولا بھی لکھا اور باقاعدہ نعت بھی لکھی غرض جو بھی لکھ دیا عوام و خواص کی نظروں میں محبوب و مقبول ٹھہرا۔

ایک جگہ آپ حضرت جامیؒ کی ”یوسف زلیخا“ کی طرز میں پنجابی نعتیہ اشعار رقم فرماتے ہیں۔ صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ آپ کا رخ سلطانِ دو عالم ﷺ کی جانب ہے اور آپ شہر مدینہ کی جدائی میں بے قرار ہیں اور جانِ مدینہ ﷺ کے دیار کے لیے تڑپ رہے ہیں۔ اس نعت کے چند اشعار پیش خدمت ہیں :

نسیما قاصدانہ و لیس لائیں  
لوجہ اللہ ماہی دے دیں جائیں  
ادب سیتی دیویں بوسہ زمیں نوں  
تے آکھیں اس طرح اُس نازنین نوں



مدت ہوئی نہ ملیا یار پیارا  
 کدیں منزل کرے سوہنا اُتارا  
 کے ہوسی چا نوازیں گولڑویں نوں  
 زیادہ نہ کریں گل تھوڑی نوں  
 ہوواں میں سگ مدینے دی گلی دا  
 ایہو رتبہ ہے ہر کامل ولی دا  
 دلا سمجھا توں اکھیاں روندیاں نوں  
 جگر دا خون بھر بھر کھوندیاں نوں  
 رہی سمجھاتے آون باز ناہیں  
 روون دھوون تے دس راز ناہیں

اسی نعت میں ان کا گداز نئی بلند یوں کو چھوتا ہے اور عشق جو رسمیات سے غیر آگاہ ہوتا ہے  
 یکا یک ادب کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے کیوں کہ آپ باخبر ہیں کہ یہ ایسا محبوب ہے جو دو عالم  
 ہی کا محبوب نہیں بلکہ اپنے خالق کا بھی محبوب ہے اور یہاں عشق کے نام پر معمولی سی شوخی بھی نامہ  
 اعمال کو سیاہ کرنے کا باعث بن سکتی ہے۔ اس حوالے سے اس طویل نعت سے مزید کچھ اشعار  
 ملاحظہ ہوں:

بہانواں کول آکھاں بول دے ڈھول  
 ترے بولن اتوں عالم کراں گھول  
 وچھوڑا ناں کسے دے پیش آوے  
 کسے دا یار ناں پردیس جاوے  
 کوں پردیسیاں نوں یاد کرنا  
 غریب الوطن دا دل شاد کرنا  
 کوئی ہووے سیو کشتی جہاناں  
 اساں سر پر ججن سے دیں جاناں

پیر مہر علی شاہ گولڑویں آج کے لفظوں میں باقاعدہ شاعر نہیں تھے۔ آپ کی شاعری نمود  
 و نمائش یا شہرت کے حصول کا ذریعہ نہیں تھی اور نہ ہی آپ کے لیے شاعر کہلانا بہت بڑا اعزاز تھا۔



اس کے لیے آپ نے بہت کم لکھا مگر جو لکھا خوب لکھا۔ آپ کے نعتیہ اشعار اور مناقب پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ نے دل اور جگر کے ٹکڑے قرطاس کی زینت بنا دیے ہیں۔ اس تناظر میں ہم دیکھتے ہیں تو آپ کے بہت سے نعتیہ اشعار طویل مناقب سے بھی دستیاب ہیں۔ اپنے مرشد اعلیٰ کا ذکر کرتے ہیں تو راہوارِ قلم کا رخ بے اختیار گنبدِ خضریٰ کی طرف مڑ جاتا ہے اور محبتِ رسول ﷺ کے گل و لالہ نوکِ قلم سے ٹپکنے لگتے ہیں۔

مشہور سماجی شخصیت مولوی محرم علی چشتی کے لڑکے مولوی قائم علی گولڑہ شریف کے درس و بینات میں داخل ہوئے تو سیدنا مہر علی شاہ کی نگاہِ کرم کے فیضان سے علومِ دین میں یکتا ہو گئے اور حضرت اعلیٰ سے ”فاضل لاہوری“ کا لقب پایا حالاں کہ تمام اساتذہ مولوی قائم علی کے علمی مستقبل سے مایوس ہو چکے تھے۔ ایک روز یہی فاضل لاہوری فارسی میں نظم کہہ کر لائے تو سرکارِ گولڑوی نے انہیں یہ نعت فی البدیہہ لکھوا دی:

آشفۃ مہروئے پرٹاز و ستم گارم  
من کشتہ ابروئے آں دلبر عیارم  
بر یادِ سیہ چشمے ہمہ روز سیاہم شد  
وز ناوکِ مژگانِ صد خار بہ دلِ دارم  
از زلفِ پریشانِ شد خانہ بدوشِ من  
وز مصحفِ روئے او آیاتِ خدا دارم  
عشق آمد و شد ساری چوں بوبگلاب اندر  
اور من دمن دروے سریتِ ز اسرارم  
بیروں نہ ز دم قدمے ویں طرفہ تماشا ہیں  
پر آبلہ شد پائیم عمریت کہ سیارم  
قد کان و مامعہ ماکان من الاکان  
الان کما کان مشہودِ دلِ زارم  
تایافتہ ام خبرے از بابِ علومِ دل  
دلدادہ بمہر آں شہ حیدرِ کرارم

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ سرکارِ گولڑوی کی شاعری ان کی وارداتِ قلبی کی غماض



ہے۔ انہوں نے بادشاہوں اور سلاطین کے قصائد نہیں لکھے۔ نوابوں اور حکمرانوں کے درباروں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا بلکہ نوابین اور امرا تو آپ کی نگاہِ کرم کے ملتجی رہا کرتے تھے۔ آپ کی نگاہوں میں تو جمالِ سیدالکونین علیہ السلام حاصلِ زندگی بن کر بسا ہوا تھا۔ بعض اوقات اصحابِ ذوق کی فرمائش پر فی البدیہہ اس شان سے اشعار کہے کہ حاصلِ کلام بن گئے۔ بعض اوقات آستانہ عالیہ کے ترنم ریز غلاموں کی فرمائش پر قوالی کے انداز پر نعتیہ اشعار لکھے جنہیں شہرت عالم اور بقائے دوام کی سند خاص عطا ہوئی اس ضمن میں ان کی لکھی ہوئی ایک نعتیہ قوالی کے دو بند پیش خدمت ہیں:

جب سے لاگے تورے سنگِ نینِ پیا  
نیند گئی آرامِ نہیں ساری ساری رینِ پیا  
دکھ آئے سکھ بھاگ گئے  
سب عیشِ مٹا سارا چینِ پیا  
تن من دھن سب تجھ پہ واروں  
وار دیوں کونینِ پیا  
جیا تڑپت ہے درسِ دیجو  
صدقہ حسنِ حسینِ پیا  
وصلِ علی کیا شان ہے  
لامتک فی الدارینِ پیا  
مہر علی ہے حبِ نبی اور حبِ نبی ہے مہر علی  
لحمک لحمی جسمک جسمی فرق نہیں مابینِ پیا

سید مہر علی شاہ گولڑوی نظریہ وحدت الوجود کے زبردست عالم بلکہ مبلغ بھی تھے۔ اس سلسلے میں آپ گھنٹوں گفتگو فرمایا کرتے تھے۔ نامور علما سے جو اس نظریے کے حامی نہیں تھے ان کے مناظرے بھی ہوئے۔ اس نظریے کے مخالف نامور صوفیاء نے بھی نظریہ وحدت الوجود کو ایک مقام پر جا کر درست کہا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اسے بازِ مچہ اطفال نہیں بننا چاہیے۔ جیسا کہ سیدنا جنید بغدادیؒ سے یہ قوم منسوب ہے کہ: ”منصور نے انا الحق درست کہا تھا مگر حق یہ تھا کہ اسے ضبط کیے رکھتا۔ شریعت تو ظاہری لوازم کو ہی مد نظر رکھے گی۔“



سید مہر علی شاہ گولڑویؒ کی نثر یہ تحریروں اور شاعری میں اس عظیم نظریے کی جلوہ گری خوب خوب محسوس ہوتی ہے۔ ان کی نسبت قادریہ کے ساتھ ساتھ چشتیہ بھی تھی۔ شمس الدین سیالویؒ کے دامان طریقت سے وابستہ ہوئے تو دنیا ہی بدل گئی۔ اپنے گھر سے بہت کچھ عطا ہوا تھا، سرکار سیالوی کے روحانی فیوضات نے مستغنی کر دیا۔ انہوں نے سرکار سیالویؒ سے اتنی محبت کی کہ فنا فی الشیخ کے درجے پر فائز ہو گئے۔ ادھر سرکار سیالویؒ کو بھی اس مردِ کامل سے غایت درجہ محبت تھی اگر دیکھے ہوئے عرصہ گزر جاتا تو فوراً بلوا لیتے بعض اوقات تو ایسا ہوتا کہ ادھر شیخ کے دل میں طلب جاگی اور ادھر سرکار گولڑویؒ، سیال شریف کی نورانی فضاؤں میں جلوہ گر ہو جاتے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ پیر اور مرید سچ مچ کے عاشق و معشوق تھے۔ دلوں کی زبان سے گفتگو کرتے اور پیغامِ رسانی کا ہنر جانتے تھے۔ سید مہر علی شاہ کا نعتیہ کلام اور غزلیات گولڑہ شریف کے علاوہ سیال شریف میں بھی قوال بڑے ذوق و شوق سے پیش کرتے۔ سرکار گولڑوی کے لکھے ہوئے مناقب ان کی خواجہ شمس الدینؒ سے محبت کی دل نشیں اور نہایت موثر تصویر پیش کرتے ہیں۔ ان مناقب میں عشق و عقیدت کی سرفرازی بھی ہے اور اپنے مرشد سے محبت کا والہانہ پن بھی۔ اس میں ظاہر کیا گیا ہے کہ مجھ سے علمی لحاظ پر جو کچھ ہو سکا ہے وہ اسی شمس نورانی (خواجہ شمس الدین سیالویؒ) کے نورِ معرفت کی بدولت ہوا ہے۔ اپنی کتاب ”سیف چشتیائی“ میں تحریر کرتے ہیں۔

”اس وقت میں محسوس کر رہا ہوں کہ گویا شیخ میرے پاس موجود ہیں اور اپنی توجہ سے وہی قادیان کے جواب میں یہ دلائل میرے قلب میں القافر مار رہے ہیں۔“ اشعار کا حسن ملاحظہ ہو:

شمس نورانی کہ نورِ مطلق است  
در ہمہ آفاق نورش مطبق است  
گشت خورشیدے نہاں در ذرۂ  
شیر زرد پوسین برہ  
دیں عجب کاں شمس از نورِ قدم  
ناتواں روبرو خود صاحب علم  
گر نہ دادے نام پاکت دست را  
کس نہ دیدے در جہاں این مست را  
نام پاکت ساختہ ورد زباں  
مہر تورا در دلش کردہ نہاں



ہر دو عالم در ہواکش باخته  
پائے از دیدہ براہش ساخته  
سیمّا آں سرو بستانِ خدا  
شاہبازِ قدس آں شمسِ العلّٰی  
طلعتِ رو از تجلی فی الخیال  
مدرکہ با ناطقہ گردند لال  
بس کن اے دل قصہ بے انقصام  
السلام اے بدرِ شمس والسلام

چوں کہ ان اشعار کا اندازِ نعتیہ ہے۔ تراکیب کے پیمانے میں نعت کا حسن لیے ہیں اس لیے تذکرہ نگاروں کی جانب سے ٹھوکر کھا جانے کا احتمال ہے اور بعض تو ان اشعار کو سرکارِ گولڑوی کی نعت گوئی کے پلڑے میں ڈال بھی چکے ہیں مگر جب شاعر بقلم خود ان اشعار میں اپنی عقیدت کا مرجع اپنے پیر و مرشد کو قرار دیتا ہے تو کسی اور کو ان اشعار کو نعتِ سرورِ کوئین ﷺ سے منسوب کرنے کی کیا حاجت ہے۔ یہ امر بہر حال طے ہے کہ جب پیر خواجہ شمس الدین سیالوی جیسا بایزید ثانی ہو اور مرید سید مہر علی شاہ گولڑوی جیسا جنید وقت ہو اور اس کے ساتھ ساتھ وحدت الوجود کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہو تو ارادتِ مندی ایسی ہی لازوال خوش بو بکھیرتی ہے۔

صوفیائے کرام کا قدیم دور سے ایک شیوہ شاعری یہ رہا ہے کہ یہ حمد یا نعت کا عنوان نہیں باندھتے۔ اپنی وارداتِ قلبی بیان کیے جاتے ہیں اور آنے والے دور کا خوشہ چین حمد و نعت اور پسند و نصائح کے جواہر پاروں کو علاحدہ علاحدہ خانوں میں تقسیم کرتا چلا جاتا ہے۔ سید مہر علی شاہ کے ہاں روحانی واردات کی بہتات ہے۔ انتہائی علم و فضیلت نہایت گہرا مطالعہ، بے پناہ مشاہدہ اور سب سے بڑھ کر عمل کا حسن، ان سب عناصر نے ان کی شاعری کو پڑھنے والوں کے دلوں میں بے پناہ قریب کر دیا ہے۔ ”روز الست“ صوفیائے کرام اور درویش صفت شعرا کا محبوب موضوع ہے۔ اور پھر وہ ساعتیں جب خدائے کریم نور محمد ﷺ سے کرسی، عرش، لوح و قلم، زمین و آسمان، ملائکہ و جنت سمیت تمام کائنات تخلیق کر رہا تھا۔ یہ ساعتیں صوفی شعرا کو روحانی واردات اور فکری تگ و تاز کی بدولت اپنے مشاہدہ کا حصہ محسوس ہونے لگتی ہے۔ یہ دراصل غیر معمولی مطالعہ، باعمل زندگی، احترامِ شریعت اور محبتِ خدا و رسول ﷺ کی کرشمہ کاری ہے کہ مطالعہ مشاہدہ کا روپ اختیار



کر لیتا ہے جو کچھ ہم نے اُوپر بیان کیا ہے اسکے پس منظر میں حضرت گولڑوی کے یہ اشعار دیکھئے:

اے وی اوہ پیاں دسدیاں سانوں ماہی والیاں ٹاہلیاں  
 نال خوشیاں دے رل مل جتھے راتاں کالیاں جالیاں  
 اُرے تھیں لوہ ہے اُریرے، پریرے پرے تھیں  
 بے شک آپے آپ ہے اساں سمجھے جھوکاں بھالیاں  
 رات وچ دینہوں ویکھ سمجھے کل شی ہالک  
 کچھ نہ وچ سب کچھ ہے ڈھڑا ایہ بیرنگی چالیاں  
 جے آکھاں توں دسدا ناہیں تیرے بن پھر کون ہے  
 روپ کس دا میں دساں دیویں جو توں ہی دکھالیاں  
 ہے جو تنزیہ عین تشبیہ جمع حق مشہود ہے  
 کرم کیتا غوث الاعظم اپنے سردیاں والیاں

خدا سے باتیں کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ حضرت گولڑوی محبوب خدا کا تذکرہ کر رہے ہیں۔ ان کا اولین مصرع:

”اے بھی اوپیاں دسدیاں سانوں ماہی والیاں ٹاہلیاں“

صاف عظمتِ مصطفیٰ ﷺ کی طرف اشارہ کر رہا ہے جب ذاتِ خداوندی تمام انبیاء و رسل کی ارواح سے حضورِ مصطفیٰ ﷺ کی رسالت پر ایمان لانے کا وعدہ لے رہی تھی۔ ان اشعار کے ساتھ جوں جوں یہ سلسلہ آگے بڑھتا ہے سرکارِ گولڑوی کی بے چینی انتہا کو چھونے لگتی ہے اور وہ دیدارِ مصطفیٰ ﷺ کی تمنا کرنے لگتے ہیں۔ دیدارِ مصطفوی کی دولت پہلے ہی ان کا مقدر بن چکی ہے۔ اس تناظر میں ان کی بے قراری دیکھئے:

پاکے گل وچ پچیاں زلفاں وے میں روندی وتاں  
 ساوی پیلی ہو رہیاں گیاں سرخیاں تے لالیاں  
 رہندیاں پل پل سکاں دم دم اڈیکاں تیریاں  
 کنڈ ولا کے ٹرگیوں بچناں پریتاں نہ پالیاں  
 جہاتِ پاکے دل گیوں سپڑی رین گزری روندیاں  
 نین برن زار رم جھم جیویں بدلایاں کالیاں



دل دا ویہڑا خانہ اکھیاں دا دوہاں نوں انتظار  
قدم پاویں جیونداں جیوندیاں تہ ہوون خوش حالیاں  
دیکھ لو رج رج کے اکھو کجھ وسائیں دم دا  
پھر بھی پیاں دیکھن کوئی خوش نصیاں والیاں

حضرت گولڑوی اپنی نعتوں میں وہ لب و لہجہ اختیار کرتے ہیں جو صوفیا کو محبوب رہا ہے۔ اسی وجہ سے ان کی شاعری میں غضب کا لوچ اور نغمگی ہے یہی وجہ ہے کہ نعتیہ محافل، دینی مجالس اور قوالی کی تقاریب میں آپ کی نعتیں نہایت ذوق و شوق سے پڑھی اور سنی جاتی ہیں۔ ویسے تو آپ کا تمام کلام ہی عارفانہ ہے اور اس حیثیت سے ہم گفتگو کرنے لگیں تو داستان دراز سے دراز تر ہوتی چلی جائے گی لیکن اس مضمون میں ہمارا موضوع بطور خاص آپ کی نعتیہ شاعری ہے بعض مقامات پر تو آپ کی طویل متصوفانہ منظومات سے بطور خاص چند نعتیہ اشعار منتخب کرنے پڑتے ہیں۔ آپ کی ایک معروف نعت کے چند بند قارئین کے ذوقِ علمی کی نذر ہیں آپ کی جس نعت سے چند اقتباسات نذر کیے جا رہے ہیں وہ اکثر محافل میں اہل شوق کی وارفتگی کا سامان مہیا کرتے ہیں :

دل لگڑا بے پرواہاں نال جتھے دم مارن دی نہیں مجال، صل علیہ ذوالجلال

روندیاں نیناں نوں سمجھا رہی

لکھیا پڑھیا سب بھلا رہی

ہک نام ججن دا گا رہی

رگ رگ تے لوں لوں ساہاں نال

دل لگڑا بے پرواہاں نال جتھے دم مارن دی نہیں مجال، صل علیہ ذوالجلال

کراں یاد میں سوہنی جہات نوں

اس سفر عرب والی رات نوں

اس حمرا وادی دی گھات نوں

یا لیتنی یوم الوصال

دل لگڑا بے پرواہاں نال جتھے دم مارن دی نہیں مجال، صل علیہ ذوالجلال

آدم تھیں تاں عیسیٰ مسیح

نفسی بلیسن سب نبی \*



اتھے بوسی ہک اُمتی  
احمد علیؑ نبی صاحب کمال  
دل لگڑا بے پروا ہاں نال جتھے دم مارن دی نہیں مجال، صل علیہ ذوالجلال

ربی الہی صمدی  
صل وسلم علی النبی  
فاطمہؑ الذہرا و علیؑ

حسین جگ دی پناہاں نال

دل لگڑا بے پروا ہاں نال جتھے دم مارن دی نہیں مجال، صل علیہ ذوالجلال  
اس مشہور و معروف نعت میں دیدار مصطفیٰ علیہ السلام کے لیے ان کی تڑپ عجیب ہی رنگ  
اور بے قراری لیے ہوئے ہے۔ اس معاملے میں آپ دیوانگانِ قافلہ شوق کے سربراہ نظر آتے  
ہیں بے چینی و بے قراری حد سے فزوں ہونے لگتی ہے:

سارا دن گز لھاں بھوندیاں  
گھٹ پلڑا مکھ تے روندیاں  
ہنجواں نال مکھڑا دھوندیاں  
ساری رین سالاں تے آہاں نال

دل لگڑا بے پروا ہاں نال جتھے دم مارن دی نہیں مجال، صل علیہ ذوالجلال

جنیدی جند تلی تے دھر رہی  
گل پلڑا منتاں کر رہی  
لکھ واری توبہ پڑھ رہی  
رٹھڑا مناوَن دا خیال

دل لگڑا بے پروا ہاں نال جتھے دم مارن دی نہیں مجال، صل علیہ ذوالجلال

جب بے قراری اور اضطراب کمال کو چھونے لگتے ہیں تو سرکارِ دو عالم ﷺ کی شانِ رحمت  
کا خیال آتا ہے کہ آپ تو بے یاروں کا یارا اور بے چاروں کے چارہ ہیں۔ غم نصیبِ زندگی کا  
درمان اور رنجِ عالم کے طوفان میں راحت کا سامان ہیں۔ آپ کی شانِ رحمت روتے دلوں کو  
ہنساتی اور بھیکتی آنکھوں کو مسکراہٹ کے آداب سکھلاتی ہے۔ آپ سے غم زدہ کا حال پوشیدہ نہیں



ہے۔ لہذا رونا کیا اور اضطراب کیسا۔ اس جاں فزا احساس کے ساتھ ایک نئی اُمید دل و جان میں خوشیوں اور مسرتوں کے چراغ روشن کرنے لگتی ہے اور بے اختیار پکار اُٹھتے ہیں:

مہر علی کیوں پھریں اُداسی  
اج کل سوہنا آ گل لاسی  
ہوسن خوشیاں تے غم جاسی  
ملساں لمیاں کر کر باہاں نال

دل لگڑا بے پرواہاں نال جتھے دم مارن دی نہیں مجال، صل علیہ ذوالجلال

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات والا صفات سے بے پناہ محبت و عقیدت ہی ان کے اشعار سے نعت کے نام پر ہجر و فراق کی خوشبو کشید کرنے کا باعث بنی۔ آپ کی شاعری میں جہاں نعت حضور، رحمت حضور اور الطاف حضور کے حوالے سے کیف و شادمانی کے احساسات ملتے ہیں۔ وہاں ہجر و فراق، جدائی و فرقت اور اشک باری و غم ناکی کے احساسات بھی بدرجہ اولیٰ ملتے ہیں۔ صوفیائے کرام کی غزلیات بھی ان کی روحانی واردات کی امین ہوتی ہیں۔ ان کا محبوب مجازی نہیں بلکہ حقیقی ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے ان کے کلام میں بہ یک وقت حمد و نعت کی کیفیات موجزن دکھائی دیتی ہیں۔ اُردو پنجابی کے علاوہ آپ کی عربی اور فارسی زبانوں پر بھی مضبوط گرفت تھی۔ ان کی نعتوں میں جا بجا عربی کے مصرعے ہی نہیں بلکہ مکمل اشعار بھی بڑی تعداد میں نظر آتے ہیں۔ قصیدہ فارضیہ عربی قصائد میں بلند ادبی مقام رکھتا ہے۔ آپ نے اس کے بعض اشعار کا پنجابی میں ترجمہ فرمایا ہے۔ ان میں سے چند اشعار پیش خدمت ہیں جن سے آپ کی اس مہجوری و فرقت کا اندازہ ہوتا جو مدینے سے دور رہ کر آپ کو بے چین کیے ہوئے تھی:

ساربانان مہربانان راہیا  
شالا جیویں خیر تھیویں ماہیا  
آکھیں جا اُنہاں پیاریاں دل جاناں  
گوڑھے نینان والیاں مستانیاں  
سارا عالم صدقے آکھاں بول توں  
داراں سر میں اُس انوکھڑے ڈھول توں  
بن تہاڑے ہک گھڑی سو سال دی  
بہہ ٹھکانے پئی تہاڑے بھال دی



چشماں فرش و چھاواں خاطر ڈھول دی  
مرحبا یا مرحبا پئی بول دی  
پہنچیں جد توں سوہنیاں دی جھوک تے  
خیر ہووی انہاں نوں ذرا روک تے  
جا سنیہڑا دیویں انہاں جانیاں  
گوڑھے نیناں والیاں مستانیاں  
بھلدے نہیں اوہ بول مٹھڑے ڈھول دے  
بول سانول یار روہی رول دے

ان اشعار میں ہجر و فراق اپنی انتہا کو چھوتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ قاصد کے ہاتھ پیغام کیا بھیج رہے ہیں یوں لگتا ہے جیسے اپنی روح اور دل قاصد کے حوالے کر دیتے ہیں اور اشکوں کی برسات کو اظہارِ مدعا کا ذریعہ بنا لیا ہے۔ امام احمد رضا فاضل بریلوی کے ہاں ایسے ہی اشتیاق کی جھلک یوں ملتی ہے:

جان و دل ہوش و خرد سب تو مدینے پہنچے  
تم نہیں چلتے رہا سارا تو سامان گیا

بلاشبہ حضرت گولڑوی محبوبانِ بارگاہِ خداوندی میں سے تھے۔ آپ کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جن کا فرمایا ہوا مستند اور جن کا لکھا ہوا حاصلِ ادب ہوتا ہے۔ آپ اول و آخر شاعر نہ تھے۔ آپ تو فقط عاشقِ رسول ﷺ تھے وہ عاشقِ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام جس کی زندگی سراسر سیرتِ مصطفویٰ کا نمونہ اور جس کی بندگی آدابِ نیاز سے عبارت تھی۔ جس کی زندگی خدا کے نام پر اور جس کی موت نبی مکرّم ﷺ کے پیغام پر تھی۔ نعت تو آپ کے عشق و عقیدت اور وارداتِ روحانی کے اظہار کا قابلِ صد ستائش نمونہ ہے۔ آپ کی نعت گوئی تو اس حدیٰ خوان کا زمرہ شوق ہے جسے صحرائے محبتِ رسول میں دیوانہ آگے کو بڑھتے ہوئے جوشِ افتاد کا ذریعہ بنا لیتا ہے۔ آپ گلستانِ مدحت و عقیدت کے وہ گلِ سدا بہار ہیں جس کی خوش بو سے ہر آنے والا زمانہ معنبر ہوتا رہے گا روحِ ارضی آپ کی عظمتوں کو سلام کرتے ہوئے آپ کو مقبولیت کی خلعتِ جاودانی بخشے ہوئے فخر محسوس کرتی ہے:

ہر گز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق  
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

☆☆☆



## خطیبِ اسلام صاحبزادہ سید فیض الحسن

صوفیائے اکرام اور بزرگانِ دین وہ مقربانِ خداوندی ہیں جنہیں خدا نے غیر معمولی کمالات اور ایمانی صفات سے نواز رکھا ہوتا ہے۔ ان محبوبِ خلألق شخصیات کا مرنا اور جینا خدا کے لیے ہوتا ہے اور ان کی جملہ فکری و نظری صلاحیتیں تبلیغِ اسلام اور ترویجِ دین کے لیے وقف ہوتی ہیں۔ شاعری وہ صفتِ خاص ہے جو بعض اولیائے کرام کو انعامِ خداوندی کے طور پر ودیعت ہوتی ہے اس لئے جہاں یہ دوسری صلاحیتوں کو فروغِ دین و مذہب اور اصلاحِ اُمت کے لیے استعمال کرتے ہیں وہاں یہ شاعری سے بھی اسلامی نظریات کی ترویج اور عقائدِ حقانیہ کی اشاعت کا کام لیتے ہیں ان کی شعری و ادبی خوبیاں رضائے الہی اور خوشنودیِ مصطفیٰ ﷺ کے نام پر ظلمتِ کدہ عالم پر ایمان آفریں اُجالے بکھیرنے کا باعث بنتی ہیں۔ ان صوفیائے کرام کا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے شاعری کو کبھی ذاتی تشہیر یا اپنی ادبی شہرت کا ذریعہ خیال نہیں کیا، بلکہ تاریخِ ادب شاہد ہے کہ ان کی فکری کاوشیں اور تخلیقی صلاحیتیں دنیائے شعر و ادب کے لیے ہمیشہ باعثِ صداقت و ثبات ہوتی رہیں۔

حضرت صاحبزادہ سید فیض الحسن کا شمار بھی ان صاحبِ تصوف میں ہوتا ہے کہ جنہوں نے خطابت کی بزمِ آرائیوں سے لے کر تحریکِ آزادی کی رزمِ آرائیوں تک ہر جگہ عشقِ رسول ﷺ کا پرچم لہرانے کے لیے اپنی جن خداداد صلاحیتوں سے کام لیا ان میں شاعری بھی خاص مقام کی حامل ہے اگرچہ ان کی شاعری بطورِ خاص بزمِ آرائیوں یا محفلِ افروزیوں کے لیے نہیں تھی، مگر آپ کے قریب رہنے والے اصحابِ دل گواہ ہیں کہ جب کبھی آپ اپنی کوئی نعت یا نظم سناتے یا کسی صاحبِ ترنم نعت خواں کو خوش الحانی سے پڑھنے کے لیے عطا فرماتے تو پوری محفل جذبِ و شوق اور عشق و عقیدتِ رسول ﷺ کی خوشبو سے مہک مہک اُٹھتی۔

خطیبِ اسلام حضرت صاحبزادہ سید فیض الحسن کی عظمتِ فکر کا جائزہ لینے کے لیے جب آپ کی ہمہ صفت موصوف شخصیت کا مطالعہ کرتے ہیں تو آپ کی علمی و فکری سر بلندیوں کے احساس سے ہی جبینِ شوق خم ہونے لگتی ہے۔ آپ علم و فن کا روشن مینار، کاروانِ آزادی کے



سربکف مجاہد اور برصغیر کی ولولہ انگیز خطابت کے فکر نواز سلسلے کی آخری کڑی تھے۔ گفتار موثر تھی تو کردار معتبر، باتوں میں گلوں کی خوشبو تھی تو اداؤں میں فقر غیور کی جھلک، شخصیت باوقار تھی تو سیرت صبحِ زندگی کا نکھار، فکر میں سمندروں کی گہرائی تھی تو نظر میں تیغِ خارا شگاف کی کاٹ۔ علم سرمایہ ایمان تھا تو عمل شوکتِ عرفان۔ تدبر میں پہاڑوں کی سر بلندی تھی تو تخیل میں صحرائے بے کنار کی وسعت۔ عاشقِ رسول ﷺ بھی تھے اور فدائے ناموسِ اسلام بھی۔ مجاہد تحریک ختم نبوت بھی تھے اور کاروانِ شوق کے قائدِ عالی مقام بھی۔

کسی بھی شاعر کی شعری عظمت کا احاطہ کرنے کے لیے اس کے فکری پس منظر کے ساتھ ساتھ اس کے زندگی کے ان عوامل پر بھی نظر ڈالنی پڑتی ہے جو اس شاعر کی ادبی و لسانی رفعتوں اور اس کے علمی تشخص میں پوشیدہ نظر آتے ہیں۔ صاحبزادہ سید فیض الحسن نے جس دور میں آنکھ کھولی وہ غلامی کا دور تھا چاروں طرف انگریزی استبداد کی دہشت خیزیوں کے چرچے تھے۔ ایسے حالات میں علامہ محمد اقبال شاعری کے افق پر آزادی کی روشنی بکھینچنے والے مہِ کامل کی صورت میں نمودار ہوئے۔ اقبال کی فکر اتنی عظیم اور ان کا فلسفہ اس قدر ہمہ گیر تھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے پورا عالم اسلام ان سے متاثر ہونے لگا۔ شمعِ آزادی کے پرستاروں کے لیے اقبال صبحِ زندگی کی نوید بن کر آئے یہی وجہ ہے کہ جب صاحبزادہ سید فیض الحسن سکول کی زندگی گزار کر کالج میں داخل ہوئے تو اقبال کے افکارِ تازہ ان کے ادراک اور ایمانی محسوسات کو نئی زندگی بخش رہے تھے۔ آپ اقبال سے یوں متاثر ہوئے کہ اقبال کی شاعری آپ کی خطابت کا لازمی جزو بن گئی اور آپ کی اپنی شاعری میں فکرِ اقبال کا جلوہ گری بہ ہزار انداز اپنے حسنِ تاثر کا احساس دلانے لگی۔

صاحبزادہ سید فیض الحسن ایک بہت بڑے علمی و روحانی گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ گھر میں آنکھ کھولتے ہی علم و ادب کا غیر معمولی چرچا دیکھا۔ قدرت نے طبعِ موزوں عطا کی تھی اس لئے چھوٹی عمر میں ہی خوبصورت اشعار کہنے لگے۔ کالج کی تعلیم کے دوران میں آپ کے ساتھ پڑھنے والے کئی عظیم و سر بلند اصحاب اُس دور میں آپ کی شعری صلاحیتوں کو خراجِ عقیدت پیش کر چکے ہیں۔ اس کی تازہ مثال روزنامہ ”نوائے وقت“ میں حال ہی میں نامور شاعر فیض احمد فیض کا شائع ہونے والا وہ انٹرویو ہے جس میں فیض احمد فیض نے کالج تعلیم کے دوران میں صاحبزادہ فیض الحسن کے بہت اچھے شاعر ہونے کا اعتراف کیا ہے۔ مرے کالج سیالکوٹ میں (جہاں سے صاحبزادہ صاحب نے بی اے کیا) فیض احمد فیض صاحبزادہ صاحب سے ایک سال آگے تھے۔ اس انٹرویو میں فیض احمد فیض نے اس امر کا بھی اقرار کیا ہے کہ ان کے والد روحانی سکون اور تزکیہ نفس کے لئے آلو مہار شریف جایا کرتے تھے۔



صاحبزادہ فیض الحسن نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ آپ نے نعتوں کے علاوہ غزلیں اور نظمیں بھی لکھی ہیں۔ آپ ایک عظیم عاشقِ رسول ﷺ تھے۔ اسی عشقِ رسول ﷺ سے آپ کی قوتِ فکر کو عظمتِ ایمان اور مخلوقِ خدا میں پذیرائی حاصل ہوئی یہی جذبہ عشقِ رسول ﷺ ان کی نعتیہ شاعری میں خوشبو بن کر سماتا اور حسنِ ایمان بن کر اپنے روشن وجود کا احساس دلاتا ہے۔ آپ کی نعتوں میں فکرِ اقبال کے علاوہ امام احمد رضا خاں بریلویؒ کے عشق و گداز اور ظفر علی خان کے شکوہ بیاں کی ایمان آفریں جھلک بھی نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے۔ آپ کی غزلیات عشقِ خداوندی روحانی فکرِ فروزیوں کے ساتھ ساتھ سوز و گداز اور مشاہداتِ ظاہری و باطنی سے عبارت ہیں۔ آپ کی منظومات میں فکرِ اقبال اس طرح جلوہ گر نظر آتا ہے کہ اگر آپ کی یہ نظمیں آپ کا نام دیئے بغیر باقیاتِ اقبال کے نام سے شائع کر دی جائیں تو کسی کو گمان بھی نہیں گزرے گا کہ یہ منظومات اقبال کی نہیں ہیں۔ آپ کی نعتیہ شاعری پر ایک نظر ڈالتے ہی آپ کی علمی و نظری رفعتوں کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

تیری نوائے شوق سے وجد میں ہے حریمِ ذات  
تیری نظر کے کیف سے مست ہے محفلِ حیات  
مرہمِ زخمِ بے کسی خندہ زیرِ لب ترا  
چارہ درِ عاجزی تیری نگاہِ التفات  
تیرے جمال کی قسم رقص کرے گا حشر تک  
تیری نوائے شوق کی دُھن پر ضمیرِ کائنات

.....

تیرے وقار پر فدا رعب و جلالِ موسویؑ  
تیرے جمال پر نثارِ جلوہ حسنِ یوسفیؑ  
تیری نگاہِ لطف ہے چارہ درِ عاجزی  
خندہ زیرِ لب ترا مرہمِ زخمِ بے کسی  
ساقیِ محفلِ آلتِ رحمتِ عام سے تری  
آ گیا اعتدال پر کیفِ مزاجِ زندگی

نعت چونکہ حضور محمد مصطفیٰ ﷺ سے عشق و عقیدت کا اظہار ہے اس لئے شاعر نئے نئے اسلوبِ فکر تراش کر آپ ﷺ کو خراجِ تحسین پیش کرتا ہے۔ نعت گو شاعر مضمونِ آفرینی کی جملہ صلاحیتیں بروئے کار لاتے ہوئے آپ ﷺ کی صورت و سیرت کے تصور سے قلب و نظر کو منور کرتا ہوا اشعار کو اپنے جذبات کا ترجمان بنا دیتا ہے۔ نعتِ حضور ﷺ میں مضمون پیدا کرتے ہوئے



شاعر کو شریعتِ مطہرہ کی روشنی میں ادب و احتیاط کو مد نظر رکھنا پڑتا ہے کیونکہ معمولی سی فکری لغزش سے بھی توحید کا تصور مجرم ہونے یا توہینِ رسالت کے ارتکاب کا گمان گزرنے لگتا ہے۔ صاحبزادہ سید فیض الحسن صاحب علم و فضیلت شخصیت تھے۔ آپ نے عشق و عقیدت کی تمام تر عظمتوں کو دل و جان میں جگہ دیتے ہوئے راہِ ہوا و فکر کو کسی مقام پر بھی بے قابو نہیں ہونے دیا۔ شریعتِ مطہرہ کی روشنی میں آپ نے مضمون آفرینی کے وہ جوہر دکھائے ہیں کہ ان کی تب و تاب مدتوں قلوب و اذہان کو ذوقِ معرفت عطا کرتی رہے گی۔ مثال کے طور پر۔

جمشید کا تو جام تھا جامِ جہاں نما  
جامِ خدا نما ہے مگر جامِ مصطفیٰ

یہ فیضِ عام ہے اے رحمتِ تمام ترا  
جہاں میں درد کوئی لا دوا نہیں ملتا  
وہ آئے ساقی کوثر کے میکدہ میں ذرا  
جسے گمان ہے آبِ بقا نہیں ملتا  
سنجھال لیتا ہے دستِ کرمِ ترا اس کو  
جہاں میں جس کو کوئی آسرا نہیں ملتا  
تلاشِ عفو کو ہے خود گناہگاروں کی  
یہ فیضِ عام ہے اے رحمتِ تمام ترا  
اُسی کی دُھن پہ تو عشاق رقص کرتے ہیں  
ہے سازِ عشق کا مضراب پاک نام ترا

امام احمد رضا خاں بریلویؒ کا روانِ عشق و مستی کے سالار تھے۔ آپ نے اپنے غیر معمولی عشقِ رسول ﷺ، تبحرِ علمی، روحانی سوز و گداز کے ساتھ ساتھ ادب و احتیاط کے تقاضوں کو بجالاتے ہوئے نعتِ رسول ﷺ کو اردو ادب میں باقاعدہ اور مستقل صنفِ سخن کی حیثیت عطا کر دی۔ آج کا نعت گو شاعر آپ کے عشق و عقیدت سے افکار کی روشنی مستعار لیتا ہوا دربارِ رسالت میں ہدیہِ عقیدت پیش کرتا ہے۔ صاحبزادہ فیض الحسن کی نعتوں میں امام احمد رضا خاں بریلویؒ کی محبتِ رسول ﷺ کی ایک مشہور نعت پر طبع آزمائی کرتے ہوئے کہی ہے۔ فاضل بریلویؒ کی اس مقبول عام نعت کے قالب میں نعت کہتے ہوئے صاحبزادہ سید فیض الحسن کا اندازِ فکر دیکھئے۔ اس میں ان کی انفرادیت بھی بصد اعزاز نمایاں محسوس ہوتی ہے۔

ہم سری کون کرے تیری کہ خود خالق نے  
جب کیا ہی نہیں ثانی کوئی پیدا تیرا



اہل ایمان کے نزدیک کئی لاکھ گنا  
مشک و عنبر سے گراں تر ہے پسینہ تیرا  
بستہ قیدِ زماں تھا دمِ عیسٰی کا کمال  
دور ہے تا بہ ابد میرے مسیحا تیرا  
ساقی حشر ملے فیض کو بھی جام کوئی  
میکدہ تیرا ، سبو تیرا ہے مینا تیرا

حضرت محمد ﷺ حسن صورت کے لحاظ سے مظہر انوارِ خداوندی ہیں تو حسن سیرت کے لحاظ سے آپ کا کردار عین قرآن ہے۔ حسن صورت کا یہ عالم کہ یسین و طہ کی تابانیاں آپ کا احاطہ کئے ہوئے ہیں اور حسن کردار کی جلوہ گری یہ کہ آپ ﷺ کا اُسوۂ حسنہ کائنات کے لیے تا بہ ابد باعثِ تقلید ٹھہرا دیا گیا۔ حقیقتاً آپ ﷺ کا حسنِ کامل صورت کی دلاویزی کے ساتھ ساتھ سیرت کی ہمہ گیری سے بھی عبارت تر ہے۔ اسی لئے نعت گو شعراء نے آپ ﷺ کے سراپائے اقدس کو اشعار کی زینت بناتے ہوئے آپ ﷺ کے اُسوۂ عالم طراز کو بھی موضوعِ فکر بنایا ہے۔ سید فیض الحسن نے حسنِ تغزل کی تمام چاشنی سمیٹتے ہوئے آپ کے جمالِ مہر افروز اور سیرت و کردار کی لمعہ افشانیوں سے ادراک و وجدان کے نہاں خانوں کو یوں منور کیا ہے کہ عظمتِ حسنِ حضور ﷺ ہر بار نئے انداز میں جلوہ فگن نظر آتی ہے۔ حسنِ حضور ﷺ کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے سید فیض الحسن کا اندازِ سخن ملاحظہ کیجئے۔

نکبتِ زلف سے تری مست ہوا ہے پھول پھول  
کیفِ جمال سے ترے جھوم اٹھی کلی کلی

حسن تیرا ہے جلوہ گر تابشِ مہرِ ماہ میں  
رنگ تیرا ہی ہے عیاں حسنِ گل و گیاء میں  
ترے دفورِ نور نے کام کیا حجاب کا  
دیدۂ شوق کھو گیا تابشِ بے پناہ میں  
تری شمیمِ زلف سے نکبتِ گلشنِ خیال  
تری نگاہِ مست سے مستیء دردِ سلبیل

اگرچہ سید فیض الحسن کی نعتیہ شاعری کے غالب حصہ میں عشق و عقیدت کے ساتھ ساتھ حضور نبی کریم ﷺ کے جمالِ اقدس کی تابانیاں بکھری نظر آتی ہیں مگر جب یہ سیرت سرورِ کائنات ﷺ کے حوالے سے بات کرتے ہیں تو اور ہی لفظ سامانی کا منظر پیدا ہو جاتا ہے۔ آپ



کے اشعار میں سیرت محمد رسول اللہ ﷺ کا تذکرہ دیکھئے۔

کفیل امن ہے اور ضامن مسرت ہے  
زمانے بھر کے لیے حسن انتظام ترا  
برس رہا ہے سیاہ و سفید پر یکساں  
صحابِ رحمت حق بن کے فیض عام ترا



آمد سے تیری دوڑ گئی زندگی کی لہر  
بے جان سی تھی محفلِ دنیا ترے بغیر  
طوفاں زدہ نگاہ اٹھے اور کس طرف  
ہے کون بحرِ غم کا کنارہ تیرے بغیر

صاحبزادہ سید فیض الحسن اس حقیقت سے پوری طرح باخبر ہیں کہ باطل نظریات کے سراب میں گم کاروانِ انسانیت فقط تعلیماتِ محمدیہ ﷺ سے خوشہ چینی کی صورت میں ہی کامیاب و بامراد ہو سکتا ہے۔ حضور صاحبِ لولاک ﷺ سے کٹ کر ہم کچھ بھی نہیں اور آپ ﷺ سے نسبت میسر آ جائے تو خاک کے ذرے بھی ہمدیشِ ثریا بن جاتے ہیں۔ آج کا انسان امن و سکون کی تلاش میں بھٹک رہا ہے۔ عالمِ اسلام غیر معمولی مشکلات و مسائل کا شکار ہو چکا ہے۔ وہ قوم جس کی ہیبت و سطوت سے شاہانِ عالم لرزاں تھے آج عظمتِ ایمان سے محروم ہو کر نمونہ عبرت بنی ہوئی ہے۔ اس کی قوت و جرات کے سوتے جو اس کے عزائم سے پھوٹتے تھے آج خشک ہو چکے ہیں۔ مسلمان قوم کی اس بے چارگی و پسماندگی کو محسوس کر کے سید فیض الحسن کا دل خون کے آنسو روتا ہے اور وہ حضور سید یوم النشو ﷺ کے دربار میں اُمت کا استغاثہ پیش کر کے آپ کی نگہِ رحمت کے اُمیدوار بنتے ہیں۔ طویل نعت کی صورت میں آپ نے اُمت کا استغاثہ اس خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے کہ اسے پڑھتے ہوئے آنکھیں بے اختیار شدتِ احساس سے نم ہو جاتی ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

المدد اے رحمۃ اللعالمین  
جاں گسل ہے پھر غمِ دنیا و دیں  
جو ترے قدموں کے صدقے میں ملی  
تنگ ہے اسلام پر وہ سر زمیں  
بڑھ رہے ہیں پھر ہوس کے فاصلے  
ہو رہا ہے قلب پھر اندوہ گیس



پھر مقابل گردشِ حالات ہے  
 زہر کو سمجھا مسلمان انگلیں  
 ہو سکے گی کفر کے در پر نہ خم  
 حشر تک تیرے غلاموں کی جبیں  
 بیکسوں کا مشکلاتِ دہر میں  
 جُز تیرے ملجا نہیں ماویٰ نہیں  
 ہو توجہ اس کے حالِ زار پر  
 فیض ہے تیرا غلامِ کمترین

نعتِ رسول کریم ﷺ فکر و فن کی معراج بھی ہے اور لوح و قلم کا وقار بھی۔ علم و ادب کا افتخار بھی ہے اور بزمِ ہستی کا نگار بھی۔ ہر عہد اس کا عظمت شناس ہے تو ہر صدی اس کی رفعت آشنا۔ ادیبوں نے اسے فکر کا بانگین سمجھا تو خطیبوں نے اعجازِ نطق خیال کیا۔ دانشوروں نے متاعِ یقین سمجھا تو عشاق کو امیں ارمغانِ محبت کی جلوہ فرمائی نظر آئی۔ آج کا دور نعتِ رسول کریم ﷺ کا دور ہے۔ آج کا شاعر حضور ﷺ کے دامنِ رحمت سے وابستگی کو اپنا اعزاز اور آپ سے عقیدت کو سرمایہ ایمان سمجھتا ہے۔ صاحبزادہ سید فیض الحسن بھی نعتِ رسول ﷺ کہتے ہوئے بے پناہ خوشی و سرشاری محسوس کرتے ہیں۔ وہ توفیقِ نعت گوئی کو خدا کی طرف سے عطا ہونے والی نعمتِ عظمیٰ قرار دیتے ہوئے اس نسبتِ روحانی پر انتہائی نازاں ہیں۔ اس امر کا اظہار یوں کرتے ہیں۔

زہے نصیبِ سعادت ملی ہے مدحت کی  
 مری نجات کو یہ انتخاب کافی ہے

اگر قبول کرے رحمتِ تمام تری  
 تو فیض پیش کرے ارمغانِ بے ہنری

شرف یہ بھلا فیض کیا تجھ کو کم ہے  
 کہ تو بھی ہے ادنیٰ ثنا خوانِ احمد

آقائے دو عالم افتخارِ آدم و بنی آدم جناب رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ والا صفات خلاصہ محاسنِ کائنات ہے۔ آپ کا اسمِ گرامی وہ اسمِ اعظم ہے جس سے دلوں میں مرادوں کے پھول کھلتے



اور تمناؤں کے چمن زار مہکتے ہیں۔ اس نام کی تاثیر مسلم اور اس کی تکرار حلاوت آفریں ہے۔ یہ نام کلید محزن عرفان بھی ہے اور حاصل ایمان بھی۔ اس نام کے ساتھ رحمۃ اللعالمین کا جو تصور وابستہ ہے وہ محروم انسانوں کے لیے پیام اُمید بھی ہے اور عالم اسلام کی عظمت و سر بلندی کی نوید بھی۔ سید فیض الحسن حضور رحمۃ اللعالمین ﷺ کی رحمت بے پایاں کا تذکرہ اس انداز سے کرتے ہیں کہ عشق و ارادت اپنے تمام تر سوز و گداز کے ساتھ شاعر کے مافی الضمیر سے چھلکتے نظر آتے ہیں۔ آپ کی بے کراں رحمت کو آواز دیتے ہوئے سید فیض الحسن ماجرائے عشق یوں پیش کرتے ہیں۔

سن کبھی اے جانِ خوبی قصہ دردِ نہاں  
ہے لکھی دل نے مرے یہ داستاں تیرے لئے  
ہیں اٹھائے فیض بے کس نے بھی جانِ جہاں  
کیسے کیسے درد کے کوہِ گراں تیرے لئے

فیض سناؤں کس طرح قصہ دردِ آرزو

وقفہ حشر مختصر اور مری داستاں طویل

صاحبزادہ سید فیض الحسن کا نعتیہ کلام اُن کے عشقِ رسول ﷺ کا غماز اور اُن کے گدازِ ایمانی کا ہمراز نظر آتا ہے۔ یہ نعتیں ان کے جذبِ اندروں کا اظہار بھی ہیں اور ان کے حسنِ عقیدت کا شہکار بھی۔ اشعار کی صورت میں انہوں نے شوقِ بے تاب کی عرض گزاری کا سامان مہیا کیا ہے۔ خاموش جذبوں کو الفاظ کی زبان بخش کر اپنی تمناؤں کو دربارِ رسول ﷺ میں پیش کیا ہے۔ جیسا کہ ہم آغاز میں عرض کر چکے ہیں کہ صاحبزادہ سید فیض الحسن کی شاعری فکرِ اقبال سے یوں متاثر ہوئی کہ اقبال کا رنگ اپنی تمام تر امتیازی خصوصیات کے ساتھ ان کے کلام میں نمایاں ہو گیا۔ اقبال کی محبوب اصطلاحات اور تراکیب ان کے کلام میں اپنی تشریحات کے ساتھ ان کے کلام کا روش پہلو دکھائی دیتی ہیں۔ عقل و عشق، جنون و خرد، ذوق و شوق، حسن و عشق وغیرہ۔ نعت وہ یا نظم ہر مقام پر راہور عشق عقل کو حیران و پریشان چھوڑ کر منزلِ مقصود پر پہنچتا نظر آتا ہے۔ جنون کی سرفرازی خرد کی ظاہری چکاچوند کا طلسم باطل کرتی نظر آتی ہے۔ عشق کی قبولیت اور پذیرائی کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

جس کی تپش کا ہواثر اس کے حریمِ ناز تک

ایسا ہی سوز ہے نہاں عشق کی اک نگاہ میں



منطق و فلسفہ کے سب ساحل استوار فیض  
بہہ گئے سیلِ عشق کی یورشِ بے پناہ میں

.....

بن کے رہے گی اک دن سرمہ دیدہ سحر  
میرے جنوں کے فیض سے ظلمتِ شامِ عاشقی  
ہوش کی سختیاں گئیں عقل کی دھمکیاں گئیں  
جب سے بنا ہے دل مرا فیضِ غلامِ عاشقی

”جنون و خرد“ کے عنوان سے ان کی نظم جنوں کی منزل آشنائی اور خرد کی کوتاہ بینی کے راز آشکار کرتی نظر آتی ہے۔ اقبال کی طرح انہوں نے بھی جنوں کو عشق کی صورت میں جذبہ بے کراں سے تعبیر کیا ہے۔ جبکہ خرد راستے کے غبار میں گم منزل کی ادنی سی جھلک سے بھی محروم و نامراد دکھائی دیتی ہے، اس نظم کے تین اشعار پیش ہیں۔

خرد کو جب بھی ملا وہ پسِ نقاب ملا  
جنوں کو جب بھی ملا ہو کے باریاب ملا  
یقین خرد کو نہیں اپنی کامیابی کا  
جنوں کو مل بھی چکا اذن باریابی کا  
خرد تو کوئے طلب کے غبار میں گم ہے  
جنوں مشاہدہ حسنِ یار میں گم ہے

صاحبزادہ سید فیض الحسن نے بعض شعائرِ اسلامی پر بھی قلم اٹھایا ہے۔ اذان، نماز، عبادت اور عید کے عنوانات سے انہوں نے ان کی حقیقی روح کو اجاگر کیا ہے۔ ان کا اندازِ فکر سطحی یا عارضی نہیں ہے بلکہ انہوں نے ان شعائر کے فکری پہلو کو تمام فنی لوازمات کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا اندازِ فکر محدود یا مختصر نہیں ہے بلکہ ان کی سوچ، ان شعائر کے بنیادی مقاصد اور علمی و تہذیبی پس منظر کو واضح کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ عبادت کے عنوان سے ان کی فکر افروزی کی ایک جھلک دیکھئے۔

جہلت کے تقاضوں کو محبت آشنا کرنا  
مزاجِ زندگی کو خوگرِ حمد و ثنا کرنا  
جمالِ حسنِ مطلق کے حسیں جلوؤں میں کھوجانا

عید کو اکثر شعراء نے اپنی وقتی خوشیوں کی صورت میں موضوعِ شاعری بنایا ہے۔ اپنی ان منظومات



میں ان شعراء کی نظر عید کے سامان خورد و نوش اور رنگ برنگے ملبوسات سے آگے نہیں بڑھ سکی مگر صاحبزادہ سید فیض الحسن نے علامہ اقبال کی طرح عید کی مسرتوں میں جلوہ گر اس فلسفہ کو واضح کیا ہے کہ جو عید کو اہل ایمان کے لیے حقیقی خوشی و مسرت کا پیغام اور ماہِ صیام کے روحانی تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے والوں کے لیے خدائے پاک کا انعام بنا دیتا ہے۔ سید فیض الحسن کہتے ہیں۔

مسافرانِ رہ شوق کامیاب ہوئے  
حرمِ حسن کے انوار بے نقاب ہوئے  
مہِ صیام کی تکمیل کی نوید ملی  
خدا کا شکر ہے تبریکِ روزِ عید ملی

”اذان“ وہ نغمہ لاہوت ہے جو اہل ایمان کے دلوں کو عبادت کے لیے ابھارتا اور ان کے ایمان کو جلا بخشتا ہوا تو حید و رسالت کے آداب سکھاتا ہے۔ اذان صبح عبادت کی اولین تنویر بھی ہے اور بندگانِ خدا کے جذبہ یقین کی تنویر بھی۔ سید فیض الحسن کی نظم بلاشبہ اردو ادب کا شہ پارہ ہے۔ انہوں نے اس میں فکر و فلسفہ کے کتنے ہی جواہر تابدار جگمگاتے ہوئے اشعار کی صورت میں اصحابِ ایمان کے سامنے پیش کئے ہیں۔ تشبیہات و استعارات اور ایمان افروز تراکیب کے سبب یہ نظم دلوں کو عبادت آشنا کرتی نظر آتی ہے۔

گمشدہ نغمہ ہے کوئی بربطِ لاہوت کا  
وجد میں ہے جس کے زیرِ دہم سے دل ناسوت کا  
یہ نویدِ قربِ منزل ہے پیامِ وصل ہے  
ہر سحر اس کے فسوں سے رشکِ شامِ وصل ہے  
صبحِ صادق ہے صدائے ساربانِ عشق  
اُٹھ کہ یہ وقتِ رحیل کا روانِ شوق ہے

نماز کو اہل ایمان کی معراج کہا گیا ہے۔ اس عنوان سے سید فیض الحسن کی شعری صلاحیتیں کس طرح رنگ دوام پیدا کرتی ہیں دیکھنے کی چیز ہے۔ اس نظم کے آخری دو شعر پیش خدمت ہیں۔ نماز چونکہ عشقِ خداوندی کا پرتو اور جلوہ حسنِ خدا میں کھوجانے کا انداز ہے اس لئے ان کا استدلال ملاحظہ ہو۔

حریمِ ناز پردے اُٹھائے جاتے ہیں  
جمالِ یار کے جلوے دکھائے جاتے ہیں



حَریمِ حسن میں جب عشق باریاب ہوا  
یہی ہے عشق کی معراج کامیاب ہوا  
غالب اپنی ایک غزل کے نعتیہ مطلع میں جمالِ محمدی ﷺ کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔  
منظور تھی یہ شکل تجلی کو طور کی  
قسمت کھلی ترے قد و رخ سے ظہور کی

سید فیض الحسن ”ظہورِ نور“ کے عنوان سے حسن و جمال حضور ﷺ کی تابانیوں اور  
طلعتوں کو زبردست خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے اپنے عشق و اردات کی جولانیاں دکھاتے  
ہیں۔ غالب کے اس شعر کی روشنی میں ان کے یہ شعر ملاحظہ ہوں۔

وجودِ حسن رُخ یار کا نقاب بنا  
فروغِ نور ہی خورشید کا حجاب بنا  
شفق میں رنگ بھرا اور گلوں کو مہکایا  
ہزار رنگ میں اُسے ظہور فرمایا  
کہاں کہاں اسے دیکھا کہاں کہاں پایا  
وہ جانِ ناز برنگِ نیاز بھی آیا

”عظمتِ آدم“ کے عنوان سے ان کی فکر انگیزی کے انداز میں ملاحظہ کیجئے۔

اس طرح شیشہ امکاں میں ہیں انوارِ وجود  
مخفی راز کی غماز ہوئی بزمِ شہود  
ایک ایک قطرے میں نہاں شوکتِ قلزم دیکھو  
دیکھنے والو ذرا عظمتِ آدم دیکھو

ذوق و شوق اقبال کا خاص موضوع ہے۔ اقبال نے اس موضوع سے اُمتِ مسلمہ کو نئی  
زندگی کا پیغام دیا ہے۔ ان کے پیغام کی بدولت ذوق و شوق کی وارفتگی خاک کے ذروں کو ہمدوش  
ثریا ہونے کا سلیقہ بخش دیتی ہے۔ یہی فکر سید فیض الحسن کی نظم ”ذوق“ میں نمایاں نظر آتی ہیں۔

ذوق احساس و تخیل کو جلا دیتا ہے  
ذوق ذرے کو بھی خورشید بنا دیتا ہے  
معرفت کے درِ مسدود کو وا کرتا ہے  
فکر کو طاقتِ پرواز عطا کرتا ہے



”سرورِ سرمدی“ کے عنوان سے بیان کی فکری پرواز کی بلندی دیکھئے۔

خرد فریبِ زندگی جنوں شعورِ زندگی

یہ رازِ دارِ زندگی وہ محو جستجو ابھی

ہے میکدے میں کام کیا شعورِ ناتمام کا

دلیلِ جہل ہے یہاں شعورِ صبح و شام کا

سید فیض الحسن کی شعری وادبی صلاحیتوں سے خراج لینے والے ”حسن“ کا بانگین ملاحظہ کیجئے۔

حسن ربط و ضبط ہستی حسن روح کائنات

ملتِ تخلیقِ آدم رونقِ بزمِ حیات

بزمِ امکاں حسن سے جنت بداماں ہوگئی

اس کے دم سے ہر خلش راحت کا سماں ہوگئی

صاحبزادہ سید فیض الحسن کی شاعری اُن کی غیر معمولی علمی وادبی صلاحیتوں کا نہایت

خوبصورت اظہار ہے۔ ان کی شاعری میں مطالعہ کی گہرائی بھی ہے اور مشاہدہ کی گیرائی بھی۔

مضمون آفرینی بھی ہے اور زبان و بیان کا خوبصورت انداز بھی۔ پرشکوہ تراکیب بھی ہیں اور بر محل

معاملہ بندی بھی۔ رفعتِ افکار بھی ہے اور شوکتِ استدلال بھی۔ جذباتِ ایمانی کی سچائی بھی ہے

اور خلوص عقیدت کی رعنائی بھی۔ آپ کی منظومات ہنگامی، وقتی یا عارضی سوچ کی حامل یا کسی سطحی

فلسفے کی اسیر نہیں بلکہ آپ کی فکر کا منبع قرآن، حدیث اور مطالعہ تاریخ و تہذیب ہے۔ اس لئے

آپ کی منظومات کا تاثر اتنا جامع، تاثر اس قدر ہمہ گیر اور نظریاتی استدلال سے اس قدر بھرپور

ہے کہ آپ کی شاعری یقیناً بھی خواہاں ادب کے نزدیک باعثِ افتخار قرار پائے گی۔ ہمیں یقین

ہے کہ تشنگانِ معرفت کو ان کی شاعری سے ذوقِ ایمانی کی جلا بھی میسر آئے گی اور فکر و نظر کی تابندگی

بھی۔ صاحبزادہ صاحب کا نعتیہ کلام ان کے لیے توشہ آخرت بھی ثابت ہوگا اور انہیں دنیائے

ادب میں حیاتِ جاوداں بخشنے کا باعث بھی بنے گا۔





## عہد آفریں نعت گو

### حفیظ تائب

منزل شوق کی جانب آگے بڑھتے ہوئے بعض رہ نور داس قدر خوش نصیب ہوتے ہیں کہ انکے قدموں کی چاپ آنے والے دور کے مسافروں کے لئے نشان منزل بن جاتی ہے اور مستقبل کے مسافر ان جادہ شوق اس خوش بخت مسافر کے فکر و عمل کے سرمائے کو اپنے لئے میزان تصور کرتے ہیں۔ حضرت حفیظ تائب کو قدرت نے اسی سعید بختی سے اس فیاضی سے نوازا ہے کہ انہیں نعتیہ شاعری کے حوالے سے کاروان عشق حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا حدی خوان تصور کیا جاتا ہے ایسا حدی خوان جو صرف خود ہی محبت رسول کے فکری و عملی تقاضوں کے مہکبار راستے پر کامرانی سے سفر نہیں کرتا بلکہ جس کی آواز سلطانِ خوبانِ دو عالم ﷺ کے دوسرے متوالوں کو بھی حب حضور ﷺ کی لازوال دولت سے بہرہ ور کر دیتی ہے۔ احمد نگر (گوجرانوالہ) کی خاک سے ابھرنے والے اس ماہتاب صفت نعت گو کو خوش قسمتی ایک نئے جذبہ امتنان و تشکر سے آشنا کر رہی ہے۔

خوش ہوں کہ میری خاک ہی احمد نگر کی ہے  
مجھ پر نظر ازل سے شہِ بحر و بر کی ہے  
یادِ نبی ہو منزلِ عقبیٰ میں ساتھ ساتھ  
میری بس ایک یافت یہی عمر بھر کی ہے

حفیظ تائب گلستانِ نعت کے وہ خوش بخت عندلیب ہیں کہ جن کی نوا سے برصغیر کے بے شمار دل عشق حضور پر نور ﷺ کی دولت سے آباد ہوئے۔ آپ نے ایک عرصہ تک غزل کو اپنے خونِ جگر سے نوازا اور محبوبانِ مجازی کے حوالے سے نمائندہ غزلیات پیش کرتے رہے مگر جب احمد نگر کے درویش صفت حضرت الحاج چراغ دین قادری کے اس نورِ نظر کے تصورات کے خلوتِ کدوں میں محبوبِ خدا ﷺ کے انوار کی بارات اتری تو پھر کسی اور کو چے کا رخ نہ کیا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سیدنا حسان بن ثابت کے کاروانِ نعت گوئی کے رکن بن گئے۔ یہ وہ دور تھا جب نعت کو موقر اخبارات و جرائد تبرکاً اسلامی تقاریب کے موقعہ پر ہی جگہ دیتے تھے۔ ایک زمانہ غزل کی دُھن میں مست تھا۔ کرامت علی شہیدی، الطاف حسین حالی، امام احمد رضا خاں بریلوی، علامہ محمد اقبال



اور حفیظ جالندھری کی جاودانی شاعری جمالِ نعت سے دلوں کو مستنیر کر رہی تھی مگر عہدِ حاضر کو ایسے بلند آہنگ نعت گو کی ضرورت تھی جس کی آواز وقت کے بے کراں سناٹوں کے طلسم کو پارا پارا کر کے ”ورفعنا لک ذکرک“ کی تفسیر بن جائے۔ یہ سعادت غزل کے شہستانِ ہوس سے نعت کے گلزارِ مہکبار کی سمت عقیدت و شیفگی کی سوغات لے کر آنے والے حفیظ تائب کو بھی حاصل ہوئی، انہوں نے غزل کا رخ موڑ دیا اور حسنِ تغزل کے بربط سے نعت و مدحت کے قدسی زمزمے پھوٹ نکلے۔ عصرِ حاضر کی ترجمانی کرتے ہوئے نعت کے کوہِ فاران سے ایک صدائے دردناک ابھری۔

دے تبسم کی خیرات ماحول کو، ہم کو درکار ہے روشنی یا نبی

ایک شیریں جھلک ایک نوریں ڈھلک تلخ و تاریک ہے زندگی یا نبی

یہ صدِ حفیظ تائب کی تھی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے حفیظ تائب اور عہدِ حاضر لازم و ملزوم ہو گئے۔ حفیظ تائب نے اس شدتِ احساس کے ساتھ نعت گوئی کا پرچم سر بلند کیا کہ ہر غزل گو کا دل حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بارگاہِ قدس میں مدحت و توصیف کے گلاب نذر کرنے کے لئے مچلنے لگا۔ حفیظ تائب کی نعتیہ شاعری نے ایک زمانے کو متاثر کر دیا اور انتہائی قلیل مدت میں اس عظیم نعت گو کا نام بے شمار عشاقِ مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء کے دلوں کی دھڑکنوں میں آباد ہو چکا تھا۔ حفیظ تائب کا قلم ستائش کی تمنا اور صلے کی آرزو سے بے نیاز ہو کر اردو شاعری کو نعت و عقیدت کے نئے تقاضوں سے آشنا کر رہا تھا۔ حفیظ تائب کو بارگاہِ خداوندی سے عطا ہونے والی ان عظمتوں کے پس پردہ ان کی یہ دعا کارفرما تھی کہ

یارب ثنا میں کعبہ کی دلکش ادا ملے

فتنوں کی دوپہر میں سکوں کی ردا ملے

حسان کا شکوہ بیاں مجھ کو ہو عطا

تائیدِ جبرائیل بوقتِ ثنا ملے

آئے قضا شہیدیٰ خوش بخت کی طرح

دُوری میں بھی حضوریٰ احمد رضا ملے

جو مدحتِ نبیٰ میں رہا با مراد و شاد

اس کا روانِ شوق سے تائب بھی جا ملے

یہ دعا بارگاہِ ایزدی میں باریاب ہوئی۔ ”ورفعنا لک ذکرک“ کا غلغلہ بلند ہوا اور

صاحبِ تقدیر نے شہرتِ عام بقائے دوام کا تاج حفیظ تائب کے سر پر سجا کر انہیں دوسرے مدحت



نگاروں سے ممتاز کر دیا انکی انفرادیت کا ایک پر تو ممتاز محقق ڈاکٹر سید محمد عبداللہ مرحوم کے اس اقتباس میں نظر آتا ہے۔

”یہ تو ظاہر ہے کہ ہر صنف کی طرح نعت میں بھی ہر شاعر یا نعت گو کی ایک انفرادی آواز ہوتی ہے جو اسے دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔ حفیظ تائب کی نعت کی بھی ایک انفرادی آواز ہے جو عصر حاضر کے دوسرے نعت گوؤں سے اسے ممتاز کرتی ہے۔ یہ آواز ہے۔ وفور شوق و عقیدت۔ وہ لہجہ جو ادب و لحاظ کا پاسدار ہے۔ حفیظ تائب کی نعت کو پڑھ کر کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسا و صاف ہے جو حضور کے رو برو کھڑا ہے اس کی نگاہیں جھکی ہوئی ہیں اور اس کی آواز احترام کی وجہ سے دھیمی ہے مگر نہ ایسی کہ سنائی ہی نہ دے اور نہ ایسی اونچی کہ سوء ادب کا گمان گزرے۔ شوق ہے کہ اُٹھا آتا ہے اور ادب ہے کہ سمٹا جا رہا ہے۔“

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ نے حفیظ تائب کی نعت گوئی میں جس وفور شوق و عقیدت کو ان کی انفرادیت ٹھہرایا ہے اس کی ایک جھلک اس نعت میں ملاحظہ ہو۔

بادِ رحمت سنک سنک جائے  
وادی جاں مہک مہک جائے  
جب چھڑے بات نطق حضرت کی  
غنیچہ فن چنک چنک جائے  
ماہ طیبہ کا جب خیال آئے  
شب ہجراں چمک چمک جائے  
جب سمائے نظر میں وہ پیکر  
ذہن میرا دمک دمک جائے

اور پھر طائر گلستانِ توصیف حضورؐ بارگاہ سرور کائنات میں وفور شوق و عقیدت سے مغلوب ہو کر عظمتِ رسالتِ مآب ﷺ اور اپنی کم مائیگی کا یوں اعتراف کرتا ہے۔

خوشبو ہے دو عالم میں تری اے گل چیدہ  
کس منہ سے بیاں ہوں ترے اوصافِ حمیدہ  
تجھ سا کوئی آیا ہے نہ آئے گا جہاں میں  
دیتا ہے گواہی یہی عالم کا جریدہ

یہ گل چیدہ کون ہے کہ جس کی نکبت و نور کے حضور تائب نوا پیرا ہیں یہی تو گلزارِ توحید کا وہ گلِ یکتا ہے کہ جس کی خوشبوئے دل نواز نے کثافتِ آلود دلوں کو عرفانِ خداوندی کی لطافتوں سے آشنا



کر دیا ہے۔ اسی گلِ چیدہ کی مہک نے دلوں کے غنچے کھلا دیئے اور شدتِ الم سے گریہ کنایا انسانوں کو حیاتِ نو کی نوید بخش دی۔ یہی گلِ چیدہ محمد ﷺ بھی ہے اور احمد علیہ السلام بھی، طہ بھی ہے اور یسین بھی، مظہرِ انوارِ خدا بھی ہے اور محبوبِ مخلوق دوسرا بھی، باعثِ تکوینِ دو عالم بھی ہے اور قیامت کی لرزادینے والی ساعتوں میں شفیعِ اعظم بھی، جوازِ کاظہور بھی ہے اور ابد کا نور بھی۔ نعت کہتے ہوئے حفیظِ تائب کو ہر گام پر پہ احساسِ دامنگیر ہے کہ وہ جس ہستی والا صفات کے حضور عقیدتوں کا ارمغان لے کر حاضر ہو رہے ہیں وہ ان کی توصیف نگاری کی محتاج نہیں بلکہ شاعر اپنے کلام کو دوامِ بخشے اور اپنی نجات کا سامان ڈھونڈنے کے لئے اس محسنِ اعظم کی ثنا گوئی کر کے ہی ایمان کے تقاضوں کی بجا آوری کا شرف حاصل کر سکتا ہے۔ وہ اپنی اس خوش قسمتی پر یوں نازاں ہوتے ہیں۔

اپنی خوش بختی پہ تائب کیوں نہ مجھ کو ناز ہو  
کم نہیں سرکار کی مدحت سرائی کا شرف  
☆

دلِ محزون میں یادِ مصطفیٰ ہے  
اندھیرے میں چراغِ اک جل رہا ہے  
☆

کیا ہے نعت میں دیوانِ تائب  
مری بخشش کا ساماں ہو گیا ہے

حفیظِ تائب کے اردو نعتیہ مجموعے ”صلو علیہ وآلہ“، ”وسلمو تسلیما“، اپنے عنوانات کے لحاظ سے درودِ پاک کا حسن رکھتے ہیں کیونکہ شاعر کو احساس ہے کہ نعتِ درود ہی کا دوسرا نام ہے۔ نعت کہیے یا درود کہیے۔ خدا بھی اپنے محبوب ﷺ پر درود نازل فرما رہا ہے، فرشتے بھی یہی محسن ترین فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ انبیاء و رسل بھی اپنے اپنے ادوار میں درودوں کے پھول ان دیکھے نبی ﷺ کو نذر کرتے رہے۔ خدائے کریم اُمتِ مسلمہ کو بھی درود و سلام کا حکم دے رہا ہے گویا قدرت کی طرف سے ہمیں یہ باور کرایا جا رہا ہے کہ عشاقِ رسول اپنے آقا و مولا پر درود بھیج کر اپنے خالق کے حکم کی تعمیل ہی نہیں کر رہے بلکہ خدا کی سنت بھی بجالا رہے ہیں۔ حفیظِ تائب کی نعت گوئی درود و سلام کا حقیقی روپ ہے۔ سلطانِ دو عالم کی صفت و ثنا، آپ کی عظمت و سر بلندی کا تذکرہ، آپ کے حضور مناجات گزاری، آپ کے محاسنِ قدسی اور آپ کے جمال و کمال کا تذکرہ، آپ کی



صورت و سیرت کی جلوہ کاریاں، آپ کے کردار اور گفتار کی مہکباریاں۔ یہ سب کچھ وہ نعتوں میں بیان کر کے حکم خدا کی تعمیل کرتے ہوئے کس قدر نازاں ہیں اس کا اندازہ ان اشعار سے ہوتا ہے۔

منزل ذات کا تنہا رہو، صلی اللہ علیہ وسلم  
مطلع او ادنیٰ کا مہ نو، صلی اللہ علیہ وسلم  
توقیر انساں ٹھہری ہے تنویر امکاں ٹھہری ہے  
عرصہ حق میں اس کی تگ و دو، صلی اللہ علیہ وسلم

حفیظ تائب کی نعتوں میں عقیدت اپنی انتہا کو چھو رہی ہے۔ ہر گام پر احساس ہوتا ہے کہ حفیظ تائب مقام مصطفیٰ ﷺ کی رفعتوں سے باخبر ہیں اور جانتے ہیں کہ یہاں تو جنید و بایزید بھی دم بخود آتے ہیں۔ یہاں تو ملائکہ بھی ادب و احترام کی تجلیات کو دل و جان میں سمو کر محو طواف رہتے ہیں۔ وہ حضور ﷺ کی ثنا کرتے ہوئے اس حقیقت کو بحسن و خوبی مد نظر رکھتے ہیں کہ حضور ﷺ کعبہ خضریٰ کی نورانی چھاؤں میں آرام فرما ہو کر بھی اسی ادب و احترام اور عقیدت کے حقدار ہیں جیسا آپ حیاتِ ظاہری میں تھے۔ اسی لئے حفیظ تائب نے اپنی نعتوں میں عصرِ حاضر کے نعت گو شعراء کو بارگاہِ مصطفیٰ ﷺ میں عرض گزاری کے لئے ادب و احترام کے نئے نئے اسلوب عطا کئے ہیں۔ اس معاملہ میں ان کے پیش نظر قرآن حکیم کی آیات کا نور اور اصحاب رسول کا غیر معمولی جذبہ حسن ارادت جلوہ گر رہا ہے، انداز بدل بدل کر انہوں نے اپنی عقیدت آفرینی کی بدولت عشاقِ سرور کو نین ﷺ کے دلوں کو محبتِ محبوبِ خدا ﷺ کے آداب جس طور سکھائے ہیں ان کی تب و تاب سے دلوں کو منور کیجئے۔

ذہن میں رکھ آئیے لا ترفعوا اصواتکم  
بات کر طبعِ پیمبر کی نفاست دیکھ کر



شوق و نیاز و عجز کے سانچے میں ڈھل کے آ  
یہ کوچہ حبیب ہے پلکوں سے چل کے آ  
امت کے اولیا بھی ادب سے ہیں دم بخود  
یہ بارگاہِ سرور دیں ہے سنہل کے آ  
آتا ہے تو جو شہر رسالت مآب میں  
حرص و ہوا کے دام سے باہر نکل کے آ





قدموں میں شہنشاہِ دو عالم کے پڑا ہوں  
میں ذرہ ناچیز ہوں یا بخت رسا ہوں  
اے کاش ذرا دیر یہیں وقت ٹھہر جائے  
میں پیشِ رسولِ عربی نعت سرا ہوں



کاش طیبہ میں سکونت کا شرف مل جاتا  
دیکھتے روضہ سرکار کو آتے جاتے  
اس خنک شہر کو جاتی ہوئی اے نرم ہوا  
ساتھ لے جاوے جذبات بھی جاتے جاتے

بلاشبہ حفیظ تائب کی نعتیہ شاعری نے کاروانِ مدحت و نعت کے مسافر ان خوش بخت کے قدموں کی رفتار کو تیز تر کرنے کے لئے موثر راہنمائی کا کردار ادا کیا ہے۔ وہ راہنما جو امت مسلمہ کو جگانے کے لئے عظمتِ مصطفیٰ ﷺ اور شوکتِ اسلاف کے ترانے بھی الاپتا ہے دورِ حاضر میں امت مسلمہ کی بیچارگی کی دلدوز کیفیت بھی بیان کرتا ہے اور ماضی اور حال کے حوالے سے وہ پُر شکوہ دورِ استقبال کی دعا کرتا ہے۔ حفیظ تائب کی آواز غزل کے خوگر شعراء کے دلوں کو جھنجھوڑتی رہی، حجاز کی چھاؤں میں سایہ خنک تلاش کرنے والوں کو شافعِ روزِ محشر کے دامانِ شفاعت تلے پناہ ڈھونڈنے پر آمادہ کرتی رہی۔ چونکہ تائب نے خود غزل سے نعت کی طرف اپنا سفر مکمل کرنے کے لئے برسوں کی تڑپ اور بے شمار شب و روز کی کسک بارگاہِ حضور ﷺ میں نذر کی تھی اس لئے ان کے دل سے جو بات نکلی وہ روحانیت کے دوش پر پرواز کرتی ہوئی لاتعداد دلوں کو متاثر کر گئی۔ تائب نے جو کہا دل سے کہا۔ جو لکھا دل سے لکھا۔ اپنے کردار کی وسعتوں کو سیرتِ حضور ﷺ کی اتباع سے جلوہ ریز کیا۔ ان کی نعت گوئی ریاکاری سے پاک مصلحت سے بے نیاز اور داد و تحسین سے بے نیاز رہی۔ یہ علیحدہ امر ہے کہ داد بھی ملی اور اہل نظر نے قلب کی تمام تر فراخی کے ساتھ اسے تحسین کا مستحق بھی ٹھہرایا۔ ماضی حال اور مستقبل کے تناظر میں بات کرنا حفیظ تائب کی نعت گوئی کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ ایک نظریاتی گھرانے کے چشم و چراغ سے یہی توقع کی جاسکتی ہے۔ تاریخ پر گہری نظر، سیرتِ مصطفیٰ ﷺ کا عمیق مطالعہ، خصائصِ حضور ﷺ سے باخبری اور مسلمانوں کے حق میں حالات کی ستم کاری نے حفیظ تائب کے قلم کو امت اسلام کا ترجمان بنا



دیا۔ تڑپتے بھی ہیں اور تڑپاتے بھی ہیں، روتے ہی نہیں رلاتے بھی ہیں۔ آمدِ حضور ﷺ کا استقبال کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

سکہء حق چلانے حضور آ گئے  
نقشِ باطل مٹانے حضور آ گئے  
معصیت کے عذابِ المناک سے  
آدمی کو چھڑانے حضور آ گئے

اور پھر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وسیلے سے شوکتِ ماضی کا ایک انداز ملاحظہ ہو۔

اسلوبِ زندگی کا ہوا دلکش و حسین  
امن و سلامتی کا علم دار آ گیا  
سلجھیں تمام گیسوئے حکمت کی الجھنیں  
جب دہر میں وہ کاشفِ اسرار آ گیا  
گم گشتگانِ راہ نے پایا سراغِ زیست  
میر حجاز و قافلہ سالار آ گیا  
دم توڑتی حیات کی نبضیں سنبھل گئیں  
تقدیر کے ستاروں کی راہیں بدل گئیں

اُمتِ مسلمہ کا زوال دیکھ کر حفیظِ تائب کے دلِ مضطر کی تڑپ دیکھئے۔

پھر اٹھا ہاتھ بہرِ دعا یا نبی  
شاد ہو جائے خلقِ خدا یا نبی  
پھر سرفراز ہو اُمتِ آخریں  
ختم ہو یورشِ ابتلا یا نبی  
حرمتِ خونِ انساں ہو سب پر عیاں  
پھر چلے خیر کا سلسلا یا نبی



دل کو مرے تڑپانے لگی پستی اُمت  
جوں جوں مجھے یاد آنے لگی رفعتِ مولیٰ





اس شاہ کی اُمت ہوئی محتاجِ زمانہ  
ہر نعمتِ کونین ہے جس شاہ کا صدقہ  
یہ حالِ زبوں اُمتِ مرحوم کا یارب  
اب شاعرِ سرکار سے دیکھا نہیں جاتا  
پھر ملتِ بیضا کو سرافرازِ جہاں کر  
اب پھیر دے ماضی کی طرف چہرہ فردا

حفیظ تائب کا بہت بڑا اعزاز یہ ہے کہ انہوں نے نعت کو اُسوۂ حضور ﷺ کا ترجمان بنا کر اسے تبلیغِ دین کا ذریعہ بنادیا۔ اُسوۂ مصطفیٰ ﷺ تاریخِ اسلام میں اکمل ترین ضابطہٴ حیات ہے حضور سرورِ کائنات ﷺ کے لازوال کردار نے عرب کے جاہل بدوؤں کو زمانے بھر کے مقدر کا مالک بنادیا۔ آپ نے اخلاق و محبت کی دولت اس طرح لٹائی کہ سفاک ترین انسان بھی آپ کے قدموں پہ جھک گئے۔ آپ نے پتھر کھا کر پھول برسائے۔ خون کے پیاسوں کو رحمت کی قبائیں عطا کیں۔ جان کے دشمنوں کو سینے سے لگا لیا۔ معمولی باتوں پر جنگ و جدل کا بازار گرم کرنے والوں کے دل آپس میں ملا دیئے۔ آپ نے ظلم و تشدد کے خوگر صحرائِ نشینوں کو خلق و مروت کا پیکر بنادیا۔ سب سے بڑھ کر آپ نے اُمتِ مسلمہ کو عظمتِ حیات کا لازوال منشور دیا۔ یہ منشور حیات آپ کے کردار کی رفعتوں سے عبارت ہے۔ حفیظ تائب کی تاریخ پر گہری نظر ہے وہ ایک سچے اور کھرے مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ تحقیقی شعور سے بھی بہرہ ور ہیں۔ انہوں نے حضور ﷺ کی ذات کو حسنِ عقیدت کے حوالے سے بھی دیکھا ہے اور سیرت و کردار کی میزان پر بھی پرکھا ہے اور وہ اس حقیقت سے آشنا ہوئے ہیں کہ سیرتِ مصطفیٰ ﷺ کو شمعِ راہ بنا کر نہ صرف عظمتِ اسلاف کے افسانے دہرائے جاسکتے ہیں بلکہ اقوامِ عالم کی راہنمائی کا اعزاز بھی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ حفیظ تائب سیرتِ حضور ﷺ کے انوار سے کس طرح ایوانِ نعت کو جگمگاتے ہیں اس کی ایک جھلک دیکھئے۔

اعتبارِ نطق ہے گفتارِ خیر الانبیاء  
نو بہارِ خلق ہے کردارِ خیر الانبیاء  
مشعلِ راہِ ہدایت آپ کی شرعِ متین  
ہیں دو عالم کو محیطِ انوارِ خیر الانبیاء





اعزاز یہ سرکار کی سیرت کے لئے ہے  
ہر دور میں انساں کی ہدایت کے لئے ہے  
ہے پیش نظر اُسوۂ پیغمبر آخر  
ساماں یہ بہم فکر کی رفعت کے لئے ہے



رنگِ فطرت آپ کے فیضان سے نکھرا حضور  
آپ کی آمد سے پہلے کب یہ نقشہ تھا حضور  
آپ کا دینِ حیات آموز جب پھیلا حضور  
مٹ گئی یکسر تمیز بندہ و آقا حضور



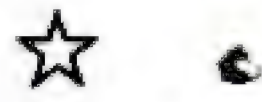
اے سرورِ دیں نور ہے یکسر تری سیرت  
اقدار کو کرتی ہے منور تری سیرت  
یا خیر کا معمورۂ پُر نور و معنبر  
یا حُسن کا معراج سمندر تری سیرت

حفیظ تائب اس حقیقت سے بدرجہ اتم آگاہ ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے جمال  
جہاں آرانے بھی اذہان کو تسخیر کرنے میں کچھ کم کردار ادا نہیں کیا۔ کفار کی ایک بڑی تعداد آپ کے  
حُسن کی تابانیوں میں کھو کر آپ پر ایمان لے آئی کہ اتنا حسین و جمیل رُخ اقدس کسی ساحر یا جھوٹے  
کا نہیں ہو سکتا بلکہ اس نبیِ محترم کا جمال بے مثال خود اس کے صادق القول ہونے کی نشانی ہے یہ  
چہرہ تو سینہ شبِ تارِ است سے پھوٹنے والے نور کی جلوہ گری ہے۔ یہ رُخ والضحیٰ تاریخِ انسانیت  
کے سب سے سچے انسان کا چہرہ ہے۔ صبحِ فطرت اس چہرے پر تصدیق ہو کر اپنا نور مستعار لینی تھی۔  
چاند سورج اسی کی چوکھٹ پر پابوسی کرتے ہوئے تابانیوں کے حقدار ٹھہرتے تھے۔ یہ محبوبِ خلّاق  
ہی کا نہیں بلکہ محبوبِ خدا کا جمال ہے۔ خلّاقِ دو عالم کی عظمتِ تخلیق کی جلوہ آرائی ہے۔ جب شاعر  
کا قلم حسن و جمالِ مصطفیٰ ﷺ کی جلوہ افروزیوں میں کھونے لگتا ہے تو نکبت و نور کی برسات کا  
سماں ہوتا ہے۔ لافانی کیف و سرور کی وادیاں مہکنے لگتی ہیں۔ محبوبیتِ مصطفیٰ کا تصور اپنے کمال سے  
ہمکنار ہونے لگتا ہے۔ انوار کی رم جھم کے برسنے اور شاعر کے قلمِ نور میں غوطہ زن ہونے کا وقت  
آنے لگتا ہے۔ ان کیفیات سے حفیظ تائب اس شان سے گزرے کہ اپنے قلم کی معجز بیانی سے ایک



زمانے کو اپنے ہمراہ جادۂ شوق کا راہی بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ جمال حضور ﷺ کی طلعتوں میں گم ہو کر حفیظ تائب نے شریعت کے تقاضوں کو فراموش نہیں کیا۔ عشق و عقیدت کے وفور کا عالم ہو تو راہوار شوق کے ٹھوکر کھانے کا گماں ہوتا ہے مگر حفیظ تائب اس مرحلہ ذوق و شوق سے بھی سرخرو ہو کر گزرے۔ جمال محبوب خدا کو اپنے وجدان کا حصہ اس طرح بنایا کہ عصر حاضر کو اپنی ترجمانی کے لئے ان کی نعت گوئی کی صورت میں آئینہ خانہ میسر آ گیا جس پر جب بھی ایک نظر ڈالیں تو دل و جان بے اختیار پکار اٹھیں کہ حفیظ تائب نے فقط اپنے لئے نہیں لکھا بلکہ ہم سب کی ترجمانی کر دی ہے۔ ایک جھلک دیکھئے۔

نشاطِ روح خیالِ محمد ﷺ عربی  
بہارِ زیست جمالِ محمد ﷺ عربی  
جنہیں بنا کے مصور بھی آپ ہے مسرور  
وہ نقش ہیں خدو خالِ محمد ﷺ عربی



مہرِ ہدیٰ ہے چہرہ گلوں حضور کا  
اک سروِ نور ہے قدِ موزوں حضور کا  
جس کے لئے شفاعتِ اُمت کا تاج ہے  
لا ریب ہے وہ فرقِ ہمایوں حضور کا



مرکزِ میرے فکر کا وہ مکی محبوب  
فطرت کی رعنائیاں ہیں سب جس سے منسوب  
جس کا راس المال ہے مولا کا عرفان  
وہ طالبِ اللہ کا اور اس کا مطلوب



چہرہ زیست کا ضو حسنِ پیمر کی جھلک  
چشمِ ہستی کی دُعا بدرِ دجی کے جلوے  
واضحیٰ روئے منور ہے تو واللیل ہے زلف  
ان کے فیضان سے ہیں صبح و مسا کے جلوے



حفیظ تائب نے نعتِ حضور ﷺ کے گلرنگ راستے پر طویل سفر کیا ہے۔ اس سفر کا ایک ایک لمحہ لازوال اور ایک ایک ساعت جاوداں ہے۔ مدحت و نعتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس سفر یادگار میں وہ ایسی کیفیات سے دوچار ہوئے جن کا اجمالی جائزہ ہم اپنے مضمون میں لے چکے ہیں۔ نعت کا سفر کبھی ختم نہیں ہوتا۔ یہ تو ازل سے جاری و ساری ہے اور شامِ ابد کو بھی اس سفر کی سعادت سے بہرہ ور ہونے والے شاد کاموں کا تذکرہ ہو رہا ہوگا۔ آہستہ آہستہ حفیظ تائب کا ذہن اور فکر وجدانی کیفیت سے دوچار ہو رہے ہیں۔ وجدانی کیفیت کہ جہاں عشرتِ قطرہ دریا میں فنا ہو جانے کا نام ہے۔ وجدانی کیفیت کہ جب شاعر شمعِ محفل کی طرح سے سب سے الگ ہو کر محبوبِ خدا ﷺ کے جلووں میں گم ہونے کا تمنائی بنتا ہے۔ اب یہ وہاں پر ہیں کہ جہاں اپنا وجود بھی نورانی ماحول میں تحلیل ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ حضرت احمد ندیم قاسمی نے بھی کچھ ایسے ہی تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ یوں تو حفیظ تائب کا تمام تر نعتیہ کلام وجد آفریں ہے مگر نعتیہ قصیدہ کہتے ہوئے ان پر جو وجدانی کیفیت طاری ہوتی ہے وہ اپنا جواب آپ ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے شاعر محبوبِ خدا اور اپنے مرکز فکر کے حضور حاضر ہے اور ان کی مدح میں انہی کیفیات کا دفور ملاحظہ کیجئے۔

لب کھلے جب نبیؐ کی مدحت میں  
پھول کھلنے لگے طبیعت میں  
پائی ہر تلخیِ الم سے نجات  
کھو کے تذکارِ شہ کی لذت میں  
آپ کی یاد نے سکوں بخشا  
میں گھرا جب کسی مصیبت میں  
آپ کا چہرہ ماہتاب بنا  
میری ہر ایک شامِ عسرت میں



بارگاہِ پاک میں پہنچے صدا کرتے ہوئے  
مدعا پایا ہے عرضِ مدعا کرتے ہوئے  
تھام کر دامن کو ان کے بے محابا رو دیا  
میں کہ گھبراتا تھا ان کا سامنا کرتے ہوئے





ہیں جس کی خاک میں آسودہ رحمتِ عالم  
وہی دیار بنے میرا مستقر اے کاش  
سفرِ عدم کا جو درپیش ہو مجھے تائب  
دیارِ نور کی خوشبو ہو ہم سفر اے کاش

یہ کہنا اعترافِ عظمت ہی نہیں بلکہ اعترافِ حقیقت بھی ہے کہ حفیظ تائب عہد  
آفریں نعت نگار ہے اور نعت گوئی کے فروغ و ارتقا میں اس کا ناقابلِ فراموش حصہ ہے۔ یہ وہ  
چراغِ ایوانِ مدحت حضور ﷺ ہے کہ جس کی فکر اور تڑپ اندازِ نعت گوئی کا حصہ بنتی ہے تو پھر ہر  
آنے والا دور حفیظ تائب کی خوش بختیوں کے ساتھ لازم و ملزوم ہونے لگتا ہے۔ ہم بھی حفیظ تائب  
کے ہم نوا ہو کر بارگاہِ رسالت مآب میں اپنے داخلی اور خارجی کرب و الم کا ماجرا عرض کرتے ہوئے  
اس تحریر کو انجام پذیر کرنا چاہتے ہیں کہ

پُر کرے گا کون روحوں کے خلا، یا مصطفیٰ ﷺ  
تیری چشمِ لطف و رحمت کے سوا، یا مصطفیٰ ﷺ  
دہر میں پھر اہلِ دیں کو سرفرازی ہو نصیب  
لوٹ آئے دورِ عدل و خیر کا، یا مصطفیٰ ﷺ





گلزارِ مدحت کی بہارِ لازوال

## محمد اعظم چشتی

یہ کوئی بھی نہیں جانتا کہ خوش بختی کا تاج ہمایونی کب کسی کے سر کی زینت بن جائے۔ شہرت اور ناموری کی آرزو تو بے شمار انسانوں کے دلوں میں مچلتی ہے مگر یہ عظمت اسی کا مقدر بنتی ہے جس پر خالق تقدیر مہربان ہو جائے۔ عصرِ حاضر کے نمائندہ شاعر اور صاحبِ اسلوب نعت گو اور نعت خواں محمد اعظم چشتی کا شمار ان معید بخت افراد میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی حیات مستعار ہی میں غیر معمولی شہرت اور ہر دلعزیزی کو قدموں کی بلائیں لیتے دیکھا۔ آج انہیں اس دنیائے فانی سے کوچ کئے کتنے ہی برس بیت گئے مگر جب بھی افکارِ بوجھل ہونے لگتے ہیں تو ان کا یہ نعتیہ شعر یکبارگی قلب و جان کو روحانی فرحت اور ایمان کی تازگی عطا کر جاتا ہے۔ کہ

سمجھا نہیں ہنوز مرا عشق بے ثبات

تو کائناتِ حسن ہے یا حسنِ کائنات

محمد اعظم چشتی نعت خوانی کا ارمغان لے کر محافلِ نعت میں طلوع ہوئے۔ بے پناہ داد پائی۔ طبعِ موزوں نے اپنا رنگ دکھایا مقدر کا ستارا جگمگایا تو نعت گوئی ان کا مقدر بننے لگی۔ واقعی یہ بڑے ہی کرم کے فیصلے ہیں اور بلاشبہ نصیب کی سر بلندی کی بات ہے کہ جب نعت لکھی تو زمانے بھر کو چونکا دیا۔ ایک تو پہلے ہی ان کی نعت خوانی کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ عوام الناس اور اصحابِ علم و ادب یکساں طور پر آپ کی خداداد صلاحیتوں کے قائل تھے۔ آپ کی نعت گوئی سونے پر سہاگہ ثابت ہوئی۔ آپ کا بے مثال لحن، کمال صوت، حسنِ ادا، مخصوص لے اور آواز کا اتار چڑھاؤ۔ اللہ رے اتنی بلندی اور یہ عظمت پہلے کسی کا مقدر بنی اور نہ ہی ابھی تک کوئی ایسی شخصیت منصہ نعت پر جلوہ گر نظر آتی ہے جسے اعظم چشتی جیسا کہہ سکوں۔ اس انفرادیت کا کمال یہ ہے کہ آپ کی نعت خوانی تو آپ کو محبوبِ خلّاق بنا گئی تھی۔ اوپر سے نعت گوئی کی سعادت بھی اس شان سے عطا ہوئی کہ ایک طرف آواز پر مرنے والے اور دوسری طرف نعت کے مرتبہ شناس یکساں طور پر چونک پڑے۔ آج کا دور درحقیقت دورِ نعت ہے مگر ایسا کہاں سے لائیں جو نعت خوانی اور نعت گوئی کو اپنا



اعزاز بنا کر مدتوں اصحاب ایمان کے دلوں کی دھڑکن میں سمایا رہا ہو۔ اعظم چشتی اس فخر کا کس طور اظہار کرتے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے۔

کیوں نہ ہو صاحب ایمان محمد اعظم  
ہے گدائے درِ حسان محمد اعظم  
میری تربت کے سرہانے یہ لکھانا لکھ کر  
تھا محمد ﷺ کا ثنا خوان محمد اعظم

محمد اعظم چشتی نعت گوئی کے لیے سیدنا حسان ثابت کا قرینہ مانگتے ہیں۔ وہی سیدنا حسان جو شاعر دربارِ رسول تھے۔ جنہیں حضور ﷺ کی خوشنودی اس طرح نصیب ہوئی کہ منبرِ رسول پر کھڑے ہو کر نعت سناتے رہے۔ اعظم چشتی نعت کو عبادت بھی سمجھتے ہیں اور سعادت بھی۔ عبادت ان معنوں میں کہ توصیف مصطفیٰ ﷺ کا حکم ربِ دو عالم نے دیا ہے اور سعادت ان معنوں میں کہ یہ نعمتِ عظمیٰ ہر کسی کا مقدر نہیں بنتی۔ انہیں ہر گام پر احساس ہوتا ہے کہ وہ جس کی نعت کہہ رہے ہیں۔ خدا خود اس کا ثنا خوان ہے۔

منم ادنیٰ ثنا خوان محمد ﷺ  
غلامے از غلامان محمد ﷺ  
نہ تنہا ہست اعظم نعت خوانش  
خدائے ما ثنا خوان محمد ﷺ

جب اعظم چشتی دیکھتے ہیں کہ خدا خود ثنا خوان محمد ﷺ ہے اور جملہ ملائکہ و مخلوقاتِ عالم ثنا خوانِ حضور ہیں۔ ہر صاحبِ نظر کی تمنا ہے کہ اس کی نعت بارگاہِ رسول میں مقبول ہو جائے تو پھر انہیں اپنی ثنا خوانی پر ناز ہونے لگتا ہے کہ وہ بھی اس خوش بخت قافلے کے رکن ہیں۔ جس کے قائد اول سیدنا حسان بن ثابتؓ اور کعب بن زہیر جیسے عظیم المرتبت نعت گو تھے۔ یہ احساس انہیں اپنی خوش بختی کا اظہار کرنے کا سلیقہ عطا کرنے لگتا ہے۔

دی زباں حق نے ثنائے مصطفیٰ کے واسطے  
دل دیا حبِ حبیبِ کبریا کے واسطے  
کتنا بڑا ہے مجھ پہ یہ احسانِ مصطفیٰ  
کہتے ہیں لوگ مجھ کو ثنا خوانِ مصطفیٰ



نعت گوئی بعد کی بات سہی مگر ان کی نعت خوانی تو پانچ دہائیوں سے بھی زیادہ عرصہ پر محیط ہے۔ پھر ان کے بارے میں زیادہ کیوں نہیں لکھا گیا؟ ان کے بارے میں تو بڑے بڑے اساتذہ فن نے اظہار خیال کیا ہے۔ انہوں نے تمام ترفنی اور شعری بلندیوں کے باوجود ”حسانِ پاکستان“ کہلوانا پسند نہیں کیا۔ اس معاملے میں وہ بڑی حد تک حق بجانب تھے۔ حضرت حسان بن ثابتؓ تو ایک ہی تھے۔ اگر ہر ملک خطہ اور پھر ہر شہر میں ایک حسان ہونے لگے تو نعت کے تقدس کا کیا بنے گا۔ یہاں تو سرکارِ عالم ﷺ کی ثنا خوانی ہی سب سے بڑی دولت ہے اور حضرت حسانؓ کے کاروانِ نعت گوئی کا رکن کہلانا ہی بہت بڑا اعزاز ہے چہ جائیکہ کہ کوئی نعت خواں سیدنا حسانؓ ثابتؓ کی نسبت سے اپنے لیے کوئی خطہ مخصوص کر لے۔ ہم نے یہ عرض اس لیے کی ہے کہ ریکارڈ پر رہے کہ حضرت اعظم چشتی اس تہمت سے بری تھے جبکہ ان کے معاصرین کئی شعراء اس لقب کے حصول کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔

ان کی شاعری کا مطالعہ فوراً اس حقیقت سے آشنا کرتا ہے کہ انہوں نے اپنے اکابرینِ نعت سے خوب خوب اکتاب فیض کیا ہے۔ امام نعت گویاں شاہ احمد رضا خاں کہتے ہیں۔

واہ کیا جود و کرم ہے شہِ بطحا تیرا

نہیں سنتا ہی نہیں مانگنے والا تیرا

محمد اعظم چشتی کہتے ہیں۔

ایسا کوئی محبوب نہ ہو گا نہ کہیں ہے

بیٹھا ہے چٹائی پہ مگر عرش نشیں ہے

ملتا نہیں کیا کیا دو جہاں کو ترے در سے

اک لفظ نہیں ہے کہ ترے لب پہ نہیں ہے

اور پھر اسی نعت میں مقاماتِ رسول ﷺ کی سر بلندیاں ملاحظہ کیجئے۔

تو چاہے تو ہر شب ہو مثالِ شبِ اسریٰ

تیرے لیے دو چار قدم عرش بریں ہے

رکتے ہیں، یہیں آ کے قدمِ اہلِ نظر کے

اس کوچے سے آگے نہ زماں ہے نہ زمیں ہے

نعت گوئی میں سوز و گداز کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ جس طرح پروانہ شمع پر نثار ہونے کو



معراجِ حیات سمجھتا ہے۔ اسی طرح عاشق رسول بھی اپنے آقا و مولا ﷺ کی محبت میں پروانہ دار جلنے کو بے قرار رہتا ہے۔ وہ غیر معمولی اضطراب اور بے قراری و بے چینی سے دوچار ہوتا ہے۔ اس کی فکر سلطانِ دو عالم ﷺ کے جلوؤں میں گم رہتی ہے اور اس کے قلم کی نوک سے ایسے اشعار ٹپکتے ہیں۔ جو ہر قلبِ مضطر کی نوا بن جاتے ہیں۔ محمد اعظم چشتی نے بھی اسی سوز و گداز اور والہانہ پن کو ہر آن محسوس کیا ہے۔ ان کے تخیلات بھی یادِ حضور سے آباد رہتے ہیں۔ خود بھی تڑپتے ہیں اور اپنی یادگار نعتیہ شاعری کی بدولت ایک زمانے کو تڑپانے کا فکری سامان بھی مہیا کرتے ہیں۔

پیار ان کا اگر حاصلِ ایماں نہ بنے گا  
مومن تو بڑی بات ہے انساں نہ بنے گا

تشنگی روحِ دو عالم کی بجھانے والا  
جوئے رحمت بھی ہے اور ابرِ گہر بار بھی ہے  
اعظم اس پیکرِ رحمت سے ہے نسبت مجھ کو  
درد مندوں کا جو مونس بھی ہے غمخوار بھی ہے

کس کی تجلیات سے خیرہ ہے چشمِ آفتاب  
کھوئی گئی ہے کائنات کس کے تصورات میں  
مٹ گئے اک نگاہ سے تیری جہاں کے وسوسے  
ڈوبا ہوا ہے فلسفی اب بھی توہمات میں

یہ حقیقت پوری کائنات پر اظہر من الشمس ہے کہ حضور اس کائنات میں رب کریم کا سب سے بڑا احسان بن کر تشریف لائے۔ آپ کی آمد سے قبل عالمِ انسانیت ظلم و تشدد اور وحشت و بربریت کے اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا۔ دور دور تک انسانی اقدار کی معمولی سی روشنی بھی نظر نہیں آتی تھی مگر حضور ﷺ کی بعثتِ قدسی سے گلستانِ انسانیت پر بہار آ گئی اور راہِ انسانیت سے بھٹکے ہوئے انسان دامنِ محمد ﷺ سے وابستہ ہو کر خود آگاہی اور خدا شناسی کے آداب سکھانے لگے۔ اس لیے وہ احساناتِ مصطفیٰ ﷺ کا تذکرہ کرتے نہیں تھکتے وہ عالمِ انسانیت کو یہ حقیقت بھی باور کرانا چاہتے ہیں کہ ہم فقط اسوۂ حضور ﷺ پر عمل پیرا ہو کر اور آپ کی غیر مشروط اطاعت کر کے ہی



کونین میں مکمل سرخروئی کا تصور کر سکتے ہیں۔ محمد اعظم چشتی بعثتِ مصطفیٰ ﷺ سے قبل کا نقشہ بیان کرتے ہیں۔

تمہارے آنے سے پہلے کیا تھی ہمارے صبح و مسا کی صورت  
نہ کوئی مونس نہ کوئی ساٹھی پڑے تھے ہم نقش پا کی صورت  
ہزار ہا سال اہل دل نے ستم اٹھائے ستم گروں کے  
نہ کوئی آیا بہ جز محمد ﷺ جہاں میں مشکل کشا کی صورت

بگڑے ہوؤں کو کس نے سنوارا ترے بغیر

ڈوبے ہوؤں کو کس نے ابھارا ترے بغیر

انسانیت کا درس ملا تیری ذات سے

بے نور تھا خرد کا ستارا ترے بغیر

اور حضور ﷺ کے احسانات کا تذکرہ کرتے کرتے ”تحدیثِ نعت“ کے نام پر حضور ﷺ

سے محبت اور کامل اطاعت کا پیغام دیتے ہیں تاکہ عصرِ حاضر کا مسلمان پھر سے عشقِ سرورِ کونین ﷺ کے جادۂ رحمت کا راہی بن جائے۔

سچ ہے عمل ہی قبر کا سرمایہ ہے مگر

افضل ہے ہر عمل سے محبت رسول کی

ظاہر ہے صاف صاف اطیعوا الرسول سے

محبوب ہے خدا کو اطاعت رسول کی

اور پھر اسی کیفیت میں اعظم چشتی بارگاہِ رسالت مآب میں استغاثہ پیش کرتے ہیں۔ اپنے رنج

و آلام کا فسانہ نبی محتر ﷺ کی نذر کرتے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہمارے آنسو بارگاہِ حضور

میں قبول ہو گئے تو جو ہر بے بہا بن جائیں گے۔ اگر ہماری فریاد کی پُراثر لے پر حامی بے کساں کو

پیارا آ گیا تو ہمارا بگڑا ہوا مقدر سنور جائے گا۔ اس ضمن میں وہ ذاتی رنج و آلام کا ماجرا بھی سناتے

ہیں اور اُمتِ اسلام کے اجتماعی آلام بھی گدِ خضر کے مکین کی نذر کرتے ہیں۔ وہ بجا طور پر سمجھتے

ہیں کہ بات فقط حضور ﷺ کی چشمِ کرم کی ہے۔ اک بار آپ کی چشمِ کرم بار کا اشارا ہو گیا تو اُمتِ

اسلام کی زوال پذیری عروج و اقبال میں بدل جائے گی۔ ان کی کیفیت ملاحظہ کیجئے۔

ہم ہیں بے یار و مددگار رسولِ عربی

جز ترے کون ہو غم خوار رسولِ عربی



تلملاتے ہیں، تڑپتے ہیں شب و روز غریب  
جن کو ہے تجھ سے ذرا پیار رسول عربی  
کرم یا رحمتہ للعالمین یا شافع محشر  
کہ ہے خالی عمل سے میرا داماں یا رسول اللہ  
دکھاتا پھر رہا ہوں کب سے ان سینے کے داغوں کو  
سلے گا کب مرا چاک گریباں یا رسول اللہ

معروف دانشور کوثر نیازی محمد اعظم چشتی کے فنِ نعت پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں۔  
”ایسی ہستیاں انگلیوں پر گنی جاسکتی ہیں جنہیں شاید قدرت روزِ ازل ہی سے اس سعادت  
کے لیے نامزد کر رکھا تھا اور میں پورے وثوق اور شرح صدر کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اعظم چشتی کا  
نام بھی انہی خوش نصیبوں میں شامل ہے۔ اعظم چشتی کی نعتوں کا مطالعہ کیا جائے تو ان میں عشق بھی  
نظر آئے گا اور علم بھی، جذبے کی گیرائی بھی ہوگی اور فن کی گہرائی بھی۔ وہ اپنی نعتوں میں بے  
تکلف قرآنی آیات دینی اصطلاحات اور تصوف کے اشارات و کنایات استعمال کر جاتا ہے اور  
اس کے باوجود شعریت کی روح برقرار رہتی ہے۔ وہ نعت کے لیے غزل کا پیرایہ استعمال کرتا ہے  
مگر شریعت کا مزاج برہم نہیں ہوتا۔“ نیر اعظم کے دیباچے سے ایک اقتباس

حضور ﷺ نور ہیں۔ بلکہ نور علی نور ہیں۔ احادیث شاہد ہیں کہ خدائے کائنات نے سب  
سے پہلے آپ کا نور تخلیق کیا اور پھر اسی نور سے تمام کائنات بنائی۔ نعت گو شعراء نے اپنی نعتوں میں  
آقا و مولانا ﷺ کے نورانی جلوؤں اور آپ کی بے مثال نورانیت کو بطور خاص اپنا موضوعِ سخن بنایا  
ہے۔ اس ضمن میں محمد اعظم چشتی کا والہانہ پن بھی دیکھنے کے قابل ہے۔ زیادہ مثالیں کیا دوں۔  
ان کی ایک ہی نعت کے چند اشعار دیکھئے اور انوارِ معلیٰ ﷺ کی جلوہ گری کا نظارہ کیجئے۔

گزرا وہ جدھر سے ہوئی وہ راہ گزر نور  
اس نورِ مجسم کی ہے ہر شام و سحر نور  
لب نور دہن نور، زباں نور بیاں نور  
دل نور جگر نور جبیں نور نظر نور  
نسبت ہوئی جس کو تری خاکِ کف پا سے  
وہ شہر وہ کوچہ وہ درو بام وہ گھر نور  
جس صبح اُتارا گیا وہ چاند زمیں پر  
وہ ماہ وہ دن نور وہ ساعت وہ شجر نور

محمد اعظم چشتی نے اپنی نعتیہ شاعری میں فکر و فن کی وہ بلندیاں دکھائی ہیں کہ پڑھنے والا



حیرت میں کم ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات وہ اتنی بلندی فکر اور رعنائی خیال کو چھوٹے نظر آتے ہیں کہ ان کے کلام پر علامہ اقبال اور ظفر علی خاں کی قادر الکلامی کا گمان ہونے لگتا ہے۔ اعظم چشتی محض تقاریب کے نعت خواں نہ تھے۔ وہ پختہ فکر شاعر علمی تدریسی دینی اور روحانی بلندیوں سے بہرہ ور تھے۔ فارسی اُردو اور پنجابی زبانوں پر یکساں گرفت رکھتے تھے۔ بعض اوقات یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ وہ کس زبان میں زیادہ مہارت فکر اور ندرت بیان کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ ایک زمانہ نعت گوئی کے حوالے سے ان کا ہم نوا رہا ہے۔ ہم چند ایسے اشعار پیش کر رہے ہیں جن میں ان کی بلند خیالی اپنی معراج کو چھوٹی ہوئی محسوس ہوتی ہے مگر کیا مجال کہ کہیں شریعت ادب یا احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے پائے۔

حسنِ حبیبِ دو جہاں یوں ہے تصورات میں  
جیسے ظہورِ ماہتابِ غم کی اندھیری رات میں  
کس کی تجلیات سے خیرہ ہے چشمِ آفتاب  
کھوئی گئی ہے کائنات کس کے تصورات میں

سمجھا نہیں ہنوز مرا عشقِ بے ثبات  
تو کائناتِ حسن ہے یا حسنِ کائنات  
اب تک بھی ہوئی ہے ستاروں کی انجمن  
اس انتظار میں کہ پھر آئیں وہ ایک رات  
اک خالقِ جہاں ہے تو اک مالکِ جہاں  
خالق کے بعد کیوں نہ مکرم ہو تیری ذات  
جو ذکرِ زندگی کے فسانے کی جان ہے  
وہ تیرا ذکرِ پاک ہے اے زینتِ حیات

کتنی گستاخ ہے نگاہِ خیال  
ڈھونڈنے جا رہی ہے ان کی مثال  
دیکھئے میری عجزِ طبع کا حال  
ان کے ابرو کو کہہ رہا ہوں ہلال  
جو بھی ذرہ اڑا ستارہ بنا  
اللہ اللہ گردِ رہ کا جلال



معراج رسول ﷺ وہ عظیم ترین معجزہ ہے جس سے حضور ﷺ کی بارگاہ خداوندی میں غیر معمولی مقبولیت کا احساس ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زبان اور ہر دور کے نعت گو شعراء نے معراج حضور پر نظم اور نثر میں بہت کچھ لکھا ہے اور یہ سلسلہ تا ابد جاری رہے گا۔ ہر شاعر معراج مصطفیٰ ﷺ کی بلندیوں کو اپنے اپنے زاویہ نگاہ سے دیکھتا ہے۔ محمد اعظم چشتی کو رب کو نین نے عشق و عقیدت سے بھر پور دل عطا کیا یہی وجہ ہے کہ آپ معراج رسول کا ذکر کرتے ہیں تو آپ اپنی فکری نظری اور شعری سرفرازیاں بارگاہ رسول ﷺ کی نذر کر دیتے ہیں۔

دیکھئے جذبِ محبت کا اثر آج کی رات  
اپنے محبوب کو بلوا لیا گھر آج کی رات  
آئی آوازِ خدا اور قریب آ جاؤ  
منتظر ہے کوئی آغوشِ نظر آج کی رات  
کوئی سمجھے بھی تو کیا کوئی نہ سمجھے بھی تو کیا  
اللہ اللہ یہ توقیر بشر آج کی رات  
ایک اور مقام پر آپ معراج رسول ﷺ کے مضمون سدا بہار کو یوں ادا کرتے ہیں۔

عرشِ اعظم پہ گئے عثمٰہِ زمن آج کی رات  
قابلِ دید ہے فطرت کی پھبن آج کی رات  
لے کے جبریل امیں حسن کا پیغام آئے  
دیکھ کر عشق کا بے ساختہ پن آج کی رات  
یہ بھی ہے صاحبِ معراج کی مدحت کا صلہ  
مجھ کو حاصل ہوئی معراجِ سخن آج کی رات

محمد اعظم چشتی اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ حضور ﷺ کی ذاتِ بابرکات کائنات بھر کے عشق و عقیدت کا محور ہے۔ جملہ انبیائے کرام کے محاسن اپنی جگہ مگر آپ کے محاسن قدسی کو دیکھ کر روح ارضی بے اختیار اس حقیقت کا ادراک کرتی ہے کہ فقط اور فقط آپ ہی محبوبِ دو عالم اور ممدوحِ آدم و بنی آدم ہیں۔ محمد اعظم چشتی جیسے عظیم المرتبت نعت خواں اور نعت گو نے اپنی حیات مستعار اور فکر و فن کا تمام تر سرمایہ بارگاہ رسالتِ مآب کی نذر کر دیا کہ اگر بارگاہ رسول ﷺ میں قبولیت ہوگئی تو پھر ان کی نعت گوئی صدیوں تک اہل ایمان کے دل و جان کو معنبر کرتی رہے گی اور محمد اعظم کی یہ خواہش پوری ہو کر رہی، آج آپ کو اس دارِ فانی سے کوچ کئے ہوئے کتنے ہی برس بیت چکے ہیں مگر آپ کی آواز کا ترنم فضاؤں میں رس گھولتا ہوا اب بھی قلوبِ ہستی کو عشقِ حضور ﷺ کے آداب سکھار رہا ہے۔ آپ کا سخن خدا داد آپ کی آواز کا حسن، شعری کمالات و محاسن ادبی و فکری



اوصاف اہل مشرق کو مدتوں آپ کے وجود کا احساس دلاتے رہیں گے۔  
 محمد اعظم محض مجالس کی زینت بننے والے و صاف رسول ﷺ ہی نہیں بلکہ انہوں ہے جو کچھ  
 لکھا دل کی گہرائیوں سے لکھا اور حضور ﷺ کے محاسن قدسی اس شان سے بیان کئے کہ بے اختیار  
 قلم چوم لینے کو جی چاہتا ہے۔ ان کی ایک طویل نعت سے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

شاہِ گردوں مقامِ عرشِ خرام  
 منظرِ ذوالجلال والا کرام  
 مخزنِ علم و پیکرِ حکمت  
 ہیں فصوصِ حکمِ حروفِ کلام  
 کنت کنزاً کی وادیوں کا نور  
 آسمانِ قدم کا ماہِ تمام  
 وَرَفَعْنَا کی رفعتوں کا امیں  
 ابوالارواح کا بھی پیشِ امام  
 رازِ دارِ دنی و اَوَدَنی  
 کتنا ارفع ہے عیدہ کا مقام  
 سینہ آئینہ المِ شرح  
 دلِ خدا کی امانتوں کا مقام  
 خاکِ نعلینِ پاک وہ جس سے  
 عرش کے بھی چمک اُٹھیں در و بام  
 خاکِ بطحا بھی کیا عجب شے ہے  
 جس کو حاصل ہے ان کا قربِ دوام

جیسا کہ ہم نے آغاز میں بھی عرض کیا تھا کہ ان کے نعتیہ کلام میں اساتذہ فن کی جھلک ملتی  
 ہے اور یہ اسی طور ہو سکتا ہے کہ انہوں نے اساتذہ کے کلام کو خوب خوب پڑھ رکھا ہو اور نعت و  
 مدحت کے حقیقی ماخذ ان کے ہمیشہ پیش نظر رہے ہوں اور واقعی ایسا ہی تھا۔ امام احمد رضا خاں  
 فرماتے ہیں۔

نعمتیں بانٹا جس سمت وہ ذیشان گیا  
 ساتھ ہی منشیء رحمت کا قلمدان گیا  
 محمد اعظم چشتی کے ہاں یہی تخیل ملاحظہ فرمائیے۔

اس خالقِ کونین کی مرضی بھی ادھر ہے  
 اے سید ابرار رضا تیری جدھر ہے



اور پھر شاہ احمد رضا خاں کا پاس شریعت دیکھئے۔

بسکہ رضا نے ختم سخن اس پہ کر دیا  
خالق کا بندہ خلق کا مولیٰ کہوں تجھے  
محمد اعظم چشتی بھی اس کمال احتیاط اور ادب شریعت سے کام لیتے ہیں۔

عقل کہتی ہے مثلاً کہئے

عشق بے تاب ہے خدا کہئے

نہ خدا کہئے نہ جدا کہئے

عبدہ کہئے حق نما کہئے

اور یہاں بھی اعظم چشتی اپنے جذبات شوق کا اظہار کر جاتے ہیں۔

جس کو اعظم حضور آپ سنیں

ایسی مدحت کو مرجبا کہئے

محمد اعظم چشتی کو رب کو نین نے سوز و گداز کی دولت وافر انداز سے عطا کی ہے۔ یہ تڑپ، یہ کسک، یہ لچک، یہ شوقِ آرزو، یہ ذوقِ جستجو، یہ عشق کی بیتابیاں، یہ جذبات کی فداکاریاں، یہ لفظوں کا بانگ، یہ زمانے سے جدا طرزِ سخن، یہ فکر کی بلند پروازی، بارگاہِ رسول ﷺ میں حاضری کے لیے آہ و زاری، یہ پلکوں پہ آنسوؤں کا لرزنا، یہ جذبوں کا مچلنا، یہ جذبات بے کرانہ، احساسات والہانہ، احساس کی فراوانی، آنکھوں سے خراجِ عقیدت بن کر اُڑتے ہوئے اشکوں کی طغیانی، یہ تمام صفات ان کی شاعرانہ تگ و تاز کا اعزاز ہیں اور یہی صفات ان کی نعت گوئی کو معاصرین سے ممتاز کر کے اساتذہ فن کی مجلس میں لا کھڑا کرتی ہیں۔ نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا، فقط بارگاہِ رسول ﷺ میں مقبولیت اور پذیرائی کا سودا، ہم انہی کے ان نعتیہ اشعار پر اس مضمون کو ختم کر رہے ہیں۔

جذبہ حسرت دیدار جو تڑپاتا ہے

اپنی کوتاہ نگاہی کا خیال آتا ہے

کوئی روتا ہے تو بھر آتی ہیں آنکھیں میری

میں سمجھتا ہوں مدینہ اسے تڑپاتا ہے

نعت کا رنگ جو بدلا تو میں سمجھا اعظم

پہلے میں کہتا تھا اب کوئی کہلواتا ہے

.....☆.....☆.....☆.....



## عارف عبدالمتمین

نعت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حوالے سے شاعر بے مثال  
 پروفیسر عارف عبدالمتمین ایک ہمہ جہت شخصیت ہیں۔ خوبصورت نثر نگار۔ ممتاز شاعر۔  
 منفرد نقاد۔ قابلِ قدر دیباچہ نگار۔ مخلص انسان۔ سب سے محبت کرنے والے اور اپنی لا جواب محبت  
 کے جواب میں سب سے محبت کا ارمغان وصول کرنے والے۔ انہوں نے بہت سی اصناف  
 شعر و سخن پر طبع آزمائی کی اور ان کے قلم کے طویل سفر کو دیکھ کر اندازہ ہو جاتا ہے کہ انہوں نے خوب  
 لکھا ہے اور بہت لکھا ہے۔ شعر و سخن کے میدان میں ان کے راہوارِ قلم کی جولانیاں زوروں پر  
 ہیں۔ غزل گوئی کے ساتھ ساتھ نعت بھی لکھی اور اس میں بھی خوب نام پیدا کیا۔ ”بے مثال“ سے  
 لے کر ”امبر تیری تھاں“، تک ان کی نعت گوئی کا ایک طویل سلسلہ ماضی کی وسعتوں سے لے کر عہدِ  
 حال کی شعری رفعتوں تک پھیلا ہوا ہے۔ اردو اور پنجابی زبان میں یکساں روانی اور وفورِ عقیدت  
 کے ساتھ نعت لکھی اور یہ ثابت کر دیا کہ نعت کے زمزمے کسی زبان یا مخصوص ادبی لہجے کے پابند  
 نہیں بلکہ یہ وہ نغمہ کا ہوتی ہے کہ جو ہر عہد اور ہر زبان سے عقیدتوں کا خراج لیتا ہوا حاصلِ زمانہ  
 ٹھہرتا ہے۔

عارف عبدالمتمین کی نعت گوئی میں ایک انفرادیت ہے۔ یہ انفرادیت ان کے اسلوب  
 اور لہجے کی ہے۔ ان کی نعتوں پر پہلی نظر میں غزل کا گمان گزرتا ہے مگر جب قاری نعت کے مطلع  
 سے گزر کر آگے بڑھتا ہے تو اسے بے اختیار احساس ہونے لگتا ہے کہ یہ تو عارف عبدالمتمین کا  
 مخصوص اندازِ نعت ہے، وہ اندازِ نعت جو عجز کے آداب سکھاتا، قلبی واردات کو حضور ﷺ کی بارگاہِ  
 عالم پناہ میں پیش کرنے کا حوصلہ عطا کرتا اور ذرہ ناچیز کو کائنات کی سب سے محترم ہستی کے حضور  
 ماجرائے غم نذر کرنے کی توفیق عطا کرتا ہے۔ اس طور یوں کہنا بے جا نہ ہوگا کہ عارف عبدالمتمین کی  
 نعتوں میں حضور ﷺ سے محبت کا جو والہانہ پن پایا جاتا ہے اس میں وہ حضور ﷺ سے ان کی  
 عقیدت کو اپنائیت میں بدل دیتا ہے۔ انہیں حضور کی شخصیت کے کمالات و محاسن میں اپنی بے  
 مائیگی اور درد و غم کا درمان نظر آتا ہے یہی وہ مقام ہے جب وہ عشق و عقیدت کی بلندیوں کو چھوتے



ہوئے اپنے آقا و مولا ﷺ سے صرف اپنے وجود کے حوالے سے ہم کلام ہوتے نظر آتے ہیں۔ اسی مقام پر انہیں نبی مکرّم ﷺ کی انتہائی سربلندی کے حضور پیش کرنے کیلئے سرمایہ عجز کے علاوہ کوئی ارمغان نہیں سو جھتا۔ یہیں پر قطرے کے سمندر میں فنا ہو جانے پر عشرتِ قطرہ کا گمان گزرتا ہے۔

عارف عبدالتین کی نعت گوئی کا ایک اجمالی جائزہ لیتے ہی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ نعت کے بہانے اپنے آقا و مولا ﷺ سے باتیں کر رہے ہوں۔ اس سلسلہ میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو مخاطب کرتے ہوئے انہوں نے تو، تیرا اور تجھ وغیرہ کا سہارا لیا ہے۔ اسے ہم سوئے ادب نہیں کہہ سکتے کیونکہ سوئے ادب تو اس طور ممکن ہے کہ یہ تنقیصِ رسالت کا ارتکاب کر بیٹھیں۔ ان کی نعتوں کے مطالعہ سے کسی صورت بھی گستاخی یا بے ادبی کا احتمال نہیں گزرتا بلکہ یہ جذبہ تو غیر معمولی والہانہ پن اور خود سپردگی کا مظہر بن جاتا ہے اور یوں نظر آنے لگتا ہے کہ عارف عبدالتین اپنے اور اپنے آقا کے درمیان کسی اور کو حائل دیکھا گوارا نہیں کرتے۔ اس طرح تو اور تیرا کی تکرار طبیعت پر گراں نہیں گزرتی بلکہ عارف عبدالتین اس حسن تکرار کی بدولت خود سپردگی کی منزل سے ہمکنار ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ ایسی خود سپردگی ہے جس میں شاعر کے ذہن میں محبتِ رسول ﷺ کے قلم زور میں غوطہ زن ہونے اور حضور کی سیرت کو اپنانے کی خواہش شدت سے پائی جاتی ہے۔

دید کا ڈھب ترے اندازِ نظر سے مانگوں  
آگہی دہر کی میں تیری خبر سے مانگوں  
بے بسی دیکھ کے مفلس کی پگھلتا جاؤں  
درد مندی میں ترے دیدہ تر سے مانگوں



یہ ماہتاب ترا آفتاب تیرا ہے  
کتابِ زیست کا ہر ایک باب تیرا ہے  
تری حدیث ہر ایک دل میں جا اترتی ہے  
ہر اک خطاب سے دلکش خطاب تیرا ہے





تیرے اک ہاتھ میں مصحف تھی تو اک ہاتھ میں تیغ  
 مرا وجدان بھی مانگے ہے شجاعت تیری  
 تیری معراج میں ہے رمز عروج انساں  
 آدمیت کی نہایت ہے شریعت تیری



اپنی سیرت سے عطا کر مجھے حق کی قوت  
 سرنگوں جس سے ہو باطل وہ توانائی دے  
 تُو کہ رعنائی کردار کی معراج پہ ہے  
 مجھ کو بھی تھوڑی سی کردار کی رعنائی دے

عارف عبدالمتین اس حقیقت سے بہرہ ور ہیں کہ جب خود سپردگی کی تمنا کی جاتی ہے تو پھر اس راہ تمنا پر چلنے کے لئے محبوب کی ایک ایک ادا کو سرمایہ عمل بنانا پڑتا ہے اس راستے پر چلتے ہوئے محبوب کی اداؤں کے چمنستان کی مہکباریوں میں کھوجانا پڑتا ہے اور یہ والہانہ پن اس وقت تک ممکن نہیں جب تک محبوب کے نقوش قدم کی جلوہ کاریوں میں اپنی منزل حقیقی کا سراغ تلاش نہ کیا جائے اور جب شاعر کا محبوب وہ ذات والا صفات ہو جو محبوبیت اور مرجعیت کی تمام تر رعنائیوں سے بہرہ یاب ہو۔ وہ محبوب جو محبوب خدا بھی ہے اور محبوب خلّاق بھی اور حسن عقیدت کی جلوہ گری یہ ہے کہ خدا اور مخلوق خدا دونوں ذوق و شوق سے اس محبوب کی توصیف و مدحت میں مصروف ہیں۔ عارف عبدالمتین پر یہ حقیقت آشکارا ہے کہ محبوب خدا کی محبوبیت کو اس وقت تک حاصل حیات نہیں بنایا جاسکتا جب تک اس کی سیرت سے خوشہ چینی نہ کی جائے۔ سیرت حضور ﷺ سے خوشہ چینی کا عمل عارف کی نعتیہ شاعری میں دوسروں سے منفرد نظر آتا ہے اس میں رسمی تمنائیں نہیں بلکہ قلب و جگر کی خلوتوں سے ابھرنے والی دعائیں ہیں۔ یہ خود کو حضور نبی کریم ﷺ کے اتنا قریب محسوس کرتے ہیں کہ خود کو ان کی لازوال سیرت کی مہکباریوں میں رچ بس جانے کا احساس بخشنے لگتے ہیں۔ اس موقع پر بھی عارف کی یہی تمنا ہے کہ جہاں یہ ہیں وہاں دوسرا اور کوئی نہ ہو۔ سیرت حضور کو اپنانے کے حوالے سے عارف عبدالمتین کے اندازِ طلب کا ایک حسین اندازِ ملاحظہ کیجئے۔

آ میرے رگ و پے میں لہو بن کے رواں ہو  
 تجھ بن یہ بدن قریہ بے آب نظر آئے



کجلائے نہ سورج تری رحمت کا ابد تک  
تا حشر ترے پیار کا مہتاب نہ گہنائے  
جو عہد بھی آئے تری سیرت پہ ہو نازاں  
جو دور بھی آئے ترے کردار پہ اترائے



دے آنکھ کہ دیکھوں ترے اوصاف حمیدہ  
دے فہم کہ سمجھوں ترا پاکیزہ جریدہ  
بوزر کے حوالے سے غنا تو نے عطا کی  
ہم نے درِ زر پر نہ کیا سر کو خمیدہ



مری نگاہ کا مرکز ہے بانگپن تیرا  
کبھی غم ترے دیکھوں کبھی سخن تیرا  
گزر رہے ہیں شب و روز اس تمنا میں  
مرے چلن میں جھلکنے لگے چلن تیرا  
یہ آرزو ہے کہ لاہور سے مدینے تک  
میں اپنے خون سے سینچوں چمن چمن تیرا

حضور سلطانِ دو عالم ﷺ سے محبت و عقیدت کا رشتہ استوار کرنا ہر صاحب ایمان کا  
بہترین اثاثہ حیات ہے۔ اس رشتہ عقیدت کی استواری اس کی تمنا بھی ہے اور حاصل تمنا بھی دعا  
بھی ہے اور حاصل دعا بھی۔ کیونکہ دامنِ رسالتِ مآب ﷺ سے وابستگی اتنا بڑا اعزاز ہے کہ اس کے  
بعد کسی اور اعزاز کی تمنا نہیں رہتی۔ اسی کو فانی الرسول کی منزل بھی کہتے ہیں۔ عارف عبدالمبین کے  
لئے یہ رشتہ ارادتِ حُسنِ شاعری کے ساتھ ساتھ کمالِ ایمان بھی ہے لیکن یہ بلند بخت شاعر جب  
عشق و عقیدت کے راہوار کے سہارے آگے بڑھتا ہوا کنبدِ خضریٰ کی نورانی طلعتوں کا تمنائی بنتا  
ہے تو اسے جہاں اپنی سعید بختی پہ ناز آتا ہے وہاں یہ شوکتِ حضور ﷺ کا تصور کر کے آبدیدہ ہو جاتا  
ہے کہ وہ کہاں اور میں کہاں؟ وہ سراپا کمال اور میں خستہ و پریشاں حال وہ رحمۃ للعالمین اور میں  
ملول و اندوہ گیس۔ وہ دو عالم کا افتخار اور میں سراسر معصیت شعار۔ اسی فکری سفر میں جب عارف



عبدالمتین کی روح سرکارِ دو عالم ﷺ کی علو مرتبتی اور بلندی درجات کا تصور کر کے اپنی پستی کے احساس سے بوجھل ہونے لگتی ہے تو پھر معاً اس حقیقت کا ادراک ان کے لئے وجہ نشاط بن جاتا ہے کہ محبوبِ دو عالم ﷺ کی رحمت کا عرفان ہی تو مرے لئے وجہ نجات ہے۔ میں لاکھ عصیاں شعار اور خطا کار سہی مگر جس سے نسبت رکھتا ہوں اس کا ادنیٰ سا اشارہ رحمت ایک زمانے کی نجات و سرخروئی کے لئے کافی ہے۔ پھر یہی احساس عارف عبدالمتین کے لئے وجہ نشاط بن جاتا ہے، قلب و جان پر روحانی کیفیت سرور کا وفور ہونے لگتا ہے اور پھر عارف کا قلم بے اختیار نسبت حضور ﷺ کے تصور سے چل چل جاتا ہے۔

تُو روشن آفتاب میں تیرا سحاب ہوں  
کر مجھ کو منکشف کہ سراپا حجاب ہوں  
کتنے کڑے سوال اٹھاتا ہے یہ جہاں  
تو مائل کرم ہو تو سب کا جواب ہوں  
شاداب اپنے لطف کی رم جھم سے کر مجھے  
صحرائے زندگی میں سلگتا سراب ہوں

اور پھر اسی حسنِ تاثر کی جلوہ کاری کا ایک اور رنگ ملاحظہ کیجئے۔

برس رہی ہے دل و جاں پہ روشنی کی پھوار  
کہ کہہ رہا ہوں میں قرآن کے ترجمان کی حدیث  
اگرچہ اس کے تھے سب روپ رہنمائی کے  
لگی حدیث تری مجھ کو دوستاں کی حدیث



نجانے کس گھڑی تیرا کرم تجھ کو ادھر لائے  
کھلا رکھتا ہوں میں ہر وقت اپنے دل کا دروازہ  
ترے شایانِ شاں کب نعت میری ہے مگر سچ ہے  
نشا تیری ہے میرے چہرہ اظہار کا غازہ

عارف عبدالمتین کی نعت گوئی میں جدیدیت پوری شدت سے کار فرما ہے یہ جدیدیت جب جدتِ فکر و فن کا روپ اختیار کرتی ہے تو قلم کو مسیحائی اور دعاؤں کو پذیرائی کا اعزاز عطا کر دیتی



ہے۔ جدیدیت کوئی تہمت نہیں صبح نو کے ماتھے پر سیاہ دھبہ نہیں بلکہ یہ تو عصر حاضر کے جدید ترین اسلوبِ اظہار اور اندازِ ابلاغ کو اپنا کر اپنے مدعا کو بیان کرنے کا دوسرا نام ہے ہاں جب یہی جدیدیت مقاماتِ مصطفوی ﷺ اور جمالِ محبوبانِ مجازی کے درمیان امتیاز نہیں کر پاتی تو نعمت کے بجائے فن برائے فن کے نام پر تہمت بن کر رہ جاتی ہے۔ عارف عبدالمتمین نے عصر حاضر کی جدیدیت کو فکر و فن کی جدتوں کے تناظر میں لیا ہے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اس طور وہ بہتر طریق سے نئے حضور کو دورِ حاضر کی ادبی، نظریاتی سر بلندیوں کا ارمغان پیش کر سکتے ہیں۔ یار لوگوں نے جدیدیت کے نام پر ادبی تجربات اس طور سے کئے ہیں کہ بعض اوقات یوں گماں ہونے لگتا ہے کہ

مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

مگر جب یہی جدیدیت جدتِ فکر و فن کے حُسن سے آراستہ ہو کر عارف عبدالمتمین کے لئے نعت گوئی کا وسیلہ بنتی ہے تو اور ہی کیفِ آفریں سماں دیکھنے کو ملتا ہے۔ حسین تشبیہات، دلکش استعارات، عصرِ نو کی ادبی روایات کی امینِ برجستہ تراکیب، زبان و بیان کی سحر طرازی، الفاظ کے حسنِ انتخاب کی جلوہ کاری، یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہاں آکر جدیدیت نے اپنے لئے جو خلعت پسند کی ہے وہ ہر لحاظ سے مرصع اور جاذبِ فکر و نظر ہے۔ اس ضمن میں انتخابِ ڈھونڈنے لگیں تو بے شمار خوبصورت نعتیہ اشعار بے اختیار قاری کے ذہن اور قوتِ انتخاب کو اپنی گرفت میں لینے لگتے ہیں ملاحظہ کیجئے۔

میں آفتاب کہوں تجھ کو کہ ماہتاب کہوں  
کتابِ شام و سحر کا ہر ایک باب کہوں  
سراغِ سنگ بھی ملتا ہے تجھ سے صورتِ گل  
تو ایک ایسی حقیقت ہے جس کو خواب کہوں



آ کبھی آئینے کی مانند میرے رُوبرو  
آرزو ہے فیض سے تیرے بنوں میں خود نگر  
تجھ کو اسرارِ جہاں میں آشنا پاتا ہوں میں  
ڈھونڈتا پھرتا ہوں تجھ کو دے مجھے مری خبر



میں مکاں کی قید میں ہوں لامکاں ہے تجھ میں گم  
اس تفاوت کو مٹا دے روح کو آسودہ کر



میں پھول ہوں تو مرے واسطے صبا تو ہے  
نفس کہیں جسے وہ موجہ ہوا تو ہے  
ازل بھی حُسن ترا ہے ابد بھی رُوپ ترا  
جمال بن کے زمانے سے آشنا تُو ہے

محبوب دو عالم ﷺ سے غیر معمولی فکری وابستگی کے سبب عارف عبدالمتمین اپنے آقا و  
مولانا ﷺ کو اپنی ذات پر وارد ہونے والے رنج و الم کا فسانہ سناتے ہیں۔ عارف کے کہنے کا انداز  
دوسروں سے جداگانہ ہے بعض اوقات وہ حضور نبی کریم ﷺ کو اپنی ذات سے اس قدر قریب  
جانتے ہیں کہ فسانہ الم سناتے ہوئے سرگوشیاں کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا  
ہے کہ وہ اپنی داستانِ آلام کو زمانے بھر سے چھپا کر اپنے آقا و مولانا ﷺ کو سنار ہے ہیں لیکن کبھی کبھی  
ان کا لہجہ بلند ہو جاتا ہے اور ان کے آہنگ میں جذبے کی پیش کے سبب شدت آ جاتی ہے اور یہی وہ  
مقام ہے جب وہ اپنی ذات کے حصار سے نکل کر ملتِ اسلام کا نوحہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام  
کی نذر کر رہے ہیں۔ اُمتِ حضور کا استغاثہ بارگاہِ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام میں پیش کرنا نئی روایت  
یا جدت پسندی کی دلیل نہیں۔ صحابہ کرام جس طرح سرکارِ دو عالم ﷺ کی حیات ظاہری میں اپنے  
اپنے آلام و مصائب دربارِ حضور میں پیش کیا کرتے تھے یہی سلسلہ مناجات وصالِ حضور ﷺ کے  
بعد بھی جاری رہا۔ کیونکہ لطف و کرم کے ہر تمنائی کو احساس ہے کہ اگر اس کے آنسو سلطانِ دو عالم  
ﷺ کی بارگاہِ بیکس نواز میں قبول ہو گئے تو رحمتِ ایزدی انہیں یقیناً پذیرائی کے موتیوں کی تباہ  
تاب بخش دے گی۔ حضرت قدسیؒ کے لفظوں میں

چشمِ رحمت بکشا سُوئے من اندازِ نظر  
اے قریشی لقمی ہاشمی و مطلبی

اور پھر الطافِ حسینِ حالی کی مناجات

اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقتِ دعا ہے  
اُمت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے



استغاثہ ہو یا مناجات، عرض گزاری ہو یا تمنائے عفو و کرم، شاعر بہر صورت کبھی اپنے حوالے سے امتِ اسلام کا اور کبھی امتِ اسلام کے حوالے سے اپنی ذات کا فسانہ الم نبی ؐ رحمت پناہ ﷺ کی بارگاہ قدس میں پیش کر کے یوں محسوس کرتا ہے جیسے سرکارِ دو عالم ﷺ کی ردائے رحمت نے اس کو اپنی پناہ میں لے لیا ہو۔ عارف عبدالمتمین نے خود کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے جلووں میں اس قدر گم اور وارفتہ دکھایا ہے کہ مناجات یا عرض گزاری کے بہت کم مواقع نظر آتے ہیں مگر جہاں بھی ایسا موقعہ میسر آیا ہے عارف عبدالمتمین کی فریاد دلوں کو چیرتی ہوئی زمانی و مکانی فاصلوں سے بے نیاز ہو کر دیارِ رسول ﷺ کا طواف کرنے لگتی ہے۔ چند اشعار اس حوالے سے قارئین کی نذر ہیں۔

میں پھول ہوں چھتے ہوئے کانٹوں میں گھرا ہوں  
اے میرے پیمر میں جہنم میں پڑا ہوں



خوشی کی پہچان بخش مجھ کو غموں کا عرفاں مجھے عطا کر  
میں تیری دہلیز پر کھڑا ہوں مجھے مری ذات سے سوا کر  
میں روز و شب کے شمار میں ہوں میں وقت کے سرِ حصار میں ہوں  
ازل ابد ہیں ترے رضا جو تو ان کی زد سے مجھے رہا کر



دکھ کا سورج ہے سوا نیزے پہ دشتِ غم ہے  
عافیت میں تری رحمت کے شجر سے مانگوں  
میں تیرے ساتھ ہوں اور نور ہے میرے سات حبیب  
مگر تو چاند ہے اور میں اندھیری رات حبیب  
ہر ایک سمت سے یلغار ہے رقیبوں کی  
بتا کہ کیوں ہے انہیں جیت مجھ کو مات حبیب  
گرا چکا ہوں میں باہر کے سومنات، مگر  
مرے وجود میں پنہاں ہیں سومنات حبیب  
بہار بن کے گزر میرے گلستاں سے کبھی



شجر ہیں سوکھے ہوئے چند پھول پات حبیب

عارف عبدالمتمین کے نعتیہ کلام میں ایک اہم عنصر ذوق و شوق کا ہے۔ جب شاعر والہانہ پن کی منزلوں کو چھوتے ہوئے اپنے وجود کو محبت حضور ﷺ میں فنا کر کے اور آگے بڑھنا چاہتا ہے تو اسے بے اختیار بے خودی و سرشاری کا احساس ہوتا ہے۔ حضور نبی کریم کی تعریف و توصیف میں اپنے قلم کو شہیر جبریلؑ بناتے ہوئے عارف عبدالمتمین ذوق و شوق کے حوالے سے رسول شناسی کی جن رفعتوں سے آشنا ہوتے ہیں ان کا ادراک ہی نعت گو شاعر کو کیف و سرور کی ان جاودانی فضاؤں میں لے جاتا ہے جہاں تو صیف نگار کا اپنا تشخص گم ہو جاتا ہے اور اسے چاروں طرف محبوب دو عالم ﷺ کے نورانیت آفریں جلوئے بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس عالم مدہوشی میں کہ جس پر ہوش و خرد کی تمام تر سر بلندیاں نچھاور کی جاسکتی ہیں شاعر ان روحانی و وجدانی لذتوں سے آشنا ہوتا ہے کہ پھر اس کا اس دنیا سے من و ثنویں واپس آنے کو جی ہی نہیں چاہتا۔ اقبال کے لفظوں میں۔

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

اگر باو نہ رسیدی تمام بو لہی است

عارف عبدالمتمین اپنی فکر بلند کو پرواز شوق بخشے ہیں اور پھر سلطان مدینہ ﷺ اور کعبہ خضریٰ کے تصوراتی جلووں میں گم ہو جاتے ہیں۔ تصور بھی کتنی کیف آفریں دولت ہے جو محبت کو اس کی ارادت مندی کے طفیل محبوب کے قدموں میں بیٹھنے کی سعادت عطا کر دیتی ہے۔ ذوق و شوق شاد کامی اور سرخوشی و سرشاری کی کیفیت میں عارف عبدالمتمین کی شوکتِ احساس انہیں کس طور محویت اور خود فراموشی کے نام پر حضور ﷺ کی مدحت طرازی کا سلیقہ عطا کرتی ہے اس کی ایک جھلک دیکھئے۔

نہ تیرے غم سے نجات پاؤں نہ تیری یادیں بھلا سکوں میں  
تو میری آنکھوں کا خواب ٹھہرے تجھے پلک پہ سجا سکوں میں  
تو رحمتوں کا گداز بن کر ڈھلے مری آنکھ کی نمی میں  
زمانہ ہمدردیاں جو مانگے تو خود کو آنسو بنا سکوں میں



تو سنا ہر پل مجھے اپنی حدیثِ دلربا  
میں کہوں ہر آن تجھ سے اپنے دل کا ماجرا



کھل اُٹھے ہیں گلشنِ جاں میں امیدوں کے گلاب  
یہ تری موجِ تصور ہے کہ ہے بادِ صبا



بہت قریب ہے تو بھی مری رگِ جاں کے  
خدا نہیں ہے مگر ہاں خدا نما تُو ہے  
لکھوں جو نعت تو ہوتا ہے ہر گھڑی محسوس  
میں حرف ہوں تو مری لے کا معجزہ تُو ہے

ذوق و شوق کی ان خلوتوں میں جا کر بھی کہ جہاں چاہنے والا اپنی ہستی سے بے گانہ اور  
انوارِ مصطفوی ﷺ کی ہمہ گیریت کے حصار میں گم ہو جاتا ہے عارفِ عبدالمتین نے محبوبِ دو عالم  
ﷺ کی بلندی درجہ جات کو فراموش نہیں کیا۔

باخدا دیوانہ باشد با محمد ہوشیار

کے مصداق عارفِ عبدالمتین کو یہ احساسِ شدت سے دامنگیر ہے کہ کہیں یہ والہانہ پن اپنی حدود  
سے تجاوز کر کے بے ادبی کا مرتکب نہ ہو جائے۔ کہیں اس کیفِ سامانی کا وفور ان سے عظمتِ  
حضور ﷺ کا شعور نہ چھین لے، کہیں ذوق و شوق کی نور آفریں ساعتوں میں خود فراموشی ان کے  
لئے اس بارگاہِ ناز میں گستاخی کا باعث نہ بن جائے، جہاں فرشتے دم بخود اور خاصانِ خلایق نفسِ گم  
کردہ ہیں۔ یہ وہ بارگاہِ ناز ہے جہاں صاحبِ نیاز اپنی جبین پر ”بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر“ کی  
حقیقتِ ازلی کا نور سجائے حاضر ہوتا ہے۔ اس مقامِ شوق سے گزرتے ہوئے عارفِ عبدالمتین نے  
حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مقاماتِ قدسیہ، محاسنِ ایمانی، فضائل و کمالات اور معجزات و خصائص  
کو بھی عقیدت کی آنکھ سے دیکھا اور ارادت کے احساس سے دل میں جگہ دی ہے۔ انہوں نے  
اپنے قلم کو عشق و عقیدت کی روشنی میں ڈبو کر جس طور محاسنِ حضور ﷺ کا تذکرہ کیا ہے اس کی  
بدولت قاری کو عارفِ عبدالمتین کے تاریخی شعور اور سیرت نگاری کے نہایت خوبصورت مظاہر  
دیکھنے کو عطا ہوتے ہیں۔

ثبوت ہے تری عظمت کا تری رفعت کا  
تری ثنا پہ ہے مجبور خود عدد تیرا



مرے لئے تری سیرت ہی بے مثال نہیں  
دکھائی دیتی نہیں تجھ سی کوئی صورت بھی

ہر ایک گام ہو طائف سا مرحلہ در پیش  
ستم اٹھاؤں کسی کو مگر برا نہ کہوں

تو نے یکتائی خالق کی بصیرت بخشی  
تجھ کو مخلوق نے ہر رنگ میں یکتا دیکھا  
الجھے الجھے تھے بہت کون و مکاں کے عقدے  
تیرے فیضان سے ہر عقدہ سلجھتا دیکھا



تیری عظمت سے ہمیں وسعتِ کردار ملی  
ہم کہ قطرہ تھے ہمیں بحر بنایا تو نے  
فقر کو رفعتِ مفہوم ترے گھر سے ملی  
اپنے دروازے پہ شاہوں کو جھکایا تو نے



کجلائے نہ سورج تری رحمت کا ابد تک  
تا حشر ترے پیار کا مہتاب نہ گہنائے  
جو عہد بھی آئے تری سیرت پہ ہو نازاں  
جو دور بھی آئے ترے کردار پہ اترائے

عارف عبدالمتمین کی نعت گوئی بلاشبہ اردو نعت کے سرمائے میں بے حد خوبصورت اور  
گراں قدر اضافہ ہے۔ محبتِ حضور ﷺ کی رفعتوں کو چھوتے ہوئے عارف عبدالمتمین نے بارہا خود  
کو سیرتِ حضور ﷺ کے سانچے میں ڈھالنے کی آرزو کی ہے اور یہ وہی آرزو ہے جو ہر صاحب  
ایمان کو جانِ ایمان ﷺ سے فکری طور پر قریب تر کر دیتی ہے۔ سچ جائیے تو اصل محبت اور قربت



اسی کا نام ہے کہ نعت گو شاعر لفظوں کے گل و گلزار کھلاتا ہوا اپنے آقا و مولا ﷺ کی صورت و سیرت سے اس طور راہنمائی حاصل کرے کہ اسے ایک نظر دیکھتے ہی محبت رسول ﷺ کی عملی تفسیر نگاہوں کے روبرو ہو اور میدان حشر میں حضور شفیع المذنبین ﷺ اسے دیکھتے ہی کہہ دیں کہ یہ تو مرا غلام ہے۔ صورت و سیرت حضور ﷺ کے نورانی جلووں میں کھو کر نبی اکرم ﷺ کے محاسن و محامد کا پرتو عہد حاضر کے اصحاب ایمان میں دیکھنے کی تمنا عارف عبدالمتین کی شاعری کا حسن امتیاز ہے۔ ان کے بے مثال مجموعہ نعت ”بے مثال“، سے محبت و عقیدت سر کا ﷺ کے انوار سمیٹتے ہوئے ہم شاعر بے مثال کی بلندی درجات اور دربار رسالت ﷺ میں پذیرائی کے لئے دعا گو ہیں۔ ہم عارف عبدالمتین کے اس حسن تمنا پر اپنی تحریر کا اختتام کرتے ہیں۔

تری ثنا کے لئے تیرا روپ لازم ہے  
تو میری نعت کو اندازِ درباری دے

☆☆☆



## راسخ عرفانی

### ایک منفرد نعت گو

سرکارِ دو عالم ﷺ کی تعریف و توصیف اس قدر مقدس و محترم فریضہ ہے کہ جس کی عظمتوں کے احساس سے ہی قلب و فکر کو بالیدگی کی دولت عطا ہونے لگتی ہے۔ جسم و جان کو ناقابلِ بیان فرحت کا احساس ہونے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر صاحبِ ایمان سلطانِ مدینہ ﷺ کی مدحت و ثنا کو وظیفہٴ حیات بنائے ہوئے ہے۔ جملہ اسالیب کے دھارے، ہر قسم کے استعارات کے سرچشمے اور تشبیہات و تراکیب کے زمزمے صفت و ثنائے مصطفوی ﷺ کے بحرِ ناپیدا کنار میں جذب ہو جاتے ہیں اور ہر ثنا گو جملہ مدحت نگاروں کی صف میں اپنے لئے گنجائش پیدا کرنے کے لئے عجز و انکسار کو وسیلہٴ اظہار بنا کر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی چشمِ عنایت کا طلبگار رہتا ہے۔

یہ وہ کوچہ ہے جہاں کسی کو کسی سے بازی لے جانے کی آرزو نہیں ہے بلکہ ہر ثنا گو کو احساس ہے کہ یہ اس قدر بلند فکر کوچہ ہے کہ جس میں جگہ پانے کے لئے دیدہ و دل کو فرشِ راہ کر کے آنا پڑتا ہے یہ وہ مقامِ قدسی ہے جہاں جنید و بایزید بھی دست بستہ اور دم بخود نظر آتے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے کہ جہاں سیدنا کعب بن زہیر اور سیدنا حسان بن ثابت سمیت بے شمار عشاق نے اپنے اپنے افکار کے گلہائے رنگارنگ محبوبِ کائنات ﷺ کی نذر کئے ہیں۔ جہاں ہر دور کے طالبانِ شوق نے اپنے بہترین روحانی اثاثے اور ایمانی جذبے جناب رسالتِ مآب کے دربارِ اقدس میں پیش کئے ہیں۔ انبیائے کرام، صحابہ کبار، اولیائے عظام ہی نہیں بلکہ خود خداوندِ قدوس اور ملائکہ بھی بارگاہِ مصطفیٰ ﷺ میں سلام و درود کی ڈالیاں گزارتے دکھائی دیتے ہیں۔ زمین کی پستیوں سے لے کر افلاک کی رفعتوں تک جملہ مخلوقات اس حکمِ ربانی کی تعمیل میں محو نظر آتی ہیں کہ

إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۔

فنِ نعت گوئی کی تاریخ پر ایک نظر ڈالیں تو ہر دور میں چند ایسے سر بلند نفوس نظر آتے ہیں جن کی آواز میں اپنے معاصرین کی نسبت کہیں زیادہ توانائی اور جن کے سوزِ نعت میں دوسرے ثنا خوانوں کی نسبت کہیں زیادہ دلگدازی محسوس ہوتی ہے۔ عصرِ حاضر میں جو مدحت نگار نعت کے



میدان میں اپنی عظمتِ فکرو فن کے چراغ روشن کئے ہوئے ہیں ان میں راسخ عرفانی کا نام ہر لحاظ سے لائقِ صد ستائش نظر آتا ہے۔ راسخ عرفانی اپنے مقام و مرتبہ کے لحاظ سے قطعاً محتاجِ تعارف نہیں ہیں وہ عمر کے اس دور میں ہیں جہاں شاعر کی فنی پختگی سند کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ اس بڑھاپے میں ان کا فن جوانی کی منزلیں طے کرتا نظر آتا ہے۔ وہی علمی پختگی، وہی ادبی دلاویزی، وہی فنی سر بلندی، وہی جذباتی والہانہ پن، وہی سوز و گداز کا نم، وہی ہر آن ریاضِ فکر کی منازل طے کرتا ہوا شہبِ قلم، وہی احساسات کی تازگی، وہی مہکبار جذبہِ سخنوری۔

راسخ عرفانی بیک وقت غزل اور نعت کے میدان میں رفعتِ فکرو فن کا جادو جگا رہے ہیں بالخصوص نعت کے میدان میں ان کے افکار و تخیلات کی تازگی اس کا اعلان ہے کہ اگر دلوں میں عشق و عقیدت رسولِ خدا ﷺ کی قدیل صحیح معنوں میں فروزاں کر لی جائے تو پھر عمر کی گذرتی ہوئی ساعتیں شاعر کے قلم کی روانی کو کبھی بھی زوال آشنا نہیں ہونے دیتیں۔ جب ممدوح وہ ذاتِ گرامی ہے کہ جس کا ذکرِ عنبر بار ہر قسم کی حدود و قیود سے بے نیاز ہے۔ ازل سے بھی پہلے اور ابد سے بھی آگے تو پھر اس ممدوح آدم و بنی آدم سے عقیدت کا رشتہ رکھنے والے کس طور کسی فکری کمزوری یا فنی لغزش سے آشنا ہو سکتے ہیں۔ عقیدت کا گلزار بہار آفریں ہو تو پھر خزاں کا وہاں کیا گزر۔ جناب راسخ عرفانی کے قلم نے ہر لحظہ ہر آن ان کے مسلسل سرگرم عمل ہونے کا احساس دلایا ہے۔ اسی لئے وہ کہتے ہیں

جس در سے رجتوں کو ملتی ہے بھیک راسخ  
گھر بار کو بھلا کر اس در کا ہو گیا ہوں



راسخ میں اک موزنِ دینِ رسول ہوں  
میری صدا ہے گنبد بے در سے بھی بلند

بارگاہِ مصطفوی ﷺ کی عظمتوں کا نظارہ یہ ہے کہ یہاں کجکلاہانِ عالم بھی غلامانہ صورت بنائے عجز و فروتنی کا اندازِ جبینوں پر سجائے اس بڑے داتا کی چوکھٹ پر سوالی بن کر حاضر ہوتے ہیں۔ دربارِ رسول ﷺ میں حاضری کا شرف حاصل کرنے کی آرزو کرتے ہوئے ہر صاحبِ فکر کو علم ہوتا ہے کہ یہاں ادبِ عقیدت کے پیانے دنیاوی شہنشاہوں کے آدابِ درباری سے جدا ہوتے ہیں۔ یہاں وہ آقا قیام فرما ہے جو لرزتے لبوں کی جنبش سے ہی دلوں کا مدعا جان لیتا ہے جو خاموش



جذبوں میں مضمحل عقیدت کے لفظوں کو شرفِ باریابی عطا کرتا ہے۔ جو بے کسوں کا سہارا اور بے بسوں کی ڈھارس ہے۔ جو غمزدوں کا آسرا اور محروم قسمت انسانوں کے لئے وجہ تسلی ہے۔ اس رشکِ سلاطین عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں راسخ عرفانی کا اندازِ عجز دلوں کو عقیدت کے نئے آداب سکھاتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے۔

چاندنی رات میں طیبہ کی مسافت کا سماں  
خاک بھی پاؤں میں بچھتی ہے صبا کی صورت  
اے شہِ خلد کی گلیوں کے غبارِ اطہر  
ڈھانپ لے حشر کے دن مجھ کو ردا کی صورت



کھوئے ہیں کچھ اس طور سے بطحا کی فضا میں  
ایماں کی کہیں اپنا نگر بھول گئے ہیں  
دل کا ہے سکون گنبدِ خضریٰ کی زیارت  
اک لمحے میں ہم کربِ سفر بھول گئے ہیں



مُشک میں ڈوب کے پلکوں پہ ہیں آنسو آئے  
نعت لکھوں مرے خامے سے بھی خوشبو آئے



ختمِ رسل کے روضہ اقدس کا وہ جلال  
اٹھی نہ پھر نظر مری پہلی نظر کے بعد  
دل سیرِ روح سیر ہے خیراتِ فقر سے  
دیکھا نہ در کسی کا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے در کے بعد

راسخ عرفانی ایک بڑے شاعر ہوتے ہوئے اس حقیقت سے بہرہ ور ہیں کہ سلطانِ مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدحت و ثنا کا حق کون ادا کر سکتا ہے۔ جو رب بے مثال کا بے مثال شہکار ہو جو ہر ایک قلبِ غمزدہ کا قرار ہو جس کے مدحت سرا خدا و ملائکہ ہوں جس کے در کے دربان ہونے کی سعادت جبریلؑ کو ملی ہو۔ جس کا ہر قول وحیِ خدا اور جس کا ہر لفظ تقدیرِ یزداں ہو۔ جو صاحبِ قرآن ہی نہیں



اپنی سیرتِ مطہرہ کے لحاظ سے عین قرآن ہو، جو ہر تخیل سے ماوریٰ اور ہر تصور سے سر بلند ہو، جس کو خیالوں میں بسایا تو جاسکے مگر نگاہ جس کے جلووں کی تاب نہ لاسکے۔ اس کی ثنا میں شاعر کا قلم کس حد تک آگے بڑھ سکتا ہے کیونکہ انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ

لا یملکن الثناء کما کان حقہ

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

اس مرحلہ پر پہنچ کر راسخ عرفانی کے قلم سے جو صداقتیں پھوٹی ہیں ان کی ایک جھلک دیکھئے۔

توصیفِ مصطفیٰ کی کرامت زہے کرم

پھیلا ہے بزم بزم میں کیف و سرورِ فن

عاجز جہاں تھا سعدی و حسان کا سخن

بے جا ہے اس مقام پر ناز و غرورِ فن

حیران ہوں میں کہ نعت کے زمرے میں کیا لکھوں

بے بس سا ہو گیا ہے قلم بھی حضورِ فن

راسخ کٹھن ہیں مدح محمد ﷺ کے مرحلے

طبع رسا سے دور ہیں انوارِ طورِ فن

نعتِ سرورِ کونین ﷺ کے باب میں اس قدر اظہارِ عجز و انکسار کے باوجود راسخ عرفانی

نے اپنی عقیدت آفرینی کی بدولت جو گل و لالہ مہکائے ہیں ان کی خوشبو ایوانِ نعت کو ہمیشہ معنبر و

معطر رکھے گی۔ راسخ کی نعتیہ شاعری ایک ایسے جامِ جہاں نما کی صورت ہے کہ جس پر ایک نظر

ڈالتے ہی قاری اپنے آقا و مولانا ﷺ کی لازوال شخصیت کے بہت سے پہلوؤں سے آگاہ ہو جاتا

ہے۔ راسخ نے اپنی ندرتِ فن اور طبعِ رسا کی بدولت نئے سے نیا مضمون پیدا کرنے کی کوشش کی

ہے۔ اگر کسی مضمون یا مفہوم کی تکرار ہوئی بھی ہے تو اس خوبی کے ساتھ کہ اس کا نیا پن مجروح نہ

ہونے پائے۔ نعت کہنا حقیقت میں تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف ہے۔ شاعر عقیدت میں غلو

سے کام لے تو سرکار کی نظروں سے گرتا ہے اور اگر آپ کے مقاماتِ سر بلند میں کمی کر جائے تو

تنقیصِ رسالت کے نام پر عذابِ الہی کا خوف دامگیر ہے۔ راسخ عرفانی شریعت کے تقاضوں

سے آگاہ ہیں اس لئے انہوں نے حقیقی نعت کی روح کو ملحوظ رکھتے ہوئے نعت لکھی ہے۔ ان کی

نعت میں ادب کے ساتھ ساتھ احتیاط کی جھلک بھی ہویدا ہے۔ اس ادب و احتیاط کے امتزاج نے



انکی نعتیہ شاعری کو دوام سے ہمکنار کر دیا ہے۔ چند ایسے اشعار ملاحظہ کیجئے جن سے راسخ کی طبع رسا اور نعت کے فکری بانگپن کا اظہار ہوتا ہے۔

جولے گئی تھی مجھ کو اڑا کر سرِ حجاز  
پھر کاش وہ ہوا کبھی معجز اثر چلے  
کیا کیجئے گا اس کے تجل کا تذکرہ  
جس کی گلی میں چاند بھی خم کر کے سر چلے  
بن کر غبارِ راہ رہوں میں بھی ساتھ ساتھ  
موج نسیم جانبِ طیبہ اگر چلے



ہو سکیں لائقِ توصیفِ محمد ﷺ شاید  
کوئی حرفوں میں اگر چاند کے جوہر باندھے  
تشنگیِ ذوقِ عقیدت کی بدستور رہی  
لاکھ مضمون پئے مدحِ پیمبر باندھے



دل میں طیبہ کا تصور ضوفشاں ہونے لگا  
ایک اک ذرے پہ سورج کا گماں ہونے لگا  
کنیدِ خضریٰ کی یادوں نے وہ بخشی تازگی  
اجڑا اجڑا گھر بھی ہمدوشِ جناں ہونے لگا



وفورِ جذبِ الفت میں یہ اسلوبِ سخن میرا  
ہر آنسو کو وفا کا استعارا کر لیا میں نے



تسلیم و عجزِ پیار کا پہلا اصول ہے  
اے نطقِ با ادب کہ یہ نعتِ رسول ہے

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرت مقدسہ وہ لازوال قوت ہے کہ جس نے زمانے بھر



کو تسخیر کر لیا۔ آپ نے اپنے کردار کی بدولت عرب کے صحرائینوں کو دنیا بھر کے لئے وجہ صد افتخار بنادیا اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے کائنات کے جملہ علوم و فنون کے ایسے ماہر بن گئے کہ دنیا اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ راسخ عرفانی بھی آقائے دو عالم ﷺ کی سیرت کو خراج عقیدت ادا کرتے نہیں تھکتے کیونکہ آپ سمجھتے ہیں کہ ہم اگر آج پھر زمانے بھر میں منفرد و ممتاز ہونا چاہتے ہیں تو ہمیں سیرتِ مصطفویٰ ﷺ سے استفادہ کرنا ہوگا۔ سیرت نگاری خواہ نثر میں ہو یا نظم میں اپنی جگہ منفرد حسن رکھتی ہے۔ راسخ نے اپنے نعتیہ اشعار میں جا بجا سیرت سلطانِ دو عالم کو موضوعِ سخن بنا کر خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ آپ کی رحمۃ للعالمین، آپ کا خلقِ بے مثال، آپ کی راہبری و راہنمائی، آپ کی سیادت قیادت، آپ کی عنایاتِ کریمانہ، آپ کی شفقتِ بے کراں سمیت کتنے ہی موضوعات ہیں جو جگمگاتے ہوئے ستاروں کی صورتِ راسخ عرفانی کے کلام میں روشنی بکھیرتے نظر آتے ہیں۔ اس سیرت نگاری کا یہ مطلب نہیں کہ راسخ نے صورتِ مصطفیٰ ﷺ کی تجلیات سے آنکھیں چرائی ہیں بلکہ انہوں نے سلطانِ دو عالم ﷺ کے حسن و جمال اور صورتِ بے مثال سے بھی اپنے اشعار کو زینت بخشی ہے اور اس کی بدولت حسنِ تغزل کے بہت سے اعلیٰ نمونے نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ راسخ عرفانی نے بعض مقامات پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرتِ قدسیہ کو اس طور بیان کیا ہے کہ اس میں جمالِ مصطفویٰ کی لمعہ افشائیاں بھی جلوہ گر نظر آتی ہیں سیرت نگاری کے حوالے سے ان کا اندازِ فکر ملاحظہ کیجئے۔

گھر کی دھند میں ایمان کا سورج چمکا  
کس تب و تاب سے ایمان کا سورج چمکا  
مٹ گیا سارے قبیلوں کا تفاوت یکسر  
وحدتِ قوم کی پہچان کا سورج چمکا  
روئے عالم پہ مساوات کی کرنیں پھیلیں  
عدل و انصاف کی میزان کا سورج چمکا



ترا یہ لطفِ فراواں لہو کے پیاسوں پر  
انوکھا اہل جہاں سے ہے انتقام ترا



گدا بھی در کے سوا لی ہیں اور منعم بھی  
غریب و میر پہ یکساں ہے لطفِ عام ترا



ہجومِ کرب میں ڈھونڈیں کوئی سکوں کی سبیل  
کریں امیر بہشت بریں کا ذکرِ جمیل



راہِ تیرہ میں ضیا ان کے نقوشِ پا کی  
رہرو عشق کو قندیل سفر ہوتی ہے



بنی درودِ مبارک سے جنتِ ارضی  
وہی زمین جو بنجر تھی آپ سے پہلے  
برہنہ سر تھیں قبائل کی عزتیں راسخ  
دریدہ حُسن کی چادر تھی آپ سے پہلے

یہ حقیقت ہے کہ حالی اقبال اور ظفر علی خاں نے نعت کے مروجہ اسلوب کو نیا پیکر عطا کر کے جدید نعت گوئی کا آغاز کیا تھا۔ نیا اسلوب زندگی کے حساس پہلوؤں سے قریب تر ہوتا ہے۔ یعنی شاعر جو کچھ محسوس کرتا ہے اسے قرطاسِ دل پر رقم کرنے لگتا ہے۔ کہیں اپنی ذات کے حوالے سے، کہیں ملک و قوم کے حوالے سے، کہیں وقت کی بے مہریوں کے حوالے سے، کہیں حالات کی ستم کاریوں کے حوالے سے، کسی نہ کسی صورت میں وہ انفرادی یا اجتماعی استغاثہ بارگاہِ رسالتِ مآب ﷺ میں پیش کرتا ہے کیونکہ وہ اس حقیقت سے آگاہ ہوتا ہے کہ یہی وہ بارگاہ ہے جہاں سے کوئی بھی سوالی خالی ہاتھ نہیں آتا۔ جہاں جذبات صرف قبول ہی نہیں ہوتے بلکہ سائل کو اس کی طلب سے زیادہ عطا ہوتا ہے۔ راسخ عرفانی اپنی ذات کے حوالے سے کم اور ملک و قوم کے حوالے سے کہیں زیادہ مصائب روزگار کے قصہ ہائے درد سناتے ہیں۔ اس سے جہاں شاعر کو فسانہ ہائے الم بارگاہِ مصطفوی میں سنا کر ڈھنی و روحانی سکون کی دولت عطا ہوتی ہے وہاں قاری شاعر کی رفعتِ فکر و فن کے نام پر ملتِ اسلام کو درپیش مسائل کی شدت سے بھی آگاہ ہو جاتا ہے۔ اس ضمن میں راسخ عرفانی کے لہجے کا نم دیکھئے۔



مُر کریں جنسِ قناعت سے ہوس کے کا سے  
قوم کی قوم ہے محتاجِ رسولِ اکرم

کل ہمیں آپ نے بخشی تھی غنا کی دولت  
دیکھئے ہم کو ذرا آج رسولِ اکرم

☆

کیا کہوں عرصہ عالم میں مسلمان کے لئے  
نت نیا ظلم ہے ایجادِ رسولِ عربی

لاج رکھ لیجئے راسخ کی سرِ شہرِ جفا  
دیتجئے رحم کی کچھ دادِ رسولِ عربی

☆

کیا کیا نہ ستمِ اُمتِ مرحوم پہ ٹوٹے  
یہ کرب کی دھرتی ہے اُدھر گردشِ افلاک

اے میرِ امم دیتجئے رحمت کا سہارا  
لے ڈوبے گی ورنہ ہمیں نا فہمیِ ادراک

پھر برسرِ بیداد ہیں بوجہل کے بیٹے  
لوٹی ہیں تری قوم کی کفار نے اطلاق

☆

اب تو مرے الفاظ کو تاثیر عطا ہو  
بہ جائے نہ اشکوں میں مرا قلبِ تپیدہ

محتاج ہوں میں سر بہ قدم بخیہ گری کا  
ملبوس تو کیا جسم بھی ہے مرا دریدہ



راخ عرفانی نے محض روایتی نعت نہیں کہی بلکہ نعت کے حقیقی تقدس کو دل و جان میں بسا کر نعت کہنے کی کوشش کی ہے۔ نعت کہنے کے لئے جس پاکیزگی فکر، لطافتِ احساس اور طہارتِ ذوق کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان کی شاعری کا اعزاز بن چکا ہے۔ حج بیت اللہ کی سعادت سے بہرہ ور ہو چکے ہیں۔ گدِ خضریٰ کے نورانی جلووں سے دیدہ و دل کو ضرور یز کر چکے ہیں۔ جب تک جمالِ گدِ خضریٰ دیکھا نہ تھا تو ہجر کی شدت تھی۔ گدِ خضریٰ کی چھاؤں میں سستانے کا موقع ملا تو روح کے ساتھ ساتھ جسم کو بھی فکری بالیدگی عطا ہوئی۔ جب تک وہاں رہے ان جلووں کو دامنِ روح میں سمیٹتے رہے اور جو نہی واپسی کا سفر شروع ہوا تو دل ایک نئی کیفیت سے دوچار ہونے لگا کہ جن جلووں کو دیکھ چکا ہوں انکو بار بار دیکھوں، اذنِ حضوری عطا ہوتا رہے۔ اس نئے احساس کی بدولت ان کی نعتیہ شاعری کے پس منظر سے نئے نئے موضوعات ابھرنے لگے۔ ایسے موضوعات کہ جن میں درد کی کسک بھی تھی اور شوق کی وارفتگی بھی۔

دل میں ہے ان کی محبت کا خزانہ ورنہ  
اور تو مجھ میں نہیں وصف نمایاں کوئی

ارضِ طیبہ میں پس مرگ ہو مدفنِ راخ  
سوا اس کے نہیں حسرت و ارماں کوئی



تیرہ سامانی بھی راہوں میں رہے حائل اگر  
منزلِ طیبہ کی رودادِ سفر لکھتا رہوں

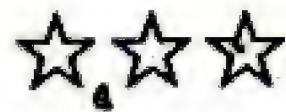
ختم ہو جائے سیاہی تو بھی توصیفِ حضور  
آنسوؤں سے یا بہ خوں نابِ جگر لکھتا رہوں



اشتیاقِ سجدہ ریزی کا تاثر مرجبا  
خود بخود نزدیک سر کے آستان ہونے لگا



راخ عرفانی کی نعتوں میں محبتِ رسول ﷺ کی دلنواز مہک احساسات کو مہکانے کا فریضہ انجام دے رہی ہے۔ منزلِ طیبہ کی جانب بڑھتے ہوئے انہوں نے خلوصِ فکر کی قدیل مسلسل جلائے رکھی ہے۔ فنی ریاضت پر ناز کرنے کے بجائے انہوں نے عشق و عقیدت کو فوقیت بخشی ہے کیونکہ انہیں یقین ہے کہ ان کے دامن میں فقط عقیدتِ حضور ﷺ ہی وہ واحد متاعِ عزیز ہے کہ جو بارگاہِ رسالتِ مآب ﷺ میں مقبول ہو کر ان کی دینی و دنیوی سرخروئی کا باعث بن سکتی ہے۔ اپنی اس متاعِ عزیز کو انہوں نے مادی کثافتوں اور باطل نظریات کی یلغار سے بچا کر رکھا ہے اور جب بھی موقع میسر آتا ہے اسی ارادت و عقیدت کو تمناؤں کی ڈالی پر سجا کر محبوبِ دو جہاں ﷺ کے حضور نذر کر دیتے ہیں اس احساس کے ساتھ کہ یہی تو وہ در ہے کہ جہاں ہر آن چھایا ہو اسحابِ رحمت عصیاں کاریوں کو اپنی لپیٹ میں لے کر طالبانِ شوق کو ابدی سرخروئی و سرشاری سے ہمکنار کر دیتا ہے۔





## جادو شوق کا مسافر

## اصغر حسین خاں نظیر لدھیانوی

مطلع فلک جو سورج نصف النہار کو پہنچتا ہے۔ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ وہ دامنِ مغرب میں غروب ہو جاتا ہے۔ جو چاند رات کی تاریکیوں میں ضو پاشی کرتا ہے۔ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ وہ بھی اپنا نور کھو بیٹھتا ہے۔ اسی طرح سے جو گلستان بھی مہکتا ہے ایک دن نذرِ خزاں ہو جاتا ہے لیکن ایک سورج ایسا ہے جو اپنی سر بلندیوں کو پہنچا تو پھر ابد تک گہن یا زوال آشنا نہیں ہو سکا۔ ایک چاند ایسا ہے جو ایک مرتبہ ضو فلک ہوا تو کبھی بھی غروب نہ ہو سکا۔ ایک گلستان ایسا ہے جو ایک مرتبہ مہکا تو پھر مہکتا ہی رہا۔ یہ سورج، یہ چاند وہ صاحبِ وَالشَّمْسِ وَالْقَمَرِ ہے جس کی تو صیف و ثنا کائنات کا مرکز و محور ہے۔ یہ گلستان مدحت و ثنائے مصطفوی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا وہ گلزارِ نو بہار ہے کہ جس پر کبھی خزاں نہیں چھا سکے گی۔ ازل تو محض ایک نکتہ آغاز ہے اور اسی طرح ابد محض ایک نقطہ انجام ورنہ جہاں تک صفت و ثنائے سرور کو نین کا تعلق ہے تو نہ حد اس کے پیچھے نہ حد اس سے پیچھے کے مصداق یہ تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اصحابِ ایمان کے افکار و اذہان کا جز و لاینفک بن چکی ہے۔ اقبال کے لفظوں میں

چشم اقوام یہ نظارا ابد تک دیکھے

رفعت شانِ لک ذکرک دیکھے

اسی مضمون کو عصرِ حاضر کے عظیم نعت گو شاعر اصغر حسین خاں نظیر لدھیانوی نے یوں بیان کیا ہے۔

خزاں نا آشا روزِ ازل سے برگ برگ اس کا

بہارِ جاوداں وقفِ گلستانِ محمد ﷺ ہے

یہ کون نظیر لدھیانوی ہیں کہ جن سے میں آج سے پہلے کبھی نہیں ملا مگر جن کی نعت گوئی ایک مدت سے میرے خلوت خانہ ذہن و فکر میں بسی ہوئی ہے۔ یہ وہی نظیر لدھیانوی ہیں جنہیں میں نے اپنے آغازِ شعور سے آج تک نعت گوئی میں مسلسل اپنا رہنما پایا ہے۔ یہ وہی نظیر لدھیانوی ہیں جن کا قلم زندگی کی اتنی مسافتیں طے کرنے کے باوجود زوال آشنا نہیں ہوا، ہاں ہاں وہی نظیر لدھیانوی جنہوں نے مدحت و نعت رسول ﷺ کے زمزمے فضاؤں میں بکھیرے ہیں۔ یہ وہی نظیر لدھیانوی ہیں جو عمر کی طویل مسافت طے کرنے کے باوجود نعت آج بھی اسی وقار، عقیدت



اور احترام سے کہتے ہیں۔ جو عشاق رسول ﷺ کا طرہ امتیاز ہے۔ وہی نظیر لدھیانوی جنہیں سلطان دو عالم ﷺ سے نسبت پر پیہم ناز ہے اور یہی ناز ہے جو ان کے لئے آب حیات کی تاثیر رکھتا ہے اور انہیں ہر آن نعت مصطفیٰ ﷺ کے لئے سرگرم عمل رکھتا ہے۔

ستارہ ہو نظیر بے نوا کا کیوں نہ تابندہ

کہ یہ خاک کف پائے غلامان محمد ﷺ ہے

شغل میرا ہر نفس تسبیح و تسلیم اے نظیر

کام میرا روز و شب مدحت رسول اللہ کا

چودہ صدیاں قبل جبلِ فاراں کی رفعتوں سے آفتابِ جمال مصطفویٰ ﷺ یوں جلوہ افروز ہوا کہ اس کی لازوال کرنوں نے عشاقِ جاں نواز کے قلب کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مستنیر کر دیا۔ جن ذرات کائنات کو عشق و عقیدت کی کرنوں کی تب و تاب میسر آئی وہ نجومِ تاباں کی صورت جگمگا اُٹھے۔ جنابِ نظیر لدھیانوی کی نعتیہ شاعری بھی مطلعِ شعر و ادب پر جگمگانے والے ایک ایسے نجمِ کامل کی داستانِ شوق کی منظر ہے جو آج میدانِ شاعری میں ”مستند ہے میرا فرمایا ہوا“ کا مصداق قرار پا چکا ہے۔ دو چار برس کی بات نہیں یہ تو نصفِ صدی سے بھی زیادہ کا قصہ ہے جب نظیر نے مدحتِ مصطفیٰ ﷺ علیہ التحۃ الثناء کی منزل کی جانب اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔ نظم ہو یا نثر تنقید ہو یا تحقیق نظیر لدھیانوی نے کہاں کہاں اپنی عظمت سر بلندی کا علم نہیں لہرایا، ان کی نعتوں میں حسنِ تغزل کے حوالے سے چند اشعار پیش خدمت ہیں۔

آنسو خوشی کے دیدہ تر سے ٹپک پڑیں  
خاموشی ' نگہ ہو لطفِ نوا حضور  
چھا جائے آسمان پر الطاف کی گھٹا  
مسل صبا ہو موجِ نفس غم رہا حضور

.....  
شوق میں کون نہیں دیکھتا رستہ تیرا  
چار سو عالم امکاں میں ہے چمچا تیرا  
جا بجا نقش قدم تیرے بہار آرائیں  
عاشقوں کے لئے گلزار ہے صحرا تیرا  
لے گئے روشنی آرائشِ جنت کے لئے  
لوگ وہ دیکھا جنہوں نے ربِ زیبا تیرا

نظیر لدھیانوی نے جہاں اپنے ذاتی حوالے سے اپنے محسوسات حضور ﷺ کی نذر کئے ہیں۔



وہاں وہ اُمت اسلام کو نہیں بھولے۔ یہ خود کو ملتِ اسلام کا حساس فرد سمجھتے ہیں جو اُمتِ مسلمہ پر چھانے والی گردشوں سے بے بہرہ نہیں ہے۔ تمام مسائل بارگاہِ سرور کائنات ﷺ میں اس اُمید پر پیش کر رہے ہیں کہ اگر وہاں سے چشمِ کرم کا اشارہ ہو جائے تو گردشیں چھٹ جائیں گی۔ وقت کا آشکدہ گلزار ہو جائے اور شبِ غم کے مسافروں کو اُمید کے اُجالے میسر آئیں گے۔ اُمتِ اسلام کے حوالے سے یہ جس طور اجتماعی غم بارگاہِ رسالت ﷺ میں پیش کرتے ہیں اس کی ایک جھلک دیکھئے۔

مسلمان اور ہو مغلوبِ مایوسی و محرومی  
یہی وہ شیر ہیں جو دین و دنیا ہار بیٹھے ہیں  
اے خاصہ خاصانِ رسل روزِ جزا ہے  
اُمت تیری محتاجِ مراعات و عطا ہے  
کس طرح ختم ہو یہ سلسلہ فسق و فجور  
باعثِ شرم تھی جو بات وہ مرغوب ہے اب  
بڑی مدت سے مسلط ہے لعاص کی گھٹا  
دیکھئے اس شب تیرہ کی سحر ہوتی ہے کب

عظمتِ سرورِ کونین ﷺ نعت گو شعراء کا مقصودِ اوّل ہے۔ مدحت نگار اپنی جملہ ادبی و شعری صلاحیتوں کا ارمانِ حضور ﷺ کی نذر کرتے نہیں تھکتے۔ یہی کیفیت اصغر حسین خاں نظیر لدھیانوی کی ہے۔ ان کی نعتیں ان کے وارداتِ قلب کی روداد ہیں۔ ان میں عشق و عقیدت کی فراوانی بھی ہے اور طبعِ رسا کی جولانی بھی، پاکیزگیِ فکر کی بلند پروازی بھی ہے اور مہجوریِ طیبہ میں تڑپنے والے دل کی بے قراری بھی۔ عنایاتِ مصطفویٰ ﷺ پر اظہارِ امتنان و تشکر بھی ہے اور نعت گوئی کی سعادت عطا ہونے پر احساسِ اعزازِ مقدر بھی، گلبارِ لفظوں کا شکوہ بھی ہے اور معطرِ معطر جذباتِ شوق کا بانگِ پین بھی، ان کی شاعری میں درِ ذوات، کربِ ملت سے یوں ہم آہنگ ہو گیا ہے کہ اس کی بدولت ان کی عظمتِ فنِ مسلم سے مسلم تر ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ عظمتِ سرورِ کونین ﷺ کو یوں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔

پست و بالا میں نہ ہے خورد و کلاں میں امتیاز  
شفقت و احسان ہے عادتِ رسول اللہ کی  
مرغِ سدرہ بھی ہے چپ جبریلؑ بھی خاموش ہیں  
سمجھیں کس تشبیہ سے عظمتِ رسول اللہ کی  
کی صبحِ ازل اس نے ترے نور سے روشن  
ہستی تری آئینہ لولاک لما ہے



ہے سر یہ ترے تاج رفعتا لک ذکر ک  
کب اور کسی شخص کو یہ رتبہ ملا ہے  
نظیر حسین نظیر لدھیانوی نے اپنے تمام محاسن شعری کو بحر و فروتنی کے سانچے میں سمو کر اسے  
ابدی جگمگا ہٹ عطا کر دی ہے۔ کیونکہ نظیر جیسے محب رسول ﷺ سے زیادہ کون جانتا ہے کہ بارگاہِ  
مصطفوی ﷺ میں وہی متاعِ فن قبول ہوتی ہے جسے ادب و احترام کی ڈالیوں پر رکھ کر پیش کیا  
جائے کیونکہ ادب ہی وہ قرینہ ہے جو تمام آرزوؤں کو قبولیت سے ہمکنار کرتا ہے۔ ادیب ہو یا  
شاعر، نثر نگار ہو یا خطیب سب کے سب بہت کچھ لکھ کر بھی ازراہِ احترام عقیدت سر نیادہ کھڑے  
ہیں کہ جب تک ادب و احترام کو اپنے جذبات کا حاصل نہیں بنائیں گے اس وقت تک ان کی متاعِ  
فن خوشنودی حضور ﷺ کا باعث نہیں بن سکے گی۔ نظیر لدھیانوی نے ادب و احترام کے تقاضوں کو  
کس طور بجا آوری کی ہے اس کی ایک جھلک ملاحظہ ہو۔

میں تو چپ تھا کہ نہ آئے تھے بنانے الفاظ  
نعت گوئی کے لئے بخشے خدا نے الفاظ  
نعت کہنے کا ارادہ جو میں کرتا ہوں کبھی  
ڈال دیتے ہیں مرے آگے خزانے الفاظ

دھو لیا ہے کوثر و تسنیم سے سو بار دہن  
اب بھی لوں نام اگر تیرا تو ہے بے ادبی  
سرمہ چشم بناؤں ترے کوچے کا غبار  
سر کے بل حاضر خدمت ہوں اگر ہو طلسمی  
ہماری دعا ہے کہ ذکر و فکر مصطفیٰ ﷺ کے فیوض ابدی سے مستنیر ہونے والا نجمِ کامل دنیائے  
مدحت و نعت میں اسی طور ایمان و یقین کی روشنی لٹاتا رہے اور مستقبل کے وجود سے ابھرنے والے  
قافلے اس سر بلند و سرفراز نعت گو شاعر کے کلام کی تاثیر کی بدولت ذوقِ عقیدت حضور ﷺ سے بہرہ  
یاب ہوتے رہیں۔ صاحبو! آج انہیں دیکھ لو، اپنی نگاہوں میں سمیٹ لو۔ قبل اس کے یہ حسین عہد  
حال پر ملال ماضی میں تبدیل ہو جائے، نظیر لدھیانوی کی صحبت کو غنیمت جانو۔ کہیں سے آپ  
بقائے دوام ڈھونڈ لو کہ تقدیر کا قاضی ہر آن ہمیں یہ پیغام دے رہا ہے کہ  
جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں  
کہیں سے آپ بقائے دوام لا ساتی

☆.....☆.....☆



## کاروانِ مدحت کا ممتاز رکن

### راجہ رشید محمود

کاروانِ مدحت نگارانِ رسول کریم ﷺ بلاشبہ تاریخِ عالمِ انسانی کا سب سے زیادہ خوش بخت قافلہ ہے۔ یہ وہی کاروانِ عشق و سرمستی ہے جو ازل کی صبح سعید کی تجلیات سمیٹتا ہوا ابد کی آفاقی ساعتوں کی جانب رواں دواں ہے۔ لامتناہی مدت پر محیط یہ قافلہ جذباتِ ذوق و شوق کی رفعتیں سمیٹتا ہوا مسلسل آگے کو بڑھ رہا ہے۔ یہ وہی کاروانِ شوق ہے کہ جس کی رفتار کبھی کم یا مدہم نہیں ہونے پائی۔ اس قافلے کا ہر مسافر شوق بے کراں سے سرشار اور محبتِ رسول ﷺ سے بے قرار ہے۔ اس قافلے نے پڑاؤ یا قیام کی مصلحتیں نہیں سیکھیں بلکہ ہر آنے والا دور اس قافلے کی تیز رفتاری میں پہلے سے کہیں زیادہ شدت کے مظاہر دیکھ رہا ہوتا ہے۔ فصلِ گل و لالہ اور بہار و خزاں کے تصورات سے بے نیاز اس قافلے کے قدموں کی چاپ سے شبستانِ وجود لرزتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ہر آن ہر ساعت، ہر لمحہ عقیدتوں کی سوغات بانٹتا ہوا یہ قافلہ گدبِ خضریٰ اور مکیں گدبِ خضریٰ کے سعادت آفریں تصورات میں کھویا ہوا جادو دانی نقوش ثبت کرتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔

اگرچہ اس قافلہء جذب و شوق کا ہر رکن محترم اور وجہ صد افتخار ہے لیکن صدیوں کے تسلسل میں سفر کرنے والے اس قافلے میں بعض سعید بخت مسافروں کی آوازیں دوسروں کی نسبت کہیں زیادہ بلند آہنگ اور پرتاثر لہجے کی غماز محسوس ہونے لگتی ہیں۔ ان آوازوں کے حسنِ تاثیر اور پرکشش لب و لہجہ کو دیکھ کر اولین احساس اُبھرتا ہے کہ یہ آوازیں ان حدی خوانوں کی ہیں جو اس کاروانِ شوق کی رفتار کو تیز سے تیز تر کرنے کے لئے دوسروں کی نسبت کہیں زیادہ دلکش لے میں نعماتِ حبِ رسول ﷺ الاپ رہے ہیں۔ حسان بن ثابتؓ، کعب بن زبیرؓ، امام بوصریؓ، عبدالرحمن جامی، قدسی، کرامت علی شہیدی، محسن کا کوردی، احمد رضا خاں، علامہ اقبال، ظفر علی خاں یہ سب حدی خوان ہی تو ہیں جنہوں نے مختلف ادوار میں عقیدتوں کی کہکشاں لٹائی اور مدحت و توصیف مصطفیٰ ﷺ کی خوشبو پھیلائی ہے۔ ان حدی خوانوں نے اس کاروانِ مدحت و ثنا کے مسافروں کی منزلِ پیما کی نئے نئے اسلوبِ بخشے ہیں۔ عہدِ حاضر کے مدحت نگار منزلِ شوق کی جانب سفر



کرتے ہوئے ان حدی خوانوں کی آوازوں سے ذہن و فکر کی بالیدگی کا اہتمام کر رہے ہیں۔  
 اگرچہ ہر دور و نعت ہے لیکن عصر حاضر کے شعراء جتنی بڑی تعداد میں اس صنفِ ادب کی طرف متوجہ ہوئے ہیں اس کا تذکرہ ایمان آفریں بھی ہے اور باعث اعزاز بھی، کتنے ہی سر بلند نام ہیں جو اپنے موثر وجود کا احساس دلارہے ہیں لیکن ایسے شعراء کہ جنہوں نے اوائلِ عمر سے نعت کہنی شروع کی اور آج تک مسلسل کہہ رہے ہیں اور اس دوران میں انہیں کسی دوسری صنفِ شاعری نے اپنے ظلم کا اسیر نہیں بنایا ان کی تعداد بہت کم ہے۔ ان میں سے ایک نام راجہ رشید محمود کا ہے جو ایک طویل مدت سے کوچہ نعت سے آشنائی کا حق ادا کر رہے ہیں۔ راجہ رشید محمود نے شعر گوئی کی ابتدا صنفِ نعت سے کی اور پھر ہمیشہ کے لئے اسی کوچہ مدحت و ثنا کے ہو رہے۔ ان کا کلام مدتوں سے وطنِ عزیز کے قابلِ قدر رسائل و جرائد میں شائع ہو رہا ہے اور اب تک ان کے دو نعتیہ مجموعے، ”وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ“ اور ”حدیث شوق“ کے عنوانات سے شائع ہو چکے ہیں۔ راجہ رشید محمود کوچہ مدحت و نعت مصطفیٰ ﷺ سے اپنی دائمی وابستگی پر از حد نازاں ہیں۔ ان کے نعتیہ اشعار میں جا بجا اس افتخار کی جگمگاہٹ دکھائی دیتی ہے۔

میرا فکر و فن نبیؐ کے ذکر تک محدود ہے  
 خالقِ کونین کا مجھ پر کرم ہے جو د ہے

.....☆☆.....

مجھ پہ ہے محمود سرکارِ دو عالم کا کرم  
 نعت گو ہوں آپ کی چشمِ عنایت کے سبب

.....☆☆.....

پائے گا بارگاہِ رسالت سے ہر مراد  
 محمود کی طرح کوئی مدحت سرا تو ہو

.....☆☆.....

مجھے محمود احساسِ تفاخر کیوں نہ ہو دل میں  
 کہ آئی میرے حصے میں محمد ﷺ کی شاخوانی  
 جب سے ذوقِ شاعری محمود کو حاصل ہوا  
 آپ کی مدحت ہے موضوعِ سخن شاہِ زمن



سنتِ ربِ العلیٰ ہے وجہِ اطمینانِ قلب  
نعت کہتا ہوں تو میں رہتا ہوں کیسا مطمئن  
نعت میں محمود جب میں خامہ فرسا ہو گیا  
حرف خوش ہیں لفظ شیریں ہیں تو معنی مطمئن

نعت وہ ذریعہ اظہار ہے جس کی بدولت عشاقِ احمد رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے آقا و مولا کی مدحت کا موقع میسر آتا ہے۔ شعراء کو نعتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت اپنے جذباتِ قلبی کو شاعری کے موزوں قالب میں ڈھالنے کی سعادت نصیب ہوتی ہے۔ نعت فی الحقیقت صفت و ثنائے مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کا احسن ترین ذریعہ ہے صفت و ثنائے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم خدا کو بھی عزیز ہے اور بندگانِ خدا کو بھی، فرشتوں کو بھی مرغوب ہے اور حور و غلمان کو بھی۔ ایک صاحبِ ایمان نعتِ رسول پیش کر کے جہاں اپنے محسوساتِ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نذر کرتا ہے وہاں وہ اس افتخار سے بھی سرشار ہوتا ہے کہ نعت کہہ کر وہ فقط ملائکہ ہی کی تقلید نہیں کر رہا بلکہ سنتِ خداوندی بھی ادا کر رہا ہے۔ نعت کی بدولت ایمان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقاماتِ قدسیہ سے آگاہی اور آپ کی تعلیمات کی پیروی کا سلیقہ بھی عطا ہوتا ہے۔ راجہ رشید محمود ثنائے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ثنائے خدا کا مصداق قرار دیتے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے بے مثال حسن صورت و سیرت کو خراجِ عقیدت پیش کر کے ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خالق اکبر کی ثنا کا حق ادا کیا جاسکتا ہے۔ رشید محمود کے اشعار میں مدحتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی قدر و منزلت دیکھئے۔

نعت ہے بے دینی والحاد کے سم کا علاج  
یہ دوا ہے ذہن کے امراضِ پیہم کا علاج  
آپ کی مدحت میں ہے خوشنودی ربِ العلیٰ  
آپ کی سنت میں ہے درودِ دو عالم کا علاج

.....☆☆.....

ہم کھولتے ہیں راز کہ کس سے ہے کیا مراد  
نعت رسولؐ سے ہے ثنائے خدا مراد  
مذاحیؐ نبیؐ کو کیا جس نے اختیار  
وہ شخص کامگار ہے وہ شخص بامراد

.....☆☆.....



جب نعت سے تطہیر خیالات ہوئی تھی

پھر جا کے کہیں حمد و مناجات ہوئی تھی

حضور اکرم ﷺ اس کائنات میں تعلیمات قدسیہ کی صورت میں جو سرچشمہ ہدایت لے کر آئے تھے اس نے چند ہی برسوں میں عرب معاشرہ اور پھر پوری دنیا میں حیرت انگیز ایمانی انقلاب برپا کر دیا تھا۔ آپ صورت و سیرت کے لحاظ سے بے مثال اور بے نظیر ہیں۔ رب دو عالم نے آپ کی شخصیت میں ازل سے ابد تک کے جملہ محاسن سمو دیئے ہیں۔ آپ کی تعلیمات برحق اور آپ کے جملہ ارشادات قوانین فطرت کی صورت اٹل ہیں۔ قرآن حکیم آپ کی عظمتوں کا شاہد اور گواہ ہے۔ آپ نے اپنی جادو دانی سیرت کی خوشبو بکھیر کر جس طرح زمانے بھر کو معطر کر دیا تھا۔ اس کا تذکرہ فکر آفریں بھی ہے اور فرحت انگیز بھی۔ ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ کے بقول جس نے سیرت حضور ﷺ کی شان دیکھنی ہو وہ قرآن حکیم کا مطالعہ کرے۔ قرآنی آیات کے پس منظر سے حضور ﷺ کی سیرت مبارکہ طلعتیں بکھیرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ حضور ﷺ کی ذات والا صفات پر لکھنے کا حق اس وقت تک ادا نہیں ہو سکتا جب تک آپ کے زندہ جاوید کردار کا مطالعہ نہ کیا جائے۔ آپ کا خلق حسیں، آپ کی رحمت بے کراں، آپ کی غریب نوازی، الفقیر فخری فرما کر دنیا بھر کے ٹھکرائے ہوئے خستہ جانوں کو اپنا کہہ کر سینے سے لگانا، حق و صداقت کی پاسداری، بے مثال قیادت، لازوال سیادت، صلح و جنگ کے اصولوں کی ترتیب، عفو و درگزر کی باران عام، سماجی زندگی کی تابانیاں، سیاسی معاملہ بندی، آداب حکومت، خدوخال معیشت غرضیکہ آپ کی سیرت عالیہ کا ورق ورق ہر عہد کے مؤرخین کے لئے روحانی دلچسپی اور جذباتی وابستگی کا مظہر رہا ہے۔ ایک صاحب ایمان مدحت نگار کی حیثیت سے رشید محمود نے اپنے آقا و مولا کی مقدس سیرت کے مختلف گوشوں کا سیر حاصل مطالعہ کیا ہے اور جہاں بھی موقعہ میسر آیا ہے جی بھر کر خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ راجہ رشید محمود اس ادراک سے بہرہ ور ہیں کہ آج کے دور میں جبکہ ہم چاروں طرف سے روشنی لے کر ہی قلب و نظر کو ایمانی جگمگاہٹ عطا کرنے کا اہتمام کر سکتے ہیں۔ ان کو احساس ہے یہ فقط سیرت محمدی ﷺ ہی کی جلوہ گری تھی کہ راہزن راہبر بن گئے بت پرستوں کو توحید خداوندی کا شعور عطا ہوا کمزوروں کی عزت سے کھیلنے والے اقوام عالم کی عظمت کے پاسبان بن گئے، جادہ حق سے غیر آشنا انسان صراطِ مستقیم پر گامزن ہو گئے۔ الحمد للہ راجہ رشید محمود اس حقیقت سے بہرہ ور ہیں کہ آج کے مسائل کی تلخیوں سے فقط اس صورت نجات حاصل ہو سکتی ہے کہ ہم حضور ﷺ کے



کردار کے ایک ایک لمحہ کو حاصل زیست تصور کرتے ہوئے اس سے فکری روشنی اور عملی راہنمائی حاصل کریں۔ رشید محمود سیرت رسول ﷺ کی سر بلند یوں کو کس طور مد نظر رکھتے ہیں ملاحظہ کیجئے۔

ہے خلق و عدل و مروت کا باغ ہی ایسا  
مدام جس جگہ مہکے حضور کی سیرت  
جہاں کو کفر و ضلالت کے گھپ اندھیروں سے  
نکال لائی ہے کب سے حضور کی سیرت  
انہی پہ چل کے حیاتِ دوام پاؤ گے  
دکھا گئی ہے جو رستے حضور کی سیرت  
خدا کی ذات کو پہچانا ہے ناممکن  
نظر میں جب نہ ہو پہلے حضور کی سیرت  
رہِ خلوص کے جتنے ہیں راہوار ان کو  
چراغِ طور ہے مرے حضور کی سیرت

حضور ﷺ سرورِ کائنات فخرِ موجودات علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرتِ اقدس تک رسائی پانے کا پہلا ذریعہ آپ کے وہ فرمودات ہیں جو آپ کی زبانِ اقدس سے ادا ہوئے۔ آپ کی تعلیمات نے بے شمار انسانوں کے دلوں میں یوں گھر کیا کہ پھر وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آپ کی غلامی کو اپنے لئے سدا عزاز تصور کرنے لگے۔ حضور ﷺ کا اُسوۂ حسنہ کہ جسے خدا نے لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فرما کر ہر عہد کے انسانوں کے لئے نمونہء عمل قرار دیا ہے۔ ایک ایسے مینارۂ ایمان و یقین کی صورت اختیار کر گیا کہ جس سے پھوٹنے والی لرنیں ظلمت کدوں میں اُجالے لٹا رہی ہیں۔ اب ہم راجہ رشید محمود کے عنبرِ بارِ قلم سے پھوٹنے والے نعتیہ اشعار میں تعلیماتِ محبوبِ خدا ﷺ کی سر بلندیاں دیکھتے ہیں۔

میرے آقا نے دیا ہے وہ اخوت کا سبق  
غیر تھے سب ہو گئے ہیں آج ہم تم آشنا  
آپ نے تہذیبِ انساں کو عطا کر دی زباں  
جس قدر تھے گنگ وہ سب ہیں تکلم آشنا

.....☆☆.....



توڑنے کے لئے آئے تھے خدا کے محبوب  
اہل دنیا نے جو معبود بنائے پتھر  
ان کے اصحاب نے اپنا مشقت کو اگر  
بادشاہِ دو جہاں نے بھی اٹھائے پتھر

.....☆☆.....

توڑ دی محکومیٰ انساں کی زنجیر آپ نے  
آپ سے ہم کو نصیب آزادیء کامل ہوئی  
سرورِ کون و مکاں کی اک نگاہِ لطف سے  
آشنائے رازِ اِلَّا اللہ مشیتِ گل ہوئی

.....☆☆.....

زندانیِ حرص و آرزو میں محبوس تھی حیات  
آقا حضور آجئے تو اس کو کیا رہا  
خوں کے سمندروں میں اترے ہوئے تھے لوگ  
سرکار کے طفیل ہوئے مہر آشنا  
مظلوم سر اٹھا کے چلا آپ کے طفیل  
عفریتِ ظلم و جور جو تھا سرنگوں ہوا

.....☆☆.....

آپ کے فیض سے ہم خلق میں اشرف ٹھہرے  
آپ کے نور سے یہ خاک کا پیکر چمکے  
دن پہ بھی رات کا منظر تھا مسلط پہلے  
روئے پُر نور سے جب صبح کے تیور چمکے

راجہ رشید محمود نعت کے فنی بانگین سے آگاہ ہیں وہ جانتے ہیں کہ اگرچہ نعت ہر صنفِ سخن  
میں کہی جاسکتی ہے اور بے شمار نعت گو شعراء کی شعری کاوشیں اس امر پر شاہد ہیں۔ لیکن نعت کو جو  
سوز و گداز، ذوق و شوق اور وارفتگی کا اظہار غزل کے پیرایے میں عطا ہوتا ہے وہ کسی اور صنفِ سخن  
میں میسر نہیں آتا۔ اس لئے نامور نعت گو شعراء کا جو کلام آج زبانِ زدِ عام ہے اس میں سے بیشتر



اندازِ غزل لئے ہوئے ہے۔ قافیہ اور ردیف کی پابندی اور بحر کی موزونیت سے نعتیہ کلام جاودانی تب و تاب سے ہمکنار ہونے لگتا ہے۔ حسنِ تغزل کی بدولت جذبے نکھرتے، احساسات مچلتے اور تصورات صداقتوں کے قالب میں ڈھلتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ حسنِ تغزل کی بدولت گنگ جذبات قوتِ گویائی پاتے اور بے جان الفاظِ تکلم کا لبادہ اوڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ رشید محمود اس حقیقت سے بھی باخبر ہیں کہ یہ حسنِ تغزل کسی دوکانِ آئینہ ساز سے مستعار نہیں ملتا بلکہ یہ تو دل کی گہرائیوں سے ابھرتا اور ذوق و شوق کی پہنائیوں سے بحرِ بے کراں کی صورت نمودار ہوتا ہے۔ اس کی توفیق ارادتا ارزاں نہیں ہوتی بلکہ یہ تو عشق و عقیدتِ رسول ﷺ کی رفعتوں سے اپنا خراج حاصل کرتا ہے۔ رشید محمود کا حسنِ تغزل کسی مجازی محبوب کی زلفوں کے پیچ و خم کا اسیر نہیں ہے اور نہ ہی کسی حسنِ فانی کی طلسم کاریوں کا مقید ہے۔ بلکہ انہوں نے عشق و عقیدت کی پہنائیوں سے ابھرنے والے شعری ذوق کا رشتہ اس ہستیء والا صفات سے استوار کیا ہے جو محبوب و مطلوب کائنات ہے۔ جس کے چہرے کی تابانیوں سے مہر و ماہ ضیائیں مستعار لیتے اور جس کے نقوش قدم سے کہکشاں کو اذنِ وجود عطا ہوتا ہے۔ جب محبوب فکر و نظر وہ ذات ہو جس کے لئے کتاب ہستی تصنیف ہوتی ہے تو پھر حسنِ تغزل اپنی معراج کو کیوں نہ پہنچے گا۔ اسی حسنِ تغزل کی ایک جھلک نذرِ قارئین ہے۔

ذکرِ دنیا میں ترستے تھے جو شبنم کے لئے  
خشک لب وہ مدحِ آقا میں ہیں قلمِ آشنا  
رات ان آنکھوں میں ہیں ذراتِ کوئے مصطفیٰ  
میرا دامنِ نظر ہے ماہ و انجم آشنا

.....☆☆.....

آنکھیں ہیں ان کی یاد کے پانی سے با وضو  
پہلی یہ شقِ شرائطِ ذوقِ نظر کی ہے  
گہرے سمندروں میں ملے ساحلِ مراد  
یادِ رسولِ پاک میں خواہشِ گہر کی ہے  
خیر البشر کے عشق و عقیدت کی لاگ ہو  
لاریب احتیاج یہ اوجِ بشر کی ہے



کیا اور کوئی چہرہ سمائے گا نظر میں

سرکار کا ہے دل پہ سراپا اثر انداز

جب آپ اُمت کا استغاثہ حضور ﷺ کے دربار میں پیش کرتے ہیں تو ایک دردمند مسلمان ہونے کے ناتے ان کی نظر ملکی مسائل پر بھی ہے اور پوری ملت اسلامیہ کو درپیش مسائل کی شدت پر بھی، جس طرح ایک قطرہ کتنا بھی معمولی ہو آخر بحر آشنا ہوتا ہے اسی طرح رشید محمود اپنی ذات تنہا میں اپنے مسائل کے حصار میں گھر کر بھی خود کو ملت اسلامیہ کا ایک فرد تصور کرتے ہیں۔ ایسا فرد جو پوری اُمت اسلام کے آلام و مصائب کو ذاتی رنج و غم کے حوالے سے دیکھتا ہے۔ اس لئے یہ دربار حضور ﷺ سرورِ کائنات میں فسانہ غم سناتے ہیں۔ ان کی فریاد میں کہیں کہیں حالی کی اس فریاد کا حسن جھلکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

اے خاصہ خاضانِ رسل وقتِ دعا ہے

اُمت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے

اپنے آلام و مصائب کی داستانِ بارگاہِ سرورِ عالم ﷺ میں پیش کرتے ہوئے رشید محمود مسلسل اس احساس سے سرشار ہیں کہ اگر میرے درد و سوز نے حضور ﷺ کی رحمت بے کراں تک رسائی حاصل کر لی اور آپ مہربان ہو گئے تو پھر رنج و غم کی تاریکیاں چھٹ جائیں گی، آلام و مصائب کے بادل چھٹ جائیں گے۔ مصائب خواہ قومی ہیں یا انفرادی یکا یک پیچھا چھوڑ دیں گے اور حالات کے اُفق پر عظمت اسلام کا روشن سویرا طلوع ہوگا۔

آپ کی چشمِ کرم سے مندمل ہو جائیں گے

جسمِ ملت پر اگرچہ زخم ہیں کاری بہت

اس کا دامنِ پیار کے پھولوں سے پھر بھردیجئے

آپ کو اُمت ہمیشہ ہی سے ہے پیاری بہت

میرے آقا دیکھئے اُمت کا اب کیا حال ہے

سرد ہے جذبہ عمل کا، گرم گفتاری بہت

نام لیوا آپ کے ہیں کیجئے اب سرفراز

آہ اقوامِ جہاں میں ہو چکی خواری بہت

☆ ☆ .....



اپنی اُمت پر نگاہِ لطف و رحمت کیجئے  
ہے ستم ایجادِ چرخِ نیلگوں میرے حضور

.....☆☆.....

برہنہ پاہوں پیاسا پھر رہا ہوں دشتِ ہستی میں  
خدا کے واسطے ابرِ کرم سے ہو مدد آقا  
دھنک کے رنگِ بخشش کے طراوت میری آنکھوں کو  
جو اشکوں کے سمندر سے اٹھے گا جزو مد آقا

.....☆☆.....

حالت چھپی ہوئی کوئی سرکار سے نہیں  
دنیا میں کیفیت جو یہ سب شور و شر کی ہے  
حدت میں معصیت کی جھلکتے ہیں رات دن  
خواہش جو ہے تو سایہ دیوار و در کی ہے  
ایسے میں اور کسی سے مدد ہم طلب کریں  
محمود ان کے در سے تمنا ظفر کی ہے

عشقِ سرور کو نبی ﷺ کی روشنی سے احساسات کو منور کرنے والے ہر صاحبِ نظر کی یہی  
آرزو ہوا کرتی ہے کہ اسے حضور ﷺ کا دیدار میسر آ جائے۔ اگر یہ سعادت میسر آنی ممکن نہیں ہے تو  
پھر گلبِ خضریٰ کی چھاؤں میں ہی زندگی گزارنے کا اذن مل جائے۔ نعت گو شاعر اس ضمن میں کبھی  
تو حضرت حسان بن ثابت کی سرفرازیوں کا تصور کرتا ہے اور کبھی حضرت کعب بن زہیرؓ پر ہونے  
والی نوازشاتِ نبوی کے احساس سے اپنی سعید بختی کی اُمید استوار کرنے لگتا ہے کبھی اسے امام  
بصیریؒ کو عطا ہونے والی چادرِ اقدس کا خیال آتا ہے اور کبھی مولانا جامیؒ کی شاد کامی کا تذکرہ اس کا  
حوصلہ بندھانے لگتا ہے۔ مدحت نگار نے دیدِ حضور ﷺ یا ارضِ نبی ﷺ میں زندگی گزارنے کی  
جس منزل کا تصور حاصل آرزو بنا رکھا ہوتا ہے وہ بڑی مشکل سے حاصل ہوتی ہے اور پھر جسے میسر  
آ جائے وہ پھر عالمِ ہوش میں کب رہتا ہے کہ دوسروں تک اپنی شادمانی کے گلفشاں تذکرے پہنچا  
سکے۔ اسی لئے جب تک یہ مددِ عائی مقصود حاصل نہیں ہوتا اس وقت تک ہجر و فراق اس صاحب  
نظر کا مقدر بنے رہتے ہیں۔



رشید محمود نے بھی اس خاورِ حجاز صلی اللہ علیہ وسلم کی تابانیوں کو دل و جان میں بسا رکھا ہے۔ ان کا حقیقی مقصد حیاتِ حصولِ خوشنودی و رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ ان کا مدّے عائے عشق نگہ الطافِ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ ان کے تصوراتِ تجلیاتِ حسنِ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے آباد ہیں تو احساساتِ سیرتِ مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کی جلوہ افروزیوں سے جگمگا رہے ہیں۔ ان کے نعتیہ مجموعوں کے مطالعہ سے قدم قدم پر یہی احساس اُبھرتا ہے کہ یہ اپنے آقا و مولا کی حیاتِ مقدسہ کے ہر پہلو کو حاصلِ ایمان بنائے ہوئے ہیں۔ جب راہوارِ عشقِ منزلِ شوق کی جانب آگے بڑھتا ہے تو انکے قلب و نظر سے بھی حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے نورانی جلوؤں سے مستنیر ہونے کی آرزو اُبھرتی ہے۔ مسلمان اسی آرزو میں جیتا اور اسی آرزو میں مرنا عظمتِ ایمان تصور کرتا ہے۔ رشید محمود کے خلوتِ کدہ حیات سے بھی یہی صدا اُبھر رہی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے غلام کو نواز دیجئے۔ اپنے درِ اقدس میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بلا لیجئے کہ زندگی پھر وہیں پر تمام ہو جائے لیکن جب یہ سعید ساعتیں میسر نہیں آتیں تو مہجوری کی شدتیں رشید محمود کے قلم سے عقیدت و وارفتگی کا خراج لینے لگتی ہیں۔

فرقت و مہجوری کے مضامین کو گوشعراء نے اپنے اپنے انداز میں بیان کیا ہے۔ فرقت و مہجوری کا ہی فیضان ہوتا ہے کہ مہجوری و دوری کی آتشِ شوق میں جلنے والا مسِ خام سے کندن بننے لگتا ہے اور صدفِ حیات میں تڑپنے والے قطرہٗ ناپز کو گہر کی آب و تاب میسر آنے لگتی ہے۔ محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اعزازِ زندگی بنانے والے کے لئے یہ مہجوری کتنی حسرت آفریں کیوں نہ ہو بہر حال اس احساس سے ضرور سرشار کر جاتی ہیں کہ اس کا کام فقط اظہارِ مہجوری ہی ہے۔ اذن باریابی عطا کرنا آقا کا کام ہے اور یقیناً وہ ایک دن ضرور اپنے چاہنے والے کو گوہرِ مراد عطا فرمائیں گے۔ رشید محمود بھی اس توقع پر مہجوری کی تلخیوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نوازشات کی جھلک دیکھ رہے ہیں۔ یہ مہجوری ان کے لئے کتنی ہی ناقابلِ برداشت کیوں نہ ہو۔ ان کے لئے اُمیدِ الطافِ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ بھی استوار کر رہی ہے کہ جس طرح ہر شب تاریک کے بعد دن کے اُجالے بکھرتے ہیں اس طرح یہ شب مہجوری بھی ایک دن ان کے لئے دیارِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے سرفراز کئے جانے کا باعث بنے گی۔

کعبہ خضریٰ سے دوری کا الم کچھ کم نہیں  
کیوں نہ ہو آنکھوں سے آخراشک افشانی شروع  
بعد طیبہ میں ہے سیلِ آبِ محسوسات کا  
ہوگئی جذبات کے طوفاں سے طغیانی شروع



.....☆☆.....

دل کو ہے آنحضورؐ کی یادوں سے واسطہ  
یہ بات ایک دن کی نہیں عمر بھر کی ہے  
اک بار تو مجھے بھی مدینے بلائے  
یہ التجا مرے دلِ حسرت اثر کی ہے

.....☆☆.....

غمِ فراقِ دیارِ حبیب کے باعث  
ہجومِ اشکِ رواں چشمِ تر میں رہتا ہے  
مری نظر میں نمِ آلود سے دھندلے ہیں  
کہ دلِ فراقِ نبیؐ کے اثر میں رہتا ہے

.....☆☆.....

خامہٗ احساس سے لکھتا ہوں مصحفِ ہجر کا  
چشمِ پر خوں سے ہوئی مرقوم یہ دل کی کتاب  
خواہشِ دیدِ نبیؐ دل میں جواں رکھتا ہوں میں  
رنگ لے آئے گا آخر ان ارادوں کا شباب

.....☆☆.....

یا رب ذوالجلال دعا کو اثر ملے  
وقفِ شبِ فراقِ نبیؐ ہوں سحر ملے

رشید محمود غمِ ہجر مدینہ میں کھو چکے ہیں کیونکہ یہ غم انہیں ہر پل ہر ساعت یادِ حضور ﷺ اور پھر  
ذکرِ حضور ﷺ کی سعادت بخشتا رہتا ہے۔ ہجر مدینہ کی تلخیاں آہستہ آہستہ ان کے لئے شادکامی کا  
ذریعہ بنتی جا رہی ہیں کہ ان کے طفیل انہیں یادِ رسول کریم ﷺ سے ہٹ کر کسی اور طرف دیکھنے کی  
فرصت ہی نہیں ہے یہی مہجوری ان کے لئے لذتِ آفریں ہو چکی ہے اور حق تو یہ ہے کہ یہی عشق کا  
کمال ہے۔ رشید محمود دعا گو ہیں کہ یہ لذتِ غمِ ہجر مدینہ تمام عشاقِ مصطفیٰ ﷺ کو نصیب ہو جائے۔

دل میرا غمِ ہجرِ مدینہ میں مگن ہے  
اللہ کرے سب پہ ہو لذتِ غمِ عام



محمود کہ ہے بندہ خاص اپنے نبیؐ کا

ذکرِ شہِ ابرار ہی کرتا ہے رقمِ عام

جب مہجوری مقدر بن جائے تو پھر چاہنے والا اپنے محبوب کی یاد سے فکر و نظر کی خلوتیں آباد کر کے سرشاری و سرفرازی کا سامان فراہم کرتا ہے۔ وہ اٹھتے بیٹھتے ہر ساعت سرورِ کائنات فخرِ موجودات ﷺ کی عنبر بار یادوں سے اپنے جذبات کو مہکائے رکھتا ہے۔ حضور ﷺ کی باتیں، حضور ﷺ کی یادیں حضور ﷺ کی صورت، حضور ﷺ کی سیرت غرضیکہ حضور ﷺ کی زندگی کا ایک ایک ورق اس کے لیے جمالِ آرزو بن جاتا ہے۔ رشید محمود بھی محبوبِ خدا ﷺ کی حسین و دلاویز یادوں سے اپنے تصورات کو آباد رکھے ہوئے ہیں۔ حضور ﷺ کی گفتار کی شیرینی، آپ کے کردار کی دلنوازی، آپ کی حیاتِ مقدسہ کی جلوہ کاریاں ﷺ، آپ کی رحمت بے کراں، آپ کے فیوض لا متناہی، آپ کے شہر مقدس کی رعنائیاں، آپ کے روضہ اقدس کی تابانیاں یہ سب رشید محمود کی یاد کا حصہ بن کر انہیں زندہ رہنے کا سلیقہ عطا کرتے ہیں۔ حضور محمد مصطفیٰ ﷺ کی روشن روشن یادیں ان کے دل و جان کو بھی منور کرتی ہیں اور انہیں عشقِ مصطفیٰ ﷺ کی عظمتوں سے بھی ہمکنار کرتی ہیں۔ یادِ حضور ﷺ کے ضمن میں چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔

یادِ سرکارِ دو عالم زیست کا حاصل ہوئی  
مدحِ محبوبِ خدا وجہ قرارِ دل ہوئی  
اولِ اولِ روح و جاں پر تھا تَلَطُّفِ آپ کا  
آخرِ آخرِ یادِ آقا کی سراپا دل ہوئی  
عافیتِ محمود پائی ہے نبیؐ کے ذکر میں  
نعت ہی سے زندگی میری کسی قابل ہوئی

.....☆☆.....

دل میں یادِ نبیؐ در آئی ہے  
وا ہوا چشمِ نم کا دروازہ

.....☆☆.....

دن رات ہے حضوریِ طیبہ کی کیفیت  
اس کیفیت کو چشمِ تماشا سے کیا غرض



ذکرِ نبیؐ سے حال مرا مستنیر ہے

ماضی کی فکر کیا، غمِ فردا سے کیا غرض

شاعری کی ایک صفتِ خاص وہ مضمون آفرینی ہے جس کی بدولت شاعر اپنے مدعا و مفہوم کو ہر بار اچھوتا رنگ دے کر بیان کرتا ہے۔ دوسری اصنافِ شاعری کی نسبت مضمون آفرینی صنفِ غزل میں اور ہی رنگ دکھاتی ہے۔ جدید نعت چونکہ غزل کے قالب میں قافیہ و ردیف کی پابند ہو کر قبولیت عام کی مصداق ٹھہر چکی ہے اس لئے نعتیہ کلام میں مضمون آفرینی سونے پہ سہاگہ ثابت ہوا کرتی ہے۔ ”حدیثِ شوق“ اور پھر ”ورفعنا لک ذکرک“ میں رشید محمود کے قلم عقیدتِ رقم سے مضمون آفرینی کی نہایت بلند پایہ مثالیں قلوب و اذہان کو معتبر کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔

علامہ اقبال نے ایک مقام پر ربّ دو عالم سے التجا کرتے ہوئے کہا تھا کہ خدایا روزِ محشر تو میرا حساب حضورِ نبی کریم ﷺ سے چھپا کر لینا کہ اپنی گنہگار یوں کی بنا پر فرطِ ندامت سے میں ان کا سامنا نہیں کر سکوں گا۔

مکن رسوا حضورِ خواجہ ما را

حسابِ من ز چشمِ او نہاں گیر

اسی مضمون کو رشید محمود یوں بیان کرتے ہیں۔

اور تو فردِ عمل کی بات کیا جو ہے سو ہے

دیکھ لیں گے سرورِ کونین ڈراتا تو ہے

مضمون آفرینی کی چند اور مثالیں ملاحظہ کیجئے۔

خواب میں سرکارِ والا کی زیارت کیا ہوئی

آنکھ روشن، قلب ہے مسرور، چہرہ مطمئن

بے سبب اس کی سیہ پوشی نہیں اے دوستو

ہجرِ طیبہ میں کہاں آغوشِ طیبہ مطمئن

دیں دعائیں مرے آقا نے جو کھائے پھر

پھول بخشے انہیں جن لوگوں سے کھائے پھر

نصبِ آقا نے جو فرمایا خدا کے گھر میں

اہلِ اسلام کو کیونکر نہ وہ بھائے پھر



معجزے دیکھ کر سرکار کے مبہوت ہوئے  
اہل باطل جو تھے سارے نظر آئے پتھر

.....☆☆.....

دنیا کی فکر کیا غم عقبی کا ذکر کیا  
رحمت کناں یہاں ہیں تو شافع وہاں ہیں آپ  
رب ہے رحیم آپ شفیع و کریم ہیں  
ہم پر کرم خدا کا ہے اور مہرباں ہیں آپ

.....☆☆.....

آئے حضورؐ تو شب دیجور میں کھلا  
کیا شے ضیا ہے نورِ سحر کس کا نام ہے  
تشبیہات و استعارات بر محل ترا کیب، پلندیء خیال یہ وہ خصائص ہیں جو شعری حسن کو  
دوبالا کر دیتے ہیں۔ رشید محمود کی نعتوں میں ایک جھلک دیکھئے۔

نہیں کانٹے بیابانِ عرب میں  
کھلے ہیں یہ گل و ریحانِ فردوس  
گلستانِ عرب کا ایک غنچہ  
ہوا ہے رشکِ صد بستانِ فردوس

.....☆☆.....

میں نے جب سلجھائی ہیں زلفیں عروسِ نعت کی  
گیسوئے تقدیر میں پھر کس طرح خم رہ جائے گا

.....☆☆.....

پہنچو گے خاکِ راہ گزارِ حضورؐ تک  
نکلو گے تم جو کحلِ بصر کی تلاش میں  
باغِ حیات گلشنِ نا آفریدہ تھا  
آمد سے ان کی گل تر مسکرا اٹھا  
منزل ملی مسافرِ شب ہائے تار کو  
یعنی جمالِ صبحِ ازل کا نزول تھا



.....☆☆.....

چھینٹے جو ابر لطف پیمبر عطا کرے  
کیا بحر سے ہے واسطہ دریا سے کیا غرض  
دل ہوں سیاہ جن کے تکرر کی دھوپ سے  
نظروں کو ان کی کعبہ خضریٰ سے کیا غرض

رشید محمود نے جہاں سرکارِ نامدار سیدالابرار محمد مصطفیٰ ﷺ کے محاسن قدسیہ کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ جہاں آپ کے فضائل و کمالات کو موضوع شاعری بنایا ہے، جہاں آپ کی سیرت مقدسہ کی طلعتوں سے قلب و جاں کے نہاں خانوں کو متور کیا ہے۔ جہاں آپ کی تعلیمات اور ارشاداتِ عالیہ کی کہکشاں بکھیری ہے۔ جہاں آپ کے فیوض و برکات کا تذکرہ کیا ہے۔ وہاں کس طرح ممکن تھا کہ یہ شاہِ خوبانِ دو عالم کے حسنِ ظاہری اور صورتِ پاکیزہ کو شعری صلاحیتوں کا خراج پیش نہ کرتے۔ حضور محمد رسول اللہ ﷺ تو خدا اور مخلوقاتِ خدا کے محبوب ہیں۔ قرآن حکیم کے مطالعہ سے آپ کے حسنِ ظاہری کی جلوہ افروزیاں اُبھرتی نظر آتی ہیں۔ آپ کا حسن بے مثال خدائے کریم کی خلّاتی کا احسن ترین نمونہ ہے اور یہ آپ کے حسنِ ظاہری کا کمال تھا کہ بہت سے متلاشیانِ راہِ صداقت اسے دیکھتے ہی یہ کہتے ہوئے حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے کہ اس قدر حسین چہرہ کسی دردِ غم کو کا مقدر نہیں بن سکتا۔ گویا آپ کی غیر فانی سیرت کے ساتھ ساتھ آپ کی لاثانی صورت نے بھی تبلیغِ اسلام کے مشن کو آگے بڑھایا ہے۔ رشید محمود کی نعتیہ شاعری میں درجنوں ایسے اشعار ملتے ہیں۔ جن سے حضور ﷺ کے حسنِ ظاہری اور صورتِ اقدس کی پرانوار جھلکیاں ملتی ہیں۔

والضحیٰ ہے چہرہ پر نور کا عکسِ جمیل  
شرح ہے واللیل کی زلفِ معنبر مو بہو  
گردشِ دوراں ہے ان کی جنبشِ ابرو کا نام  
ان کے جلوؤں سے منور ہے جہانِ رنگ و بو

.....☆☆.....

اس سے پھر قائم ہوا دنیا میں خوشبو کا نظام  
تھا پسینہ آپ کا بوئے گلابِ بزمِ قدس

.....☆☆.....



ان کی آنکھوں سے بھلا مجھوب رہ سکتا ہے کیا  
خالق و مالک کو دیکھا ہے جنہوں نے بے حجاب

.....☆☆.....

برائے بدر بھی ہے اک اشارۂ انگشت  
پئے سلامی آقا ہلال ہی تو نہیں

.....☆☆.....

ظاہر ہوا ہے آیۂ مایعِ طوق سے راز  
ہے گفتہ رسولؐ سے وحی خدا مراد

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ بڑی بحروں میں بڑے مضامین ادا کئے جاسکتے ہیں حالانکہ یہ بات محض ایک مفروضہ ہے یہ تو کہنے والے کی صلاحیت ہوتی ہے وہ کتنے لفظوں میں کون سی بات کہہ سکتا ہے بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ تھوڑے لفظوں میں بڑا مفہوم ادا کرنا واقعی کارے وارد والی بات ہوتی ہے۔ کتنے ہی عظیم شعراء کی مثالیں موجود ہیں کہ جنہوں نے سہل ممتنع کا جادو جگاتے ہوئے چھوٹی بحروں میں آسان الفاظ اور تراکیب استعمال کر کے بلند پایہ مضامین ادا کئے ہیں۔ رشید محمود کے نعتیہ مجموعوں میں بھی ایسے بہت سے شعری نمونے نظر آتے ہیں جن سے شاعر کی قدرتِ فکر و فن اور شعری بانکپن اور نعت کے حوالے سے عقیدت کے والہانہ اظہار کا پتہ چلتا ہے۔ انہوں نے سادہ لفظوں اور عام فہم تراکیب کا سہارا لے کر اپنا مفہوم و مدعا اس ادبی مہارت اور فنی چابکدستی سے بیان کیا ہے کہ بعض حالتوں میں ان کی استعمال کردہ بڑی بحروں کی نسبت یہ چھوٹی بحریں زیادہ لطف دیتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ ہم مثال کے طور پر صرف ایک نعت سے چند اشعار پیش کر رہے ہیں۔ اس نعت میں رشید محمود نے دورِ حاضر میں مسلمانوں کی زبوں حالی کا استغاثہ دربار رسالت ﷺ میں پیش کیا ہے۔

شاہِ کوہ و زمن مرے آقا  
زیست کا بانکپن مرے آقا  
رحم فرمائیے کہ دورِ جدید  
ہے بہت پر فتن مرے آقا  
زر کے لات و منات پوجتے ہیں  
ہم کہ تھے خیر شکن مرے آقا



ہر برائی سے ربط ہم کو ہے  
 بگڑا ایسا چلن مرے آقا  
 کس کو ناموس مصطفیٰ کا پاس  
 کس کو فکرِ وطن مرے آقا  
 ہم نے کتنے ہی جان جوکھوں سے  
 جو لیا تھا وطن مرے آقا  
 بے خبر اس کی سالمیت سے  
 آج ہیں مطلقاً مرے آقا  
 آپ کی اک نظر کا طالب ہے  
 مرا عجزِ سخن مرے آقا

غرضیکہ رشید محمود کی نعتیہ شاعری عقیدت رسول کریم ﷺ کا ایک ایسا گلدستہ صدر رنگ ہے جس میں سجے ہوئے پھول اور کلیاں خوش رنگ بھی ہیں اور غنبر آفریں بھی۔ ان پھولوں میں حسن و جمال مصطفویٰ کی جمال افروزیاں بھی ہیں اور تعلیمات پاکیزہ کی مہکباریاں بھی۔ یہ گلدستہ غنبر آفریں جہاں ایک نظر دیکھنے سے مرصع کاری کا دلاویز نمونہ دکھائی دیتا ہے وہاں قریب جا کر بالا استیعاب مطالعہ کرنے سے اس کی لطافت میں کمی محسوس نہیں ہوتی بلکہ جوں جوں مطالعہ کرتے جائیں عقیدت و ارادت کی پھوٹی ہوئی روشنی اور جذب و شوق کی شدت سے پھوٹی ہوئی مہک اس کو نکھت و نور کا مصداق بناتی نظر آتی ہے۔ رشید محمود کا قلم جہاں عشق و عقیدت کی سر بلندیوں کو چھوتا ہے۔ وہاں ”بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر“ کے پیش نظر ادب و احتیاط کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ ان کی نعتیں محبت رسول ﷺ کی عظمتوں سے ہمکنار ہونے کے باوجود تعلیمات حضور ﷺ کے تقاضوں سے تہی نہیں ہیں۔ محبت رسول ﷺ کے فکری و عملی تقاضوں سے باخبر ہونے کی بنا پر رشید محمود اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ محبت اپنے ممدوح سراپا سے روحانی و فکری وابستگی کے ساتھ ساتھ اس کی سیرت اور سنت سے غیر مشروط اور غیر متزلزل وابستگی بھی مانگتی ہے۔ اس لئے رشید محمود کی نعتوں میں مقام مصطفیٰ ﷺ کی رفعتیں بھی ہیں اور نظام مصطفیٰ ﷺ کے روشن پہلوؤں کی طرف واضح اشارے بھی، آپ کے فضائل و کمالات کا تذکرہ بھی ہے اور آپ کے عادات و خصائل کا ذکر بھی آپ کے حسن صورت کی تجلیات بھی ہیں اور آپ کے کمال



سیرت کی جلوہ افروزیاں بھی۔ آپ کے نورِ ازیلی کی لمعہ افشائیاں بھی ہیں اور آپ کی بے مثال بشریت کی سنتِ عالیہ کی تابانیاں بھی۔ ذاتی حوالے سے اپنے آلامِ فرقت کی داستاں بھی ہے اور ملتِ اسلامیہ کے پر آشوب دورِ حال کا نوحہء غم بھی۔ رنگِ تغزل سے چٹکتے ہوئے ذوق و شوق کے غنچے بھی ہیں اور اسلام کی جاودانی تعلیمات سے بہاراں بہاراں شگوفے بھی۔ ان کی جملہ نعتوں کے تفصیلی مطالعے سے مرکزی تاثر یہی اُبھرتا ہے کہ رشیدِ محمود نے لازوال حسن و جمال سرورِ کونین کی جلوہ پاشیوں میں کھو کر ایک لمحہ کے لئے بھی اس حقیقت کو نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیا کہ آقائے دو عالم ﷺ کی تشریف فرمائی کا مقصدِ اولیٰ جملہ اوصافِ انسانی سے بہرہ ور ایک عالمگیر اسلامی معاشرے کو وجود میں لانا تھا۔ ہم اپنی اس تحریر کا اختتام رشیدِ محمود کے ان اشعار پر کر رہے ہیں جن سے ان کی بلند فکری اور ایمانی پختگی کا اظہار ہو رہا ہے۔

حُبِ پیغمبرؐ پہ ہے حُبِ خدا کی انحصار  
میرے آقاؐ کی اطاعتِ طاعتِ معبود ہے  
شرطِ ایماں ہے کہ اقرارِ رسالت بھی کرو  
صرف اقرارِ الوہیت یہاں بے سود ہے  
ہم زمانے میں رہیں گے خستہ حال و خوار و زار  
پیروی سیرت کی ہم میں جب تک مفقود ہے

☆☆☆



## ساغر کوثر کا تمنائی قمریزدانی

دنیا میں جو گلستان کھلتا ہے ایک روز نذر خزاں ہو جاتا ہے۔ مہکنے والا ہر پھول ایک روز مرجھا جاتا ہے مگر مدحت حضور ﷺ کا گلشن اس قدر سدا بہار ہے کہ اس پر کبھی خزاں نہ چھا سکے گی۔ ازل ہو یا ابد یہ گلشن ہر دور میں فصل گل و لالہ کے تصورات سے بے نیاز بہارِ جادواں کا مسکن رہا ہے۔ اس گلشن بے خزاں کی عنبر بار فضاؤں میں چند لمحے گزارتے ہی غیر معمولی روحانی انبساط کا احساس ہونے لگتا ہے یہاں کی کلیوں، غنچوں اور گلہائے تازہ کی خوشبو اس قدر تاثر انگیز ہے کہ احساسات بے اختیار اس کی دائمی تاثیر سے معنبر ہونے لگتے ہیں۔ سیدنا حسان بن ثابتؓ سے لے کر عصر حاضر کی مدحت طراز یوں تک بے شمار اصحابِ ایمان کے عشق و عقیدت کی لازوال مہک اس گلزارِ مدحت کا جز و لازم بن چکی ہے۔ نعتِ رسول ﷺ اظہارِ عقیدت کا ذریعہ بھی ہے اور سرمایہٴ آخرت بھی۔ ادبی و شعری ذوق کی جلا کا باعث بھی ہے اور دامانِ رسول سے وابستگی کا بھی۔ نعتِ رسول کے نام پر درود و سلام کے پھول نچھاور کرتے ہوئے دل و جان کو روحانی کیف میسر آتا ہے کہ اس کی بدولت بندہ ناچیز سنتِ خدا کی ادائیگی کا اعزاز حاصل کر رہا ہے۔ ملائک کی ہمسری ہو رہی ہے دونوں عالم میں سرخروئی میسر آ رہی ہے۔

یوں تو ہر صاحبِ ایمان کا مدعا یہی ہے کہ اسے اپنے آقا و مولا کی مدحت و توصیف کی سعادت میسر آئے اور اس مقصد کی خاطر وہ اپنی جملہ صلاحیتیں توصیفِ حضور ﷺ کی نذر کر دیتا ہے مگر بعض اصحابِ شوق ایسے بھی ہوتے ہیں، جن کی آواز ان کے زمانے کی ترجمان بن کر گونجتی ہے۔ جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے اس آواز میں مزید توانائی آتی جاتی ہے حتیٰ کہ ہر آنے والا دوران کے آوازہٴ توصیفِ حضور ﷺ ہی سے ان کے عہد کا تعین کرتا ہے۔ سیدنا حسان بن ثابتؓ، کعب بن زبیر، ام ابو حنیفہ، ام بصری، عبدالرحمن جامی، مولانا رومی، قدسی، کرامت علی شہیدی، محسن کاکوروی، علامہ محمد اقبال اور امام احمد رضا خاں ایسے ہی نمائندہ مدحت نگار ہیں کہ جن کے درود و سلام کے زمزمے آج بھی فضاؤں میں پورے ایمانی تزک و احتشام کے ساتھ گونج رہے ہیں۔ ان سر بلند نفوس قدسیہ نے مدحت نگاری کے جو چراغ روشن کئے ہیں وہ ماضی کے مختلف



ادوار میں ضیا پاشی کرتے ہوئے عصرِ حاضر کے چراغوں کو بھی اسمِ احمد ﷺ کی روشنی عطا کر رہے ہیں۔ چراغ سے چراغ جلتے ہی رہے ہیں۔ دورِ حاضر کے نمائندہ نعت گو قمریزدانی کا شمار بھی انہی خوش بختوں میں ہوتا ہے جن کو قدرت نے محبتِ حضور ﷺ کی روشنی سے اپنے چراغِ ایمان کو صوبار کرنے کی سعادت و دیعت کر دی ہے۔

قمریزدانی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے ہمیشہ نعتِ مصطفویٰ ﷺ کو اپنا اعزاز بنائے رکھا۔ تربیت اور پھر مزاج کے لحاظ سے نعت ان کے لئے زندگی کے ہر دور میں سرمایہٴ افتخار بن گئی۔ اور یہ آقائے رحمت ﷺ کی مدحت و ثنا میں ایسے محو ہوئے کہ ذہن و فکر کو کسی اور کوچہ کی گدائی کی فرصت ہی نہیں ملی۔ زندگی کی تلخیوں کو نعت کی روحانی حلاوتوں میں سمو کر انہوں نے فکری آسودگی کا سامان مہیا کیا ہے۔ ثنائے سرور کو نین ان کے نزدیک اتنی بڑی دولت ہے کہ اس کے سامنے دنیا کی ہر نعمت حقیر ہے اس سعادت کو اپنی خوش بختی سے تعبیر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

زبان ملی ہے مجھے حمدِ کبریا کے لئے  
یہ لب کھلے ہیں ثنائے شہِ ہدیٰ کے لئے  
شعورِ شعر و دیعت ہما ہے جب سے قمر  
قلم ہے وقف مرا نعتِ مصطفیٰ کے لئے

”ساقیء کوثر“ قمریزدانی کی وارداتِ قلبی کا نہایت عقیدت آفریں اظہار ہے جس میں شاعری کے پیرائے میں انہوں نے لفظوں کے گلاب کھلائے ہیں ایسے گلاب جو کبھی نہیں مرجھاتے بلکہ ہر دور ان کی لازوال مہک سے فکری تازگی کا سامان ڈھونڈتا ہے۔ قمریزدانی نے ساقی کوثر ﷺ کی مدحت سرائی کرتے ہوئے ساغرِ کوثر کی تمنا کی ہے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ نعت کا حقیقی مقصود خوشنودی رسول کا حصول ہے اور حضور ﷺ کی رضا جوئی انجام کارِ رحمتِ ایزدی کا مصداق ٹھہرتی ہے۔ اسی لئے ان کی نعتیں محبتِ حضور کے نام پر اطاعتِ حضور کا تقاضا کرتی ہیں۔ کیونکہ تسلیم و اطاعت سے بڑھ کر رضا جوئی کا اور کوئی وسیلہ نہیں ہے۔

اہلِ ایمان کو ہے قرآن کی تعلیم یہی  
ربِ اکبر کی اطاعت ہے اطاعت ان کی  
جان جاتی ہے تو جائے کہ یہ جائے گی ضرور  
حشر تک دل سے مگر جائے نہ الفت ان کی

قمریزدانی کی نعتیہ شاعری بلاشبہ عظمت و شانِ رسالتِ مآب ﷺ کے اظہار کی شاعری ہے۔ حضور کے اوصاف و خصائص، آپ کے کمالات و فضائل اور محاسن و محامد قمریزدانی کی نعت گوئی کا



موضوع خاص ہیں۔ قمر کو مقامِ رسول کریم کی رفعت کا غیر معمولی احساس ہے۔ حضور محبوبِ خدا ہیں۔ مطلوب دوسرا ہیں، شافعِ روزِ جزا ہیں، مظہرِ تجلیاتِ کبریا ہیں۔ آپ ازل سے ابد تک کے جملہ محاسن کا مجموعہ اور مصدرِ یسین و طہ ہیں۔ جب شاعر کا قلم تو صیفِ حضور ﷺ کی انتہائی بلندیوں کو چھو کر بھی کوتاہ و عاجز رہتا ہے تو پھر ”بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر“ کہہ کر اپنی قلبی طمانیت اور سرخروئی کے اسباب ڈھونڈتا ہے۔ قمریزدائی نے بھی حضور کی رفعت درجات کو دل کھول کر سپاسِ عقیدت پیش کیا ہے۔ خصائص و اوصافِ مصطفوی ﷺ کو اپنی شاعری کا ارمغان پیش کرتے ہوئے انہوں نے دامنِ حضور سے اپنی وابستگی کو فراموش نہیں کیا اور ہمیشہ اس احساس سے شاد کام رہے ہیں کہ ایک روز یہی نسبت ان کی دائمی سرخروئی کا سبب ٹھہرے گی اور آفتابِ نبوت ﷺ کی کوئی لازوال کرن اس ذرہ ناچیز کو بھی مستنیر کر دے گی۔ ان کے کلام میں عظمتِ حضور ﷺ کی ایک جھلک ملاحظہ کیجئے۔

خامہ فطرت کا نقشِ اولین تیرا وجود  
ہے عیاں تیری نگاہِ پاک پر غیب و شہود  
وجہِ تخلیق دو عالم مظہرِ نورِ ازل  
تیرے جلوؤں سے ہوئی آراستہ بزمِ شہود  
درد مند درد منداں چارہ سازِ بے کساں  
ہے ترا بابِ مقدس منبعِ فیضانِ وجود



شرما ہی جائیں دیکھیں اگر حسنِ مصطفیٰ  
آنکھیں ملائیں حوصلہ کیا مہر و ماہ کا  
وہ مخزنِ جمال جدھر سے گزر گئے  
ہر ذرہ آفتاب بنا خاکِ راہ کا

قمریزدائی کی نعت نگاری عشقِ محمد مصطفیٰ ﷺ کے فکری عرفان سے بہرہ ور ہے۔ حضور ﷺ کی محبت بلاشبہ حاصلِ ایمان ہے اور اس میں معمولی سی کمی واقع ہو جائے تو ایمان کے نامکمل ہونے کا احساس ڈرانے لگتا ہے۔ قمریزدائی نے اس محبت و ارادت کی دولت کو دل کے نہاں خانوں میں سنبھال کر رکھا ہے۔ اس مادی دور کی آلائشوں سے بے نیاز، عشقِ حضور ﷺ کی مہک سے گلزارِ آرزو کو ہر لحظہ شاداب رکھتے ہیں۔ سلطانِ دو عالم، ممدوحِ آدم و بنی آدم ﷺ سے ان کی محبت کسی عصری تقاضے کی مرہونِ منت نہیں بلکہ یہ محبت تو ان کے لئے تحدیثِ نعمت کا ذریعہ ہے



کہ اس کی بدولت مدحت و ثنا کی سعادت میسر آتی ہے۔ حضور ﷺ سے ان کی ارادت ان کے کمال شوق کی دلیل ہے جس میں ادب و احترام کے تمام زاویوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ انتہائے شوق میں بھی چشمِ تمنا گستاخ نہیں ہوتی بلکہ پلکوں پر آنسوؤں کے آگینے نکائے بارگاہِ حضور میں لرزیدہ رہتی ہے۔ قمریزدانی سمجھتے ہیں کہ یہی تو وہ بارگاہِ قدس ہے جہاں ملائکہ بھی خمیدہ سر حاضر ہوتے ہیں جہاں جنید و بایزید نفسِ گم کردہ رہتے ہیں، جہاں زندگی خود اذن و جود کی طلبگار رہتی ہے اور جہاں لفظِ ناکام اور جذبے باریاب ہوتے ہیں۔ اس احساس نے قمریزدانی کے قلم کو حقیقی نعت نگاری کی توفیق عطا کی ہے۔ نمائشی جذبوں اور تصنع آمیز مضامین سے پاک اُجلی اُجلی پاکیزہ یا کیزہ نعتیں شاعر کے والہانہ پن کے ساتھ ساتھ اس کے حسنِ اخلاص کی غماز ہیں۔ قمریزدانی کا حضور ﷺ سے اظہارِ عقیدت ایک ذرّہ ناچیز کا آفتابِ عالمتاب سے تمنائے وابستگی کا رنگ لئے ہوئے ہے۔ عامیانہ تراکیب، پامالیء خیالات اور مصنوعیت سے مبریٰ، عجز و احترام کی تمام تر شدتوں کے ساتھ محبتِ رسول کریم ﷺ کے قدسی جذبے کو اپنی شاعری کا موضوع بناتے ہیں۔

ملاحظہ کیجئے۔

عشقِ حبیبِ خالقِ ہر دوسرا ملا  
شکرِ خدا کہ مجھ کو مرا مدعا ملا  
ہم نے وہیں پہ سجدۂ الفت ادا کیا  
ان کا رہ طلب میں جہاں نقشِ پا ملا  
آئے جو میرے ہاتھ غبارِ رہِ حبیب  
سمجھوں گا مجھ کو سرمۂ چشمِ وفا ملا



پیکرِ نور ہے تو طاقتِ دیدار کے  
باوجود اس کے نظر پھر بھی تماشا ہی ہے  
کچھ ضرورت ہی نہیں شوکتِ شاہی کی اسے  
شاہِ لولاک! قمر تیرا ہی شیدائی ہے



دل وہی دل ہے تری جس میں ہے الفت محفوظ  
آنکھ وہ جس میں تری دید کی حسرت محفوظ  
یورشِ غم سے وہ کیوں ہو گا پریشاں خاطر  
جس کے سینے میں رہی تیری محبت محفوظ



آگیا جو ترے دامن میں رکھے گی اس کو  
فتنہ دہر سے اللہ کی رحمت محفوظ

جھک جاتے ہیں جبریل امیں بھی روبرو جن کے  
قلم میرا بھی ان کی نعت میں جھک جھک کے چلتا ہے

قمریزدائی کی نعتیہ شاعری میں تمام مروجہ مضامین اور اسالیب ملتے ہیں۔ خیال آرائی اور مضمون آفرینی کی بدولت شاعر اپنے قلم سے اسرارِ فطرت کو منکشف کر سکتا ہے مگر نعت نگاری میں چونکہ ہر گام پر ادب و احتیاط اور احترام شریعت رسولِ دامنگیر ہوتے ہیں اس لئے شاعر کے لئے محض داد و تحسین کی خاطر حقائق سے انحراف ممکن نہیں ہوتا۔ قمریزدائی نے آدابِ عقیدت و احترام بجالاتے ہوئے بھی مضمون آفرینی کے خوب خوب جوہر دکھائے ہیں۔ عظمت و شان حضور ﷺ کو اپنے قلم کا ارمغان پیش کرتے ہوئے انہوں نے اپنے راہوار تخیل کو منزلِ شوق کی جانب دیوانہ وار سفر کے آداب سکھائے ہیں۔ اپنی رفعتِ خیالی ندرتِ فکر، جودتِ طبع اور شکوہِ الفاظ کی بدولت اس سفر شوق کے دوران میں ابھرنے والے نقوش کو انہوں نے تب و تاب جاودانی عطا کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ چنانچہ ان کی نعتوں میں ایسے خوبصورت مضامین بھی بکثرت نظر آتے ہیں جو قاری کے ذہن کو مقاماتِ مصطفیٰ ﷺ کی انتہائی بلندیوں سے آشنا کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ مضمون آفرینی کے سفر کو زیادہ موثر، دلکش اور محترم بنانے کے لئے انہوں نے شعری صنائع بدائع، خوبصورت تراکیب، بر محل استعارات اور دلآویز تشبیہات کا سہارا لیا ہے جن کی بدولت ان کی نعتیں قاری کے دل کی خلوتوں میں پرتاثر لہجے کی جوت جگانے لگتی ہیں۔ اس ضمن میں چند مثالیں پیش ہیں۔

جس کی شیم سے یہ فضا میں ہیں عطر بار  
باغِ جہاں میں وہ گلِ رعنا کھلا ہے آج  
زینتِ فزائے دہر ہے تنویرِ حسن و عشق  
ہر سمت نورِ ایزدی جلوہ نما ہے آج



تو ہے وجہ رونقِ گلستاں لبِ گل پہ ہے تری داستاں  
کلی کہہ رہی ہے چمک کے ہاں یہ ترا ہی فیضِ بہار ہے  
اے حبیبِ خالقِ دو جہاں ترا آستاں ہے وہ آستاں  
کہ بلندیء ہمہ آستاں دل و جاں سے جس پہ نثار ہے





کلیم طور پہ جلووں کی تاب لا نہ سکے  
پہ تو نے عرشِ معلیٰ پہ ہے کلام کیا



بزمِ کونین میں ہر سمت ہے جلووں کا ہجوم  
پیکرِ حسن ہوا جلوہ نما آج کی رات  
عرشِ اعظم بھی ہے مشتاقِ قدومِ عالی  
فرطِ بہجت سے ہے جدے میں جھکا آج کی رات

یہ عشق و عقیدت کی جلوہ گری ہے کہ قمریزدائی انداز بدل بدل کر حضور ﷺ کی بارگاہِ قدس میں اپنی ثنا گوئی کی سوغات پیش کرتے ہیں۔ کبھی آپ کے حسنِ صورت کے حوالے سے، کبھی سیرت کے ناتے سے، کبھی انوارِ تجلیات حضور ﷺ کی ضیا پاشیوں کے نام پر، کبھی آپ کی عنایاتِ کریمانہ کے تعلق سے، کبھی آپ کی سیادت و قیادت کے حوالے سے اور کبھی آپ کے ظاہری و باطنی محاسن اور مقاماتِ قدسیہ کی رفعتوں کی نسبت سے، صفت و ثنائے حضور کے لئے یہ نئے سے نئے مضمون اور اسلوب کو اپناتے ہیں مگر ذوق و شوق کی لذت میں کمی نہیں آتی۔ بلکہ یہ مدح و نعت کی منزل کی جانب جوں جوں آگے بڑھتے ہیں ان کا راہوارِ فکر ہر آن تیز تر ہوتا اور شہبازِ خیل پہلے سے کہیں زیادہ ذوق پر واز کا حامل بنتا نظر آتا ہے۔ قمریزدائی کی یہ عظمت و سر بلندی اس محبتِ رسول ﷺ کا انعام ہے جو ان کے گلشنِ زیست پر بہارِ لازوال کا عنوان بن کر سایہ فگن ہے۔

شاعر بارگاہِ رسالت قمریزدائی کی نعت نگاری نے ایک زمانے کو متاثر کیا ہے۔ ان کا ماضی مدحِ حضور ﷺ کے احساس سے آباد ہے اور ان کا حال ثنائے رسول ﷺ کی رفعتوں سے بہرہ ور ہے اور مستقبل کا پھوٹتا ہوا سویرا ان کی دنیوی و اخروی سرخروئی کی نوید دے رہا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ قمریزدائی کا قلم اسی طور تو صیفِ مصطفیٰ ﷺ کے حقائق رقم کرتا رہے، عشق و عقیدت کی خوشبو پھوٹی رہے۔ جذباتِ شوق کی چاندنی چمکتی رہے اور اہل نظر اس مدح و نعت نگاری کی نعتوں کے مطالعہ سے اپنی تمناؤں کے گلزار مہکاتے رہیں۔





## عابد نظامی اور فیضانِ کرم

صفت و ثنائے حضور سرور کائنات ﷺ کا سلسلہ دراز ہو تو شاعر کا نطق بے اختیار سیدنا حسان بن ثابت کے ذوقِ سلیم کی آرزو کرنے لگتا ہے جن کی مدحت طرازیوں نے عقیدت و محبت حضور ﷺ کا ایک ایسا سدا بہار گلستان کھلا دیا تھا جس کی خوشبوئے جاں نواز ابدالاآباد تک مشامِ فطرت کو عنبر بار کرتی رہے گی۔ نعتِ سرکارِ دو عالم ﷺ نے لاتعداد شعراء کے قلوب و اذہان کو دینی و دنیوی سرخروئی اور خوشنودی رب کائنات کا سامان مہیا کیا ہے۔ مشرق ہو یا مغرب، عرب ہو یا عجم ہر جگہ ہر زمان اسمِ محمد ﷺ کے اُجالے دانشورانِ عالم کے فکر و نظر کو مستنیر کر رہے ہیں۔ نعتِ رسولِ مقبول ﷺ عظمتِ فکر و فن کا اظہار بھی ہے اور دائمی سرخروئی کا ذریعہ بھی اس لئے شعرائے اسلام نے اسے ہمیشہ دلوں کی دھڑکنوں کا عنوان بنائے رکھا ہے انہی ثنا گویانِ دربارِ رسالت مآب میں سے ایک خوش بخت نام صاحبِ اسلوب شاعر عابد نظامی کا ہے۔

عابد نظامی کی زندگی ایک طویل علمی و ادبی پس منظر پر محیط ہے۔ آپ ایک ممتاز شاعر ہی نہیں معروف ادیب بھی ہیں۔ فکری صلاحیتوں سے بہرہ ور مصنف ہی نہیں، انتظامی خوبیوں سے بہرہ یاب مدیر بھی ہیں۔ ارتقائے علم و ادب کے سلسلے میں آپ کی خدمات کا احترام ہر صاحبِ فکر کو ہے۔ آپ کی ادبی بادیہ پیائی کے یہ تمام پہلو قابل ستائش سہی، لیکن آپ کی جو خصوصیت آپ کو ممتاز تر بناتی ہے وہ آپ کا جذبہ عشقِ رسول کریم ﷺ ہے جو آپ کی نعتوں میں جھلکتا اور آپ کی شاعری کو عقیدت کا حسن بخشتا دکھائی دیتا ہے۔ عابد نظامی ایک طویل عرصہ سے نعتِ رسول ﷺ کو اپنی شاعری کا اعزاز اور جذباتِ محبت کا ترجمان بنائے ہوئے ہیں یہ نعتیہ شاعری ان کے لئے اپنی فکری و فنی صلاحیتوں کے اظہار کا ذریعہ ہی نہیں بلکہ انہوں نے اسے ہمیشہ اپنی خوش بختی اور سعادتِ عظمیٰ سے تعبیر کیا ہے۔ نعت گوئی کی یہ سعادت ان کے نزدیک انعامِ خداوندی سے کم نہیں جی بھی تو کہہ رہے ہیں۔

مجھ پر ہے خاص فضلِ خدائے عظیم کا  
ہوں نعت گو جنابِ رسولِ کریم کا



خلق جبریل سے تائید کا طالب ہے قلم  
آج لکھنی ہے مجھے نعت رسول اکرم  
کس بشر میں ہے یہ طاقت کہ لکھے نعت اُن کی  
ہاں جسے بخشے یہ توفیق خدائے عالم

”فیضانِ کرم“ کی صورت میں عابد نظامی نے جو گلدستہ نعت ترتیب دیا ہے اس کا ہر پھول مہکبار، حسین و جمیل اور عطر بیز ہے۔ ان پھولوں کی خوشبو محسوسات کو عشق و عقیدت کی اُن وادیوں میں لے جاتی ہے۔ جہاں محبت رسول ﷺ عملی تقاضوں میں ڈھلتی اور دلوں میں سوز و ساز کا حاصل بن کر مچلتی ہے۔ جہاں حضور ﷺ سے نسبت کے طفیل ذروں پر مہر و خورشید کا گمان گزرتا اور حراماں نصیبوں کا مقدر سنورتا ہے۔ جہاں فکر بے مایہ شوق بے کراں سے ہمکنار ہوتی اور وسعت ایمان و یقین کو اپنے قالب میں سموتی ہے۔ جہاں کی فضاؤں میں بہارِ خلد سے بڑھ کر رعنائی اور حسنِ فطرت سے بڑھ کر دلآرائی جلوہ فگن ہے۔ جہاں زندگی کو دوام اور وقت کو قیام میسر ہے۔ جہاں دعائیں مستجاب اور تمنائیں باریاب ہوتی ہیں۔ جہاں تصورات حقائق کا پرتو لیتے اور جذبات آسودگی کی ضودیے تے ہیں۔ جہاں رحمت ایزدی عصیاں کاروں کا احاطہ کرتی اور سانکوں کے دامانِ مراد کو جواہر قبولیت سے بھرتی ہے۔ بلاشبہ یہ وادی جاں نواز ارضِ مدینہ ہے جس کا تذکرہ کرتے ہی عابد نظامی کا قلم شہپر جبریل کی صورت حسنِ تخیل کو چھونے لگتا ہے ایک ایمان افروز جھلک ملاحظہ فرمائیے۔

بچے نہ جنت فردوس ان کی نظروں میں  
جو چند لمحے ترے شہر میں گزار آئے  
حضور! آپ بلائیں اگر مدینے میں  
تو دل کو چین ملے، روح کو قرار آئے  
نگاہِ لطف کا محتاج ہے ترا عابد  
خدا کرے وہ مدینے میں بار بار آئے

حضور محمد مصطفیٰ ﷺ کی شخصیت حسنِ صورت و سیرت کا دلاویز مرقع ہے۔ ایک طرف آپ ﷺ کے حسن و جمال کا یہ عالم ہے کہ انوارِ خداوندی جھلکتے اور شمس و قمر خیراتِ حسنِ طلب کرتے محسوس ہوتے ہیں۔ عشاقِ سرمست رخ پر انوار کی ایک ایک جھلک پر فدا اور ایک ایک لمحہ



فشانی پر تصدق ہیں اور دوسری طرف آپ ﷺ کے حسن سیرت و کردار کی سر بلندیوں سے ہر زمانہ فیضیاب ہو رہا ہے۔ آپ ﷺ کی صورت ازل سے ابد تک کی جمال افروزیوں کا مرقع ہے تو آپ ﷺ کی سیرت جملہ محاسن و محامد کائنات کا مجموعہ، عابد نظامی نعت رقم کرنے بیٹھتے ہیں تو حسن و جمال مصطفوی ﷺ کے جلوؤں میں کھو جاتے ہیں، جی بھر کے قلب و نظر کی شاد کامی کا اہتمام کرتے ہیں۔ تصورات کے خلوت کدوں میں انوار و تجلیات نبوی ﷺ کو جلوہ آرا دیکھتے ہیں۔ کتنے ہی نعت گو شعراء ہیں جو حضور سرور کائنات کے حسن صورت کی تجلیات میں گم ہوئے تو پھر راہِ عشق میں آگے قدم نہ بڑھا سکے، مگر عابد نظامی عین وصال میں بھی حوصلہ نظر رکھتے ہوئے آپ ﷺ کے حسن سیرت و کردار کو خراج عقیدت پیش کرنا فراموش نہیں کرتے بلکہ آپ کے جمال جہاں افروزی کی تابانیوں سے قلب و نظر کو مستنیر کرتے ہوئے آپ کے انوار سیرت سے بھی جی بھر کر خوشہ چینی کرتے ہیں۔ عابد کے کلام میں حسن صورت رسول ﷺ کی جلوہ افروزی کا انداز دیکھئے:

محمد مصطفیٰ ﷺ کو مظہر شانِ خدا دیکھا

جہاں کے ذرے ذرے میں انہیں جلوہ نما دیکھا

وہ ہیں مخلوق میں سب سے حسیں تخلیق خالق کی

خدا کی کل خدائی میں نہ ان سا دوسرا دیکھا

کہیں منزل و طہ، کہیں یسین و مدثر

کتاب حق کے ہر پارے میں ان کا تذکرہ دیکھا

صورت حضور پر نور سید یوم النشور ﷺ کی طلعتوں کو دل و جان میں بساتے ہوئے عابد

نظامی آپ ﷺ کی سیرت مقدسہ کو کس طور ہدیہ تو صیف پیش کرتے ہیں ملاحظہ کیجئے:

نبی کی ذات نمونہ ہے آدمی کے لئے

یہی چراغ ہے دنیا میں روشنی کے لئے

فقط حضور کی سنت ہے قابل تقلید

فقط حضور ہیں انساں کی رہبری کے لئے



دو عالم کے سلطان اور اتنے سادہ

کہ خادم سوار اور خود ہیں پیادہ



نعت سرورِ دو عالم ﷺ صنفِ شاعری کے کسی بھی پیرائے اور انداز میں کہی جائے بہر حال شاعری کا افتخار اور مدحت نگارانِ عالم کی فکری کاوشوں کا نکھار ہے لیکن نعت کو جو غیر معمولی پذیرائی غزل کے قالب میں عطا ہوئی ہے وہ اور کہیں نظر نہیں آتی۔ فارسی اور پھر اردو کے شعراء نے غزل کے اسلوب میں صفت و ثنائے مصطفوی ﷺ کی خوشبو لٹاتے ہوئے خود کو شہرت عام ہی نہیں بقائے دوام کا مستحق بھی ٹھہرا لیا ہے۔ جامی، قدسی، کرامت علی شہیدی، بیدم وارثی، احمد رضا خاں، امیر مینائی، علامہ اقبال، ظفر علی خاں، حافظ مظہر الدین، حفیظ تائب وغیرہم کے لافانی نعتیہ کلام کا غالب حصہ اسی اسلوب غزل پر مشتمل ہے۔ عابد نظامی بھی حسنِ تغزل کے نام پر حضور ﷺ کی بارگاہِ ناز میں اس طور پر ارمغانِ نیاز پیش کرتے ہیں کہ قاری کا ادراک شدتِ احساس سے مستنیر، فکر نور یقیں سے منور اور جذباتِ سوزِ عشق کے مظہر ہونے لگتے ہیں۔ دراصل محبوب جس قدر حسین ہوگا عشق اسی قدر پختہ اور کامل ہوگا اور جب تختِ محبوبیت پر وہ ذاتِ والا صفات فائز ہو جو مطلوب کائنات ہی نہیں محمود خدا و ملائکہ بھی ہے جو باعثِ تخلیقِ عالم اور زینتِ سرائے بنی آدم ہے۔ جس کا چہرہ دور کی آبرو اور جس کی رضا میں ہر عہد ذوقِ جستجو ہے۔ جس کا ذکر پاک عبادت، جس کی تقلید عین سعادت اور جس کی خوشنودی پیامِ رحمت ہے تو پھر عابد نظامی کے قلم سے تغزل کی کہکشائیں ابھرنے لگتی ہیں۔ تغزل جو شاعری کا حسن اور لطافت فکری کی جان ہے، اس کی تب و تاب نعت کے حوالے سے عابد نظامی کے قلم سے پھوٹی ہوئی دیکھئے:

نظر کے سامنے یوں روضہ خیر البشر آئے  
کہ اس کا عکس آنکھوں سے میرے دل میں اتر آئے  
ولاتی ہے مجھے عرصے سے یادِ گنبدِ خضریٰ  
الہی ختم ہو اب یہ شبِ فرقت، سحر آئے  
پھلے پھولے نہ کشتِ آرزو کیوں اُن کی اے عابد  
حریمِ قدس میں آنکھوں سے جو برسات کر آئے

آئیں درِ حضور سے خوشیاں سمیٹ لیں  
جو لوگ غمزدہ ہیں، حزیں ہیں ملول ہیں  
میں نے سنی ہے بات یہ اسراء کی رات سے  
باہ و نجوم آپ کے قدموں کی دھول ہیں



عابد نظامی نے سلاطینِ زمن کے قصائد نہیں لکھے بلکہ شہنشاہِ شاہانِ عالم کی مدحِ سرائی کی ہے۔ حسنِ بتاں کو دل میں نہیں بسایا، بلکہ حسنِ محبوبِ حجازی سے لولگائی ہے۔ فکر و نظر کو محبوبانِ مجازی کے کاکل و رخسار کا طواف نہیں کرنے دیا بلکہ زلفِ مشکبویٰ رسول ﷺ کے حلقہء خم میں اپنے طالع مسعود کو تلاش کیا ہے۔ اپنے قلم کو فسانہء دنیا کے تذکرے سے آلودہ نہیں ہونے دیا بلکہ والی بطنی کے جلال و جمال کو اشعار کا پیر ہن بخشا ہے۔ پیر محمد کرم شاہ الازہری ان کی نعتیہ شاعری کے حوالے سے رقمطراز ہیں:

”حسن کی دلنوازیوں نے جنابِ عابد کے قلب و نگاہ کو یوں مستغنی کر دیا ہے کہ کسی دار و جم کی شوکتِ شاہانہ اس کی نگاہ میں نہیں جھپتی۔ اسے اپنا چاک گریباں بہت عزیز ہے جو اس کے محبوب کی نگہ کرن کو اپنی طرف مائل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ اس کے دل کے کسی گوشہ میں گنجائش ہی نہیں رہی کہ وہ لذاتِ دنیا یا عیش و عشرت کی زندگی کی خواہش کر سکے۔ محبوب کی راہ منزل کے بول اسے اطلس و پر نیاں سے کہیں پیارے ہیں۔“

عابد نظامی عشق و بے خودی کے عالم میں جہاں اپنی داستانِ شوق دربارِ رسالت مآب ﷺ میں پیش کرتے ہیں وہاں ملتِ اسلامیہ کے رنج و آلام کو بھی فراموش نہیں کرتے۔ عابد ایک راست فکر ادیب اور شاعر ہیں۔ اسلام کی عظمت و حقانیت پر غیر متزلزل ایمان رکھتے ہیں۔ فکری و روحانی رہنمائی کے لئے ان کی نگائیں ماسکویا و اشگن کی طرف نہیں اٹھتیں بلکہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ ان کی نظریاتی منازل ہیں۔ اُمتِ مسلمہ جن مسائل و مصائب سے دوچار ہے ان کا ادراک عابد کو خون کے آنسو رلاتا ہے۔ گروہی، جغرافیائی عصبیتیں مسلمانوں کا باہمی انتشار و افتراق، اغیار کی ریشہ دوانیاں، باطل قوتوں کی یلغار اور غلامانِ احمدیہ ﷺ کی احساسِ زیاں سے محرومی پر عابد کا دل تڑپ تڑپ اٹھتا ہے۔ وہ اُمتِ اسلامیہ کا استغاثہ بحضور سرکارِ دو عالم ﷺ پیش کرتا ہے۔ اپنی فریاد کو آنسوؤں کی زبان دے کر حضور ﷺ سے دستگیری کا سوالی بنتا ہے۔ مسائل کا حل اور مصائب کا مداوا مانگتا ہے۔ پوری دلسوزی و عجز سامانی کے ساتھ ملتِ اسلام کی ترقی و خوشحالی کا تمنائی بنتا ہے۔ ذاتی غم کے اظہار سے لے کر عالمِ اسلام کے استغاثہ پر غم تک عابد کی جذبات آفرینی کس طور آنسوؤں کی مالا میں پروتی ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

اے سید مکی نگہ لطف و کرم کر

اب ہم سے یہ صدمات اٹھائے نہیں جاتے



اب گردشِ حالات نے وہ حال کیا ہے  
آنسو بھی آنکھوں سے بہائے نہیں جاتے  
عزت نہیں دنیا کی نگاہوں میں ہماری  
اب شرم سے چہرے بھی دکھائے نہیں جاتے  
امداد کا خواہاں ہوں اے رحمتِ عالم!  
امت سے ستم اور اٹھائے نہیں جاتے

تخیل کے درپے واہوں، وادیِ بطحا سے نسیمِ جانفزا کے جھونکے قلبِ بسمل کو شادمانی بخشتے  
محسوس ہو رہے ہوں، محبوبِ نظرِ تصوراتِ روبرو ہوں، درود و سلام کی ڈالیاں نذر کی جارہی ہوں،  
عشق و عقیدت کی بارات سچی ہو، صلوٰۃ و تحیات کے زمزمے سماعتِ نواز ہو رہے ہوں، ناز کے  
حضورِ نیازِ فرشِ راہ ہو، ناپائیدار لمحوں کو دوام اور ساعت گزراں کو قیام نصیب ہو رہا ہو تو پھر یارائے  
ضبط کسے رہتا ہے۔ خوش بخت ہیں وہ شعراء جو ان کیف آگیاں ساعتوں کو نذرِ قارئین کرنے کا  
سلیقہ رکھتے ہیں کہ دیکھا ہے جو کچھ میں نے اذروں کو بھی دکھلا دے۔ عابدِ نظامی نے متعدد مقامات  
پر ایسی ہی روحانی سرخوشی و سرشاری کی کیفیات کو نظم کا ملبوس عطا کیا ہے۔ ان کی نعتیہ شاعری اگر ان  
کے عشقِ ذاتی کے لحاظ سے سرمایہٴ نجات ہے تو امتِ مسلمہ کی عقیدت کے حوالے سے جلوہ گاہِ شوق  
ہے جس میں زبان و بیاں کی گلکاریاں بھی ہیں اور ضائع بدائع کی شہکاریاں بھی، بر محل تراکیب  
و معانی کی جگمگاہٹیں بھی ہیں اور موزوں تشبیہات و استعارات کی سجاوٹیں بھی، قلب و نظر کی تازگی کا  
سامان بھی ہے اور ایمان و یقین کی سرخروئی کا عنوان بھی، مہجوری طیبہ میں تڑپنے والوں کی داستانِ  
الم بھی ہے اور زیارتِ شہرِ رسول ﷺ سے بہرہ ور ہونے والے سعیدِ بختوں کا مقدر بننے والا فیضانِ  
کرم بھی، جذباتِ آفرینی شاعری کا خاصہ امتیاز ہوتی ہے۔ منظرِ التفاتِ تمناؤں کے پس منظر میں  
عابدِ نظامی کے جذبات کا ایک پرتو دیکھئے:

میں سر کے بل چلوں طیبہ کی گلیوں اور کوچوں میں  
بصدِ تعظیم شہرِ خلد کی ہر رہگذر دیکھوں  
مرے آقا نے انگلی سے کیا جس چاند کو ٹکڑے  
اسی کی چاندنی میں سبز گنبدِ رات بھر دیکھوں  
تمنا ہے کہ گزریں زندگی کے دن مدینے میں  
انہی کا جلوہٴ نوریں نظر آئے جدھر دیکھوں



اب ذرا تمناؤں کی قبولیت اور آرزوؤں کی پذیرائی کے حوالے سے شاعر کی شادکامی  
احساس پر ایک نظر ڈالئے:

مل رہا ہے گنبد خضریٰ کے سائے میں سکوں  
راحتِ جاں ہے سنہری جالیوں کے سامنے  
بار بار اُن کو میں چوموں اپنی آنکھوں سے ملوں  
کتنا ارماں ہے سنہری جالیوں کے سامنے  
جگمگاتے ہیں سر مژگاں مسرت کے دیے  
کیا چراغاں ہے سنہری جالیوں کے سامنے

اگرچہ تمام ادوارِ نعت کی عظمتوں کے امین رہے ہیں مگر دورِ حاضر کے شعراء نے نعتِ  
رسول ﷺ کو جس شدت کے ساتھ اپنے فکروں کا افتخار بنایا ہے وہ لائقِ صد ستائش ہے۔  
ادہامِ باطل کی طلسم کاریوں میں بھٹکنے والے دانشورانِ ملت اس امر سے باخبر ہو چکے ہیں کہ  
جادۂ نبوی ﷺ ہی وہ صراطِ مستقیم ہے جو انہیں منزلِ آشنا کر سکتی ہے۔ اس لئے آج کا شاعر تمام تر  
ارادتِ قلبی اور مودتِ روحانی کو اپنی التجاؤں میں سموتے ہوئے اس درِ اقدس کی طرف لپک رہا  
ہے۔ جہاں جنیدؒ و بایزیدؒ "نفسِ گم کردہ" آتے ہیں۔ عابدِ نظامی اپنے عہد کے ترجمان اور فنِ نعت کی  
رفعتوں کی پہچان بن کر عرضِ گزر رہیں:

گھرے ہیں دستِ مصائب میں کوئی راہِ ملے  
غموں کی دھوپ میں سرکار کی پناہِ ملے  
کوئی طلب ہے مجھے زیست میں تو اتنی ہے  
نبیؐ کی چاہِ ملے اور بے پناہِ ملے

عابد کے ہاں کمال کی روانی اور آمد ہے۔ وہ نئی نئی شگفتہ و شاداب زمینیں نکال کر ان میں  
بے تکلف شعر کہہ لیتے ہیں۔ قدمِ قدم پر مضمون آفرینی، رعنائیِ خیال، شوکتِ الفاظ اور ندرتِ فکر کا  
احساس ہوتا ہے۔ فیضانِ کرم ﷺ میں شاعر کہیں تو دشتِ طیبہ کی سیر کر رہا ہے اور کہیں حریمِ ناز میں  
سجدہ ریز دکھائی دیتا ہے۔ عشقِ رسالت مآب ﷺ کی رفعتوں پر خندہ زن دکھائی دیتی ہے۔ عابد  
نے جہاں شمائل و فضائلِ نبوی ﷺ کے بیان کی صورت میں جذباتِ عشق کی ترجمانی کی ہے۔  
وہاں حضور ﷺ کے اُسوۂ اور خلقِ عظیم کی پاکیزہ یادوں کو دل و جان میں بساتے ہوئے اپنے گرد و



پیش کی عملی و اخلاقی کیفیت کا احتساب بھی کیا ہے۔ انہوں نے اسم محمد ﷺ کی ضیا پاشیاں ہمیشہ محسوسات کے نہاں خانوں کو منور کرتی ہوئی محسوس کی ہیں۔ یہ مقدس نام جو روح ارضی کا اسم اعظم ہے۔ عابد کے قلم سے جس طور خراج عقیدت کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ وہ قابل غور بھی ہے اور حاصل مطالعہ بھی۔

اس نام سکوں بار میں تاثیر عجب ہے  
کھل جاتا ہے تقدیر کا ہر جادہ مسدود  
اخلاص سے جو اسم محمد کا کرے ورد  
قدسی ہیں کئی اس کی مدد کے لئے موجود

جب قافلہ منزل مقصود کی جانب رواں ہو تو شب کے سناٹوں میں حدی خوانوں کی لے مسافروں کے قدموں کی رفتار کو تیز تر اور ان کے ذوقِ عمل کو پختہ تر کر دیتی ہے۔ یہاں بھی ایک کاروانِ شوق ہے جو منزل طیبہ کی جانب سرمایہ عقیدت لئے چل رہا ہے۔ دلوں میں ارمان بچل رہے ہیں اور نگاہوں میں تصورات کے نجمِ رقصاں ہیں۔ دستِ تمنا میں محبت رسول ﷺ کے پھول لئے قافلے کا ہر مسافر اپنے آقا و مولا حضور صاحبِ لولاک ﷺ کی نگہِ کرم کا سوالی ہے۔ دشتِ مہجوری میں سرگرداں ہوتے ہوئے جب رہ نور دانِ شوق کے جذبات بوجھل اور پاؤں شل ہونے لگتے ہیں تو عابدِ نظامی کے قدسی زمزمے حدی خوانی کا حق ادا کرتے ہوئے فکر و نظر کو لامتناہی تابانی شوق سے ہمکنار کر دیتے ہیں۔

”فیضانِ کرم“ کی صورت میں عابدِ نظامی نے جو ہدیہ عقیدت پیش کیا ہے۔ خدا کرے اس سے فیضیابی ہر صاحبِ ایمان کا مقدر بن جائے اور عابد کا یہ اعزاز جملہ شاعرانِ اسلام کا افتخار بن جائے کہ:

نہ کرے مدح کبھی اہل جہاں کی عابد  
نعت گو ہے مرے آقا مرے مولا تیرا

☆☆☆



## سید محمد ابوالخیر کشفی کا نذرانہ مدحت

حضور سلطان دو عالم ﷺ کی مدحت و توصیف کا چمن ہمیشہ سے خزاں نا آسنا رہا ہے۔ اس گلزار سدا بہار کو عشاق حضور صدیوں سے اپنے آنسوؤں کا نم پیش کرتے رہے ہیں۔ آنسوؤں کا یہی نم مدحت و توصیف حضور ﷺ کے مہکتے ہوئے گل و لالہ میں اپنی عقیدت آفرینی دکھاتا ہوا نظر آتا ہے۔ عشق مصطفیٰ ﷺ میں پلکوں پہ لرزنے والے آنسو خلاق مصطفیٰ ﷺ کا خصوصی کرم ہیں یہ کرم انہی خوش بخت قلم کاروں کا اعزاز بنتا ہے جنہیں سرور کونین ﷺ کی عنبر نشاں یادوں سے اپنے قلب و جان کے خلوت کدوں کو آباد کرنے کا ہنر آتا ہے۔ اس گلستان صدر رنگ پر ایک نظر ڈالتے ہی اصحاب ایمان کے افکار مہکنے اور آنکھوں سے عقیدت کے آگینے ٹپکنے لگتے ہیں۔ اس گلشن کی بہار سامانی جہاں رب کونین کا لطف خاص ہے وہاں وہ سعید قسمت مدحت نگار بھی وقت کے افق پر اپنی جگمگاہٹ کا احساس دلاتے نظر آتے ہیں جنہوں نے اپنی فکر و بصیرت کی بہترین توانائیاں عشق رسول ﷺ کی نذر کر دی ہیں۔ ممتاز شاعر اور محقق سید محمد ابوالخیر کشفی بھی اسی بلند بخت قافلے کے رکن ہیں۔

سید محمد ابوالخیر کشفی سے ذاتی تعارف نہیں مگر نعت مصطفیٰ ﷺ وہ وسیلہ خاص ہے جو زمان و مکان سے ماورئی ہو کر مداح و ممدوح کو پل بھر میں قریب سے قریب تر کر دیتا ہے ان کی نعت نگاری مدت سے رسائل و جرائد کے ذریعہ سے قارئین کے فکر و نظر کی زینت بن رہی ہے۔ بکھری ہوئی شعری نگارشات اپنی جگہ اس وقت ان کا نعتیہ مجموعہ ”نسبت“ مرے پیش نظر ہے جو ضخامت میں مختصر ہونے کے باوجود اپنی معنویت فکری جامعیت اور محبت حضور ﷺ کی فراوانی کی بدولت اپنے بھرپور اور ہمہ پہلو وجود کا احساس دلا رہا ہے۔ اس مجموعہ نعت کا نام ہی بذات خود نعت کی روحانی معنویت کا شعور بخش رہا ہے۔ بارگاہ مصطفویٰ ﷺ مرجع نعت کے حضور نعت پیش کرنے والے اصحاب نعت سے لے کر عصر حاضر کے نعت گو شعراء تک سب کی مدحت نگاری کا مقصود و مدعا یہی ہے کہ انہیں آقا و مولا ﷺ سے نسبت عطا ہو جائے وہ نسبت جو ذروں کو آفتاب کی چمک اور قطروں کو سمندوں کی گہرائی عطا کرتی ہے۔ وہ نسبت جو غلاموں کو آقائی اور عرب کے بادیہ نشینوں کو شان و آرائی عطا کرتی ہے۔ وہ نسبت جو حدود و قیود سے ماورئی اور زمان و مکاں کے تصورات



سے بے نیاز ہوتی ہے۔ وہ نسبت جو چودہ صدیوں کے فاصلوں کو پھلانگ کر داماں سرورِ دو عالم ﷺ سے وابستگی کا اعزاز حاصل کرنے میں کامیاب رہی ہے یہی نسبت سید محمد ابوالخیر کشفی کی شاعری کا افتخار نظر آتی ہے۔ ملاحظہ کیجئے۔

اس نام سے وابستہ ہوں نسبت پہ نظر ہے  
عاصی ہوں مگر ان کی شفاعت پہ نظر ہے  
طیبہ سے بہت دور ہوں اور ذوقِ حضوری  
اس صاحبِ معراج کی نسبت پہ نظر ہے

دیکھو تو توں فدائے نسبت سلطانِ مدینہ  
طیبہ میں ملی جنتِ سلطانِ مدینہ  
یہ جان ہے سرکار کی حرمت آپہ تصدق  
ایمان سے مزاید حرمتِ سلطانِ مدینہ

سید محمد ابوالخیر کشفی اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ وہ جس ہستی عظیم الہیے نسبت کا اعزاز رکھتے ہیں وہ کس قدر عظیم اور سر بلند ہے۔ وہ عظمتِ حضور ﷺ کا تصور کرتے ہیں اور ساتھ ہی خستہ سامانی پر بھی نظر ہے۔ ایک راسخ العقیدہ مسلمان اور ایک محبِ سلطانِ مدینہ کی حیثیت سے وہ سمجھتے ہیں کہ ان کا محبوب محبوبِ کائنات ہے۔ ان کا محبوب بلاشبہ محبوبِ شش حیات ہے۔ ایک طرف وہ اپنے آقا و مولانا ﷺ کی لافانی رفعتوں کا ادراک کرتے ہیں تو دوسری طرف انہیں یہ بھی احساس ہے کہ وہ اس آفتابِ حرمت ﷺ کی ابدی طلعتوں کے مقابل ایک ذرہ ناچیز ہیں مگر ان کے لئے یہی اعزاز کیا کم ہے کہ انہیں نسبت کا شرف تو حاصل ہے۔ اسی نسبت خاص کے حوالے سے ان کے باطن میں آرزوئیں مچلتی ہیں۔ تمنائیں ابھرتی ہیں۔ تصورات کی جلوہ سامانیاں اپنا وجود منواتی ہیں اور کیف و اغلاط کی انہی ساعتوں میں ان کا قلم یوں جواہر لٹکانے لگتا ہے۔

وہ ایک نام جو آپ حیات ہے لوگو  
مرے کہو میں میری آرزو میں زندہ رہے  
دیارِ مشرق سے لے کر دیارِ مغرب تک  
یہ مشیتِ خاک تری جستجو میں زندہ رہے



تمہاری یاد ہے جس کے لئے مثالِ حرا  
وہ کس وقار سے اس ہاؤ ہو میں زندہ ہے  
”ایک دعا ایک نعت“ کے عنوان سے ان کی آرزوؤں کی بلند پروازی ملاحظہ ہو۔ یہ ایسی  
آرزو ہے جو دعا کی صورت میں ان کے لبوں سے اُبھرتی اور ان کے قلم سے عقیدت کا خراج لیتی  
ہے۔

وہ بصیرت اے خدا منزل نما ہم کو ملے  
خاک طیبہ میں کسی کا نقش پا ہم کو ملے  
رحمتہ للعالمین کے نور سے رخشندہ ہو  
ایسا انداز نظر سب سے جدا ہم کو ملے  
ہم قیامت کی تپش میں مسکرا اُنھیں اگر  
سرورِ دنیا و دیں کا آسرا ہم کو ملے  
ہم مدینے کی زمیں میں اس طرح مدفون ہوں  
خاک پاک مصطفیٰ بس یہ صلہ ہم کو ملے  
قرب احمد ﷺ کے ہزاروں سلسلے رب کریم  
ہم پہ جو روشن نہیں وہ مدعا ہم کو ملے

”نسبت“ کے نام سے سید محمد ابوالخیر کشفی کا مجموعہ نظر دلکش اور ایمان آفریں نعتوں کی بہار  
اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ یہ ایسی بہار ہے جو خزاں کے تصور سے بھی نا آشنا ہے۔ یہ ایسی بہار  
ہے جو ظاہر اور باطن کو یکساں طور پر معنبر کرتی ہے۔ یہ ایسی بہار ہے جس کے احساس سے ہی  
آرزوؤں کی پڑمردہ کلیاں زندگی پانے لگتے ہیں۔ سید کشفی نے اس مجموعہ نعت میں عشق و عقیدت  
حضور کا چمن کھلا دیا ہے۔ نقد و نظر کے حوالے سے آگے بڑھتے ہوتے ہوئے ہم ایک نظر سید کشفی  
کے نظریہ نعت گوئی پر روشنی ڈالنا چاہیں گے۔ پیش گفتار کے عنوان سے کتاب کے آغاز میں لکھتے  
ہیں۔

”نعت گوئی اپنی جان کی قیمت پر سرور دنیا و دین ﷺ کے جوار میں پہنچنے کا نام ہے۔ ہم اسی  
سفر میں مصروف ہیں اور منزل بہت دور ہے۔ نعت گوئی اپنے وجود کی سچائیوں کے ساتھ ان کی  
خدمتِ عالیہ میں حاضری کا نام ہے۔ شاید حضوری کا یہ لمحہ ہمیں حرف و صوت کی دنیا میں کبھی مل  
جائے۔ نعت گوئی موابہ شریف میں قیام کے ان چند لمحوں کا نام ہے جو وقت گزراں کے تصور کو مٹا



دیتے ہیں۔ نعت گوئی اُس انتظار کا نام ہے جس کا پورا مفہوم ہمیں نہیں معلوم۔ رحمت اور عطائے بے کراں کا انتظار، نعت دل زندہ کے ساتھ بیداری کی ساعت کا نام ہے۔“

نگاہ ہے یا رسول اللہ نگاہ ہے

ہم نے ”پیش گفتار“ کی تمام سطرد ایک مہکبار احساس کے ساتھ نقل کر دی ہیں۔ یہ نثری نعت کا اس قدر ایمان افریں شہ پارہ ہے کہ ایک ایک لفظ دامن بصیرت کو سلطان دو عالم ﷺ سے نسبت اور ارادت کی غمازی کرتا محسوس ہوتا ہے۔ مندرجہ بالا سطور بلاشبہ کتاب نعت کا دیباچہ اور محبت رسول ﷺ کے جذبات کا خلاصہ ہیں۔ کیف و وجدان کا نور لٹاتی ہوئی یہ سطور ہم جیسے خستہ سامانوں کو آگے بڑھنے کا حوصلہ عطا کر رہی ہیں۔ سید کشفی نے اس شہ پارہ میں جس طور حسن نعت کی جلوہ کاری لٹاتی ہے۔ وہی جلوہ کاری ان کی تمام نعتوں اور ان کے اسلوب کی پہچان بنی ہوئی ہے وہ سمجھتے ہیں کہ نعت اسم محمد ﷺ کی جلوہ گری اور اس کے ادراک کا نام ہے۔ علامہ اقبال کے لفظوں میں۔

ہو نہ یہ پھول تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو  
چمن دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو  
یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو خم بھی نہ ہو  
بزم اقوام بھی دنیا میں نہ ہو تم بھی نہ ہو  
خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے  
بزم ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

اور پھر اقبال ہی کا ایک منفرد تاریخ ساز شعر بھی دیکھئے۔

قوت عشق سے ہر پست کو بالا کر دے  
دہر میں اسم محمد ﷺ سے اُجالا کر دے

اسم محمد ﷺ کی تابانیوں سے اُجالا کرنے کی تمنا سید کشفی کے افکار نعت میں جگمگاتی نظر آتی ہے۔ یہی نام ان کا آرزوؤں کا حاصل اور ان کی تمناؤں کا مرکز ہے۔ یہی نام دنیا و آخرت میں ان کا سہارا اور ان کے لئے لطف و کرم کا نظارہ ہے۔ یہی نام عظمت نعت اور شوکت جذبات ہے۔ اسی نام کے وظیفہ سے ان کے جذبے مچلتے اور ان کے خیالات اشعار میں ڈھلتے ہیں۔ یہی نام ان کے لئے وقار آرزو اور انتہائے جستجو ہے۔ اسم محمد ﷺ سے تابندہ اُن کے قلم کی جولانیوں کی ایک جھلک پیش خدمت ہے۔



غم جہاں سے یہ کہہ دے مری طرف سے کوئی  
میں آج اسم محمد ﷺ کے سائبان میں ہوں  
زماں مکاں پہ تسلط مرے نبیؐ کا ہے  
غریب شہر ہوں اور اپنے مکان میں ہوں  
سلام جس کو کریں ہفت آسماں کشفی  
اسی کا خون ہوں اور اس کے خاندان میں ہوں

.....

مرا وجود محمد ﷺ کے نام سے قائم  
چراغ کعبہ سے روشن ہیں سب شجر میرے  
جہاں مسافتیں منزل غبار نورِ سحر  
خیال و خواب میں بستے ہیں وہ نگر میرے

.....

ہر مطلع نور اُسی نام سے روشن  
خورشید کو خیرات ملی اُس کی جبیں سے  
ہاں اسم محمد ﷺ ہے مرے نطق کی تاثیر  
الفاظ کو مفہوم ملا سرورِ دیں سے

.....

ہر صدا حشر کے میدان میں پتھر ہو گی  
نغمہ رسلِ آخر ہی سنائی دے گا  
میرا دل اسم محمد ﷺ سے سکوں کا مرکز  
ذہن بے مایہ بھی اب اس کی دہائی دے گا

.....

ذہن کو اپنے اُجالوں تو ترا نام لکھوں  
اپنے لمحوں کو اُجالوں تو ترا نام لکھوں  
گنبدِ خضریٰ کے سائے میں وہ صدیوں کا خرام  
اس کی تصویر بنا لوں تو ترا نام لکھوں



اک اسم محمد ﷺ کے سوا لوحِ ابد پر  
دیوار و در و بامِ حرم کچھ نہیں لکھتے  
ہر سانس عبارت ہے محمد ﷺ کی ثنا سے  
رودادِ شہانِ قصہ جم کچھ نہیں لکھتے  
کرب کی رات میں اک نام سہارا تو بتا  
ہر بنِ مو سے محمد ﷺ کی صدا آتی ہے  
مرے سرکار نے پھر مجھ کو بلایا ہو گا  
ایک پیغام لئے بادِ صبا آتی ہے

محبوبِ دو عالم ﷺ سے نسبت کے سبب سے محبتِ صادق کو اپنے محبوب کی ہر ادا عزیز تر ہوتی  
ہے اور یہاں تو وہ محبوب ہے جس کی ہر ادا اس کے خالق کو بھی محبوب ہے اور جس کی اداؤں کے  
تذکرے قرآن حکیم کے نورانی مصحف سے ابھرتے ہیں۔ عشاق کو اس سرزمین سے پیار ہوتا  
ہے۔ جہاں ان کا محبوب رہتا ہے۔ وہ گلیاں وہ کوچے عزیز ہوتے ہیں جنہیں محبوب سے نسبت  
ہوتی ہے۔ ان راہگزاروں پر پیار آتا ہے جنہیں محبوب کے قدموں کو بوسہ دینے کا شرف عطا ہوتا  
ہے۔ یہ تو داستانِ شوق ہے جو بکھرے تو بکھرتی چلی جاتی ہے، پھیلے تو پھر رکنے کا نام نہیں لیتی۔ سید  
ابوالخیر کشفی بھی ان کیفیاتِ روحانی سے آگاہ ہیں۔ اس لئے شہرِ محبوبِ دو عالم ﷺ کا تذکرہ بطور  
خاص ان کے قلم سے عقیدت کا نور بن کر فروزاں ہوتا ہے۔ یہی شہرِ محبوب ہے جس کے بارے میں  
قرآن کہتا ہے۔ ترجمہ

(قسم ہے مجھے شہرِ محبوب کی، جس میں آپ مقیم رہے) (پارہ ۳۰، سورہ البلد)

اور جب ایک عاشق خستہ جاں سے پوچھا گیا کہ کائنات میں بڑے بڑے عظیم الشان شہر ہیں  
جو حسنِ عمارتوں اور دلفریب نظاروں کو آنے دامن میں سموئے ہوئے ہیں۔ بتاؤ تو سہی کہ ہمیں کون  
سا شہر عزیز ہے تو اس عاشق نے محبت و وارفتگی کے عالم میں جواب دیا کہ  
آں خنک شہر ہے کہ دروے دلبرست

یعنی شہر تو بے شمار ہیں مگر اس شہر کی عظمتوں کا کیا کہنا جن میں میرا محبوب رہتا ہے۔ صحابہ کرام  
رضوان اللہ علیہم اجمعین سے کرتا بعین تک اور پھر ان کے روشن ادوار سے لے کر آج تک شہر  
رسول ﷺ عشاق جاں نواز کی نگاہوں کا مرکز اور عمل کا محور بنا ہوا ہے۔ سیدنا امام مالک رضی اللہ  
تعالیٰ عنہ کی مدینہ طیبہ سے محبت بلاشبہ عشق و عقیدت کا روشن ترین باب ہے۔ امام احمد رضا خاں کی



نعتیہ شاعری میں مدینہ منورہ کا خوب ذکر ملتا ہے۔

مدینے کے خطے خدا تجھ کو رکھے  
غریبوں فقیروں کے ٹھہرانے والے  
حرم کی زمیں اور قدم رکھ کے چلنا  
ارے سر کا موقعہ ہے او جانے والے

.....

جان و دل ہوش و خرد سب تو مدینے پہنچے  
تم نہیں چلتے رضا سارا تو سامان گیا  
دیکھئے ابوالاثر حفیظ جالندھری مدینہ طیبہ کی عظمتوں کو کس طور خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

کہاں ایسے نصیب اللہ اکبر سنگِ اسود کے  
یہاں کے پتھروں نے پاؤں چومے ہیں محمد ﷺ کے

ان مثالوں سے ہمارا مقصود مضمون کو طوالت دینا نہیں بلکہ فقط یہ عرض کرنا ہے کہ شہر محبوب کا تذکرہ ہر محبت کی آرزوؤں کا حاصل ہوتا ہے۔ سید ابوالخیر کشفی کے ہاں اسی نسبت مدینہ منورہ طیبہ کی جلوہ کاری بڑی وضاحت کے ساتھ ملتی ہے۔ انہوں نے شہر مدینہ سے محبت و وارفتگی کے خوبصورت نظائر پیش کئے ہیں۔ مدینہ طیبہ کی گلیاں اور کوچے، اس کی مساجد اور بازار، اس کے صحرا اور سبزہ زار، اس کی وادیاں اور ریگزار، سب کی جھلک ان کے کلام میں ملتی ہے خاص طور پر جب یہ گنبد خضریٰ کے قریب ہوتے ہیں تو ان کی کیفیات قلبی دیدنی ہوتی ہیں۔ ملاحظہ کیجئے۔

مدینہ شہر نہیں ہے مری تمنا ہے  
مدینہ ایک اشارا ہے روشنی کی طرف  
مدینہ ایک کنایہ ہے زندگی کے لئے  
مدینہ صوت و صدا کے بغیر حسن کلام  
مدینہ حسن سماعت کو اک پیام بھی ہے

.....

تسکین دل و جاں کی ہر اک صورت مطلوب  
طیبہ کی ہوا ہے مرے مولا مرے آقا  
وہ گنبد خضریٰ کے قرین طائر تھا  
کشفی کی نوا ہے مرے مولا مرے آقا



فضا میں ان کے ہونٹوں کی صدا رہے  
مدینے کی سحر ہے اور میں ہوں  
حرا سے سبز گنبد تک مسلسل  
سفر اندر سفر ہے اور میں ہوں

آسماں گنبد خضریٰ سے فرو تر نکلا  
یہ حقیقت ہے ہمیں کوئی نظر کا نیرنگ  
غیب بھی ان کے کرم سے مری نظروں پہ کھلا  
میں نے دیکھی ہے مدینے میں بہشت صدرنگ

روشن ہے میرے خواب کی دنیا مرے آگے  
تعبیر بنا گنبد خضریٰ مرے آگے  
افلاک کو جھکتے ہوئے دیکھا ہے نظر نے  
ہے خواب گہ شہر مدینہ مرے آگے

حضور ﷺ سے نسبت کا شرف رکھنے والے سید کشفی مدینہ طیبہ کی فضاؤں میں کیا کچھ محسوس کر رہے ہیں۔ اس کا تذکرہ متذکرہ بالا اشعار سے بخوبی ہو رہا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ مدینہ منورہ تو حضور نبی کریم ﷺ کی آمد سے پہلے ”یثرب“ تھا۔ وہ یثرب جو بیماریوں کا مرکز اور ظلمتوں کا گہوارہ تھا مگر جب حضور ﷺ کے قدم مبارک اس سرزمین پر پہنچے تو یہ شہر نبی یک بیک مدینہ منورہ بن گیا۔ یہی مدینہ منورہ عالم اسلام کی تمناؤں کا مرکز اور آرزوؤں کا حاصل بن گیا۔ یوں تو خاک حرم کا ہر ذرہ صورتِ نجم ہدایت ہے اور یہاں کے کنکروں پر لعل و جواہر تصدق ہوتے ہیں مگر اس مقام نور کا کیا کہنا کہ جہاں محمد دو عالم ﷺ حیات ظاہری کے تریسٹھ برس گزار کر آرام فرمائیں۔ یہ مقام سجدہ گاہِ قدسیاں ہے۔ سراسر عرشِ نشاں ہے۔ باعثِ رشک باغِ جناں ہے۔ ایک شاعر کے بقول،

نبی کا جس جگہ پر آستیاں ہے  
زمین کا اتنا ٹکڑا آسماں ہے

زمین کا یہی ٹکڑا جو گنبد خضریٰ ہے۔ مواجہ شریف کی صورت میں عشاق کو دعوتِ نظار ادا رہا



ہے۔ ایسا نظارہ جو مودب نظروں کا قبلہ اور با وضو قلوب کا کعبہ ہے۔ یہی مواجہ شریف ہے جہاں درود و سلام کی ایمان آفریں صدائیں ہر لحظہ اور ہر آن اُبھرتی ہیں۔ چودہ سو سالوں پر محیط شب و روز کا ایک لمحہ بھی ایسا نہ ہوگا جب درودوں کے گلاب بارگاہِ حضور ﷺ میں نذر نہ کئے گئے ہوں جب سید کشفی کے قدم اس مقام سر بلند تک پہنچتے ہیں تو جذبات اشکوں میں ڈھل جاتے ہیں، سانس رک رک کر چلتا ہے۔ بے زبانی ہی ترجمانِ شوق بن جاتی ہے۔ اس موقع پر ”مواجہ شریف میں ایک آواز“ کے عنوان سے اپنے جذبات کو ایک زمانے کے جذبات میں ڈھال دیتے ہیں۔

دیارِ غرب میں آنکھیں کسی کی اشک افشاں  
 دیارِ پاک میں نغمہ کسی زباں پہ ہے  
 کسی ضعیف کی بے نور ہوتی آنکھوں میں  
 جمالِ کبیدِ خضرؑی ابھی منور ہے  
 وہ خوش نصیب ہیں جن کو ترا پیام ملے  
 ”ہزار بار برو صد ہزار بار بیا“

ستونِ توبہ پہ ہونٹوں کو رکھ دیا میں نے  
 خبر ملی کہ تمنائے سیدِ والا  
 مری نجات کا رستہ بھی ہے، وسیلہ بھی  
 ستونِ توبہ کے ہونٹوں سے یہ صدا آئی  
 ”ہزار بار برو صد ہزار بار بیا“

یہی مواجہ شریف ان کی تمنائوں کی نظری جنت ہے وہ جنت کہ جس کا ایک ایک نظارا انہیں حیاتِ نو کی بشارت دے رہا ہے۔

روشن ہے مرے خواب کی دنیا مرے آگے  
 تعبیر بنا کبیدِ خضرؑی مرے آگے  
 افلاک کو جھکتے ہوئے دیکھا ہے نظر نے  
 ہے خواب گہ شاہِ مدینہ مرے آگے

ایک محبت صادق کی طرح سید ابوالخیر کشفی کو احساس ہے کہ حضور ﷺ تو حید خداوندی کے انوار



کو دلوں میں اُجاگر کرنے کے لئے آئے تھے۔ آپ کی تعلیمات ایک ایک حرف شہ پارہ قدسی ہے۔ آپ کی سیرت وہ مینارہ نور ہے۔ جس سے پھوٹنے والی روشنی ابد تک سفر کرنے والے قافلوں کو انسانیت نوازی کے آداب عطا کرتی رہے گی۔ رب کریم نے اپنے محبوب ﷺ کے اسوہ حسنہ کو عالم انسانیت کے لئے ہر دور میں وجہ سرفرازی قرار دیا تھا۔ آپ کا کردار قرآن مجید کی تفسیر تھا۔ قرآن مجید کا حقیقی متن اسوہ حضور ﷺ ہی میں جلوہ گر نظر آتا ہے۔ اسی لئے تو حضور ﷺ کی ذات والا صفات کو بولتا ہوا قرآن کہا گیا ہے۔ اسی قرآن ناطق نے اپنی تعلیمات سے زمانے کا رخ تبدیل کر دیا۔ بڑوں کو دانائی اور عرب کے شتر بانوں کو شوکت و دارائی عطا کی۔ آپ کی سیرت اور آپ کے ارشادات وہ صحیفہ رشد و ہدایت ہیں کہ جن سے بڑھ کر عام کرنے والے کسی منشور کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ ایک شاعر کے لفظوں میں۔

ترے در کے سوا آسودگی دل کہاں ملتی

زمانہ تیرے در پر ٹھوکریں کھاتا ہوا آیا

سید ابوالخیر کشفی کے لئے ذکر رسول ﷺ سیرت و کردار کی انسانی سر بلندیوں کو اُجاگر کرنے کا ذریعہ ہے۔ سیرت حضور کی لمحہ افشانیوں کو قلب و جان کا اعزاز بناتے ہوئے کہتے ہیں۔

یہ سلسلہ صدق و صفا کس سے ملا ہے؟

افکار کو اندازِ حیا کس سے ملا ہے؟

سرکارِ دو عالم کے سوا کون امیں ہے

اللہ کا پیغام ہدیٰ کس سے ملا ہے

ہر نقش میں اک شانِ کریمی ہے خدا کی

یہ پردہ انوار و ضیا کس سے ملا ہے

.....

ہر غیب اک شہود تھا جس شخص کے لئے

وہ رحمت تمام تھا بینائی دے گیا

وحشت کدے میں صاحبِ معراج آدمی

انسانیت کو انجمنِ آرائی دے گیا

حرف و بیاں میں جس کو سمیٹا نہ جاسکے

وہ شخص کائنات کو گویائی دے گیا



حسن تغزل شاعری کی جان ہے۔ غزل اور نعت میں تغزل کے پیرائے مختلف ہوتے ہیں۔ غزل میں محبوبان مجازی کی توصیف میں شاعر کے قلم کا راہوار جہاں تک پہنچنا چاہیے۔ پہنچ سکتا ہے مگر نعت میں شریعت اور عقیدت کو زادِ سفر بنا کر آگے بڑھنا پڑتا ہے۔ ابوالخیر کشفی ایک سکہ نقاد، نثر نگار اور شاعر ہیں۔ وہ نعت میں تغزل کی طہارت فکر کو سمجھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ حسن تغزل کی جلوہ سامانی مصنوعی جذبات کے اظہار سے نہیں بلکہ کمال عقیدت کے اقرار سے ہوتی ہے۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ انوارِ قرآن سے راہنمائی لے کر محبت رسول کے قلزم نور میں غوطہ زن ہو کر اپنے وجدان کو تجلیاتِ حضور ﷺ کی نذر کر دے تو پھر قلم کی نوک سے الفاظ کی جگہ گلاب نکھرتے ہیں۔ جذبوں کی ہوک عشق کی کوک بن جاتی ہے۔ ”نسبت“ کا شاعر فکر دین کے امتزاج سے ایسی کیفیات سے گزرتا نظر آتا ہے۔

ہر ایک خلوت جاں میں اسی کی محفل ہے  
ہر ایک شخص کو اپنا دکھائی دیتا ہے  
غبارِ تشنہ لبی میں نگاہِ اُمت کو  
اسی کی ذات کا دریا دکھائی دیتا ہے  
جہاں میں ذاتِ محمد ﷺ کے سینکڑوں جلوے  
نگاہِ شوق کو کیا دکھائی دیتا ہے

.....  
خاکِ درِ سرکار سے نسبت ہے کچھ ایسی  
عنوان مرے دل کے مقالے کے لئے ہے  
بے چہرہ سہی عالمِ اسلام کا امروز  
پر گنبدِ خضریٰ تو حوالے کے لئے ہے  
میں خواب میں سرکار کو دیکھوں گا کسی دن  
معراج یہی چاہنے والے لئے ہے

سید ابوالخیر کشفی گنگ جذبوں کو گویائی اور بے جان لفظوں کو مسیحائی دینے کا ہنر جانتے ہیں۔ وہ بجا طور پر سمجھتے ہیں کہ الفاظ اور جذبے بذاتِ خود کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ یہ سرزمین غزل کے مسافر بھی بن سکتے ہیں اور منزلِ طیبہ کے پر شوق نظاروں کی جانب اپنا رخ بھی موڑ سکتے ہیں۔



بات تو فقط نسبت کی ہے؟ ان جذبوں کا حاصل کون ہے؟ ان تمناؤں کا محور کون ہے؟ ان تخیلات کا بحر بے بحراں کا ساحل کون ہے؟ بات کس کی ہو رہی ہے اور بلند یوں کی جانب اُڑان کا جذبہ رکھنے والے طائر ان سدرہ پرواز کی نگاہوں میں کسی کی تجلیات بسی ہوتی ہیں۔ ”نسبت“ کا مطالعہ سید کشفی کے جذبات عقیدت کی رفعتوں کا واضح اعلان ہے۔ وہ رفعتیں جو سرزمین طیبہ کے ذرات رہ گزار کو بوسہ دے کر اپنے وجود سے آشنا ہوتی ہیں۔

”نسبت“ کا مطالعہ قاری کے افکار کو ذوق و شوق کی لذت، احساسات کو وراثگی کی عظمت، اور سوچ کے دائروں کو قربت مدینہ کی سعادت عطا کرتا ہے۔ مہکتے ہوئے اشعار پڑھنے والوں کے قلوب کو روحانی تسکین سے بہرہ ور کرتے ہیں۔ نظریاتی شادمانی اور فکری شادکامی کا مسلسل اور بھرپور اظہار ہوتا ہے۔ قاری ”نسبت“ کے حوالے سے جوں جوں آگے بڑھتا ہے اس کے جذبات بھی شہر محبوب کی زیارت کے لئے مچلنے لگتے ہیں۔ سید کشفی ایجاز و اختصار کا ہنر بھی جانتے ہیں۔ وسعت پذیر موضوعات کو چند لفظوں میں سمیٹنے کا سلیقہ جانتے ہیں۔ خصائل و شمائل حضور سے سیرت مصطفیٰ ﷺ تک اوز زبان بیان کی طلاعت اندر تریوں سے نسبت سرور کو نبین ﷺ کے ضو بار ادراک تک انہوں نے منور منور اشعار کی کہکشاں سچائی ہے۔ ایسی کہکشاں کہ جس کا ہر ستارہ ماہتاب سخن گوئی کی تب و تاب رکھتا ہے۔

☆.....☆.....☆



## سید صبیح الدین صبیح رحمائی

توصیف حضور ﷺ سے نعت رنگ کی ادارت تک

تاریخ شاہد ہے کہ محبت رسول ﷺ سے فکری اور عملی وابستگی ہمیشہ بلند مقام عطا کرنے کا باعث بنتی ہے اس لحاظ سے وہ فرزندانِ اسلام نہایت خوش بخت ہیں جو اپنی عملی اور نظریاتی صلاحیتوں کو ذکر و فکر رسول ﷺ کی نذر کر دیتے ہیں۔ ان کی آنکھ سے ٹپکنے والے آنسو، زبان سے اعجاز بیان بن کر ابھرنے والے دلکش و دلاویز جملے ہیں یا قلم کی نوک سے نعت مصطفویٰ ﷺ کے مچلنے والے ستارے یہ سب محبت حضور ﷺ کے سبب سے عطا ہوتا ہے۔ سید صبیح الدین صبیح رحمائی بھی اسی سلسلہ نور کے قابل فخر رکن ہیں جن کی نعت خوانی اور نعت گوئی سے ایک زمانہ فیضیاب ہو رہا ہے۔

جس طرح شاعری بحور اور اوزان کی پابند ہوتی ہے اسی طرح نعت خوانی بھی مخصوص آہنگ اور جمالِ صوت کے قالب میں ڈھل کر اپنا وجود منوائی ہے۔ اگر نعت خوانی میں اسلوب نعت خوانی اور اس حوالے سے جملہ پابندیوں کو ملحوظ رکھا جائے تو پھر اچھا نعت خواں ایک وقت آنے پر قابل فخر نعت گو شاعر بھی بن سکتا ہے۔ صبیح رحمائی اس کی روشن مثال ہیں۔ انہوں نے اراداتِ حضور ﷺ کے اظہار کا ذریعہ شروع میں نعت خوانی کو بنایا۔ فیاضی قدرت نے نواز شوں کے در کھول دیئے اور وہی صبیح رحمائی جو محفل میں دوسرے نعت گو شعراء کا کلام سنایا کرتے تھے۔ بہت جلد اس قابل ہو گئے کہ اپنے نعتیہ کلام سے سامعین کے احساسات کو صوبار کرنے لگے اور پھر ان کی نعت کا سلسلہ تو پھیلتا ہی گیا۔ اس وقت ان کا شمار گنتی کے ایسے اصحابِ نعت میں ہوتا ہے جو ایک ہاتھ میں نعت گوئی اور دوسرے ہاتھ میں نعت خوانی کا پرچم تھامے کعبہ خضریٰ کی جانب دیوانہ وار لپک رہے ہیں۔ ان کے اندر یہ احساس پوری شدت کے ساتھ اُجاگر ہے کہ یہ سب عطائے رسول ہے اور نبی رحمت ﷺ کی عطاؤں نے انہیں کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے یہی احساس ان کی متاعِ فکر و فن ہے۔

ملی ہے کاسہ فن کو مرے خیراتِ طیبہ سے

مرا دیوان ہے ان کی عطا اول سے آخر تک



یہ اوّل سے آخر تک عطاءئے رسول ﷺ کا سلسلہ ہے جو صبحِ رحمانی کی صلاحیتوں کو جگمگاتا ہوا پھیلتا ہی جاتا ہے۔ صبح نے معلوم نہیں کن بہار آفریں ساعتوں میں مداحی حضور ﷺ کے گلستان میں قدم رکھا تھا کہ خوش بختیاں ان کا مسلسل احاطہ کرتی گئیں۔ نعت خوانی سے نعت گوئی تک ان کا سلسلہ اس قدر دراز اور گداز آفریں معلوم ہوتا ہے کہ گمان ہی نہیں گزرتا کہ اس سعید بخت انسان نے یہ سب کچھ مختصر سے عرصے میں حاصل کر لیا ہے۔ سرچشمہ محبت رسول ﷺ سے سیرابی افکار کا سامان حاصل کرتے ہوئے ان کے باطن سے مسلسل یہی صدا اُبھر رہی ہے۔

قلم کی پیاس بجھتی ہی نہیں مدحِ محمد ﷺ میں  
میں کن لفظوں میں اپنا اعتراف تشنگی لکھوں



قلم خوشبو کا ہو اور اس سے دل پر روشنی لکھوں  
مجھے توفیق دے یا رب کہ میں نعتِ نبی لکھوں

اور اب ایک نظر صبحِ رحمانی کی نعت کے حوالے سے کی جانے والی کاوشوں پر بھی ہو جائے۔ صبحِ رحمانی بلاشبہ جمالِ نعت کے جلوؤں میں گم رہنے والے خوش بخت شاعر ہیں۔ انہوں نے تدریجی انداز سے نئی منزلوں کی جانب اپنا سفر جاری رکھا۔ نعت خوانی میں اپنا منفرد مقام اس حیثیت سے اُجاگر کیا کہ قدرت ان پر از خود مہربان ہوتی گئی اور پھر نعت گو شاعر کی حیثیت سے ان کا نام اُبھرا۔ پہلے تو بہت سے لوگوں کو یقین ہی نہ آیا کہ چھوٹی عمر کا نو جوان (جو ابھی جوانی کے مراحل طے کر رہا ہے) کس طرح اتنی خوبصورت نعتیں کہنے لگا ہے۔ نعت گو کی حیثیت سے اپنا مقام منوالیا تو پھر ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ اب ان کی منزل فروغِ نعت تھی اگرچہ نعت خوانی اور نعت گوئی بذاتِ خود فروغِ نعت ہی کا حصہ ہیں لیکن انہوں نے ”نعت رنگ“ کا اجراء کر کے نعت گو شعراء کو انتہائی موثر پلیٹ فارم مہیا کر دیا۔ اگرچہ اس سے قبل کئی رسائل و جرائد نعت کی اشاعت کر رہے تھے مگر صبحِ رحمانی کا فروغِ نعت کا مشن اوروں سے بہت حد تک جدا تھا۔ انہوں نے نعت رنگ کو فقط نعتیہ شاعری کا صحیفہ ہی نہیں بنایا بلکہ اس کے صفحات کا بیشتر حصہ نعت کے حوالے سے لکھے جانے والے مقالات اور مضامین کے لئے وقف کر دیا۔ اس ضمن میں فقط نعت گو شعراء کے تذکار پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ نعت کے حوالے سے مختلف عنوانات کے تحت مضامین پیش کئے جانے لگے ایسے مضامین کو خصوصی اہمیت دی جانے لگی جن میں فروغِ نعت اور نعت گو شاعروں کی



تخلیقی کاوشوں پر ناقدانہ انداز اپنایا گیا تھا۔ تنقید نعت کا انداز پہلی مرتبہ اُجاگر ہوا چونکہ یہ روش نئی تھی اس لئے بہت سے اصحاب فکر چونک پڑے بعض نے سخت رویہ بھی اپنایا مگر صبحِ رحمانی کے پیش نظر فقط شخصیات نہیں تھیں بلکہ ان کی عملی کاوشیں تھیں اس لئے آہستہ آہستہ ان کا انداز پُر تاثیر لے کی صورت میں دلوں میں اُترتا گیا۔

صبحِ رحمانی نے نعت رنگ کو معمول کا ہلکا پھلکا رسالہ نہیں بنایا بلکہ اسے آہستہ آہستہ تحقیقی دستاویز کی صورت عطا کر دی۔ اپنے مقاصد کے حصول کے لئے انہوں نے ممتاز قلم کار شعراء اور اصحابِ نقد و نظر کا تعاون حاصل کیا۔ اس طرح نعت رنگ نے بہت جلد ایسے فکری پلیٹ فارم کی حیثیت حاصل کر لی جس سے اُبھرنے والے پیغام سے کوئی بھی صاحبِ فکر صرف نظر نہیں کر سکتا۔ آج یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ نعت رنگ محض ایک رسالہ نہیں بلکہ ایک تحریک بن چکا ہے ایسی تحریک جو ابلاغِ نعت اور فروغِ نعت کے حوالے سے اپنی مثال آپ ہے۔ صبحِ رحمانی نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ شخصیت پرست نہیں بلکہ فن کا قدردان ہے اور نعت میں تو فقط ایک ہی شخصیت ہوتی ہے اور وہ ہے ممدوحِ نعت حضرت محمد ﷺ۔ صبحِ رحمانی نے محبت رسول خدا میں غایت درجہ مغلوب ہو کر احترامِ نعت کے فکری پہلوؤں اور عملی تقاضوں کو اُجاگر کیا ہے اس پر یہ حقیقت پورے افتخار کے ساتھ اُجاگر ہے کہ محض اپنی طرزِ فن کے لئے کام کرنے سے نام نہیں بنتا بلکہ ممدوحِ نعت حضور ﷺ کے جلوؤں میں گم ہو کر حیاتِ ابدی کی آرزو کی جاسکتی ہے اسی لئے صبحِ رحمانی نے بڑے بڑے ناموں سے کہیں زیادہ ان کے کام کو دیکھا ہے گویا ان قلم کاروں پر جتلا دیا ہے کہ عظمتِ فن کی تمنا لے کر اس گلزارِ مدحت میں نہ آؤ بلکہ یہاں آنا ہے تو عجز و انکسار اور خلوص و ارادت کو زادِ سفر بنا کر آؤ آگے سرکار کی مرضی ہے جتنا چاہے نواز دیں۔ نعت رنگ کی مسلسل اشاعت اس حقیقت کا اعلانِ عام ہے۔ صبحِ رحمانی نے ابلاغِ مدحت کے بنیادی اصولوں کو پالیا ہے اور وہ جس عجز و انکسار کی دنیا کا خود باسی ہے دوسروں سے بھی اسی کا تمنائی ہے۔

صبحِ رحمانی سے میرا تعلق اتنا قدیم بھی نہیں لیکن اس ہمت آزمائشِ شخصیت نے اپنے قلم اور زبان سے زمین و مکان کے فاصلے یوں مٹائے کہ بالمشافہ ملاقات کے بغیر ہی یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے یہ تعلق اُفق تا اُفق پھیلا ہوا ہے۔ ذرائعِ ابلاغ کی برق رفتاری نے پوری دنیا کو ”گلوبل ویج“ بنا دیا ہے بس یہی کام صبحِ رحمانی کے اخلاص کریمانہ نے یوں کر دکھایا ہے کہ کراچی اور گوجرانوالہ کے فاصلوں کو سمیٹ کر ایک طرف رکھ دیا ہے کہ صاحبِ نہ آپ گوجرانوالہ میں ہیں



اور نہ ہی میں کراچی میں۔ آ منے سامنے ہیں کہیے کیا لکھ رہے ہیں؟ میں لکھ رہا ہوں یا یہ لکھوار ہے ہیں، بات ایک ہی ہے۔ اب تو سبحان اللہ بالمشافہ ملاقات بھی ہو چکی ہے۔ جب بھی ملاقات ہوئی اس میں ادھر ادھر کی باتوں کے بجائے مقصدیت غالب رہی۔ وہ اپنے عزائم کا اظہار کرتے ہوئے عقیدتوں کے پھول چنتے رہے کہ نعت کے میدان کو بعض سہل نگاروں نے محدود کر دیا ہے۔ حالانکہ یہ موضوع انتہائی ہمہ گیر، وسیع اور لامحدود ہے۔ نعت سے فقط دلوں کے گلزاروں کو مہکانے کا کام ہی نہیں لیا جاسکتا بلکہ اس سے تبلیغ دین اور بالخصوص تبلیغ سیرت محمدی ﷺ کا کام لیا جاسکتا ہے۔ نعت کے پیغام میں وسعت ہے اس کے قالب کی وسعتیں انقلاب برپا کرنے کا تقاضا کرتی ہیں۔ ہمارے شعراء اور ناقدین نعت اس جانب سنجیدگی سے متوجہ ہو جائیں تو نعت عصر حاضر کے فکری ادب کی نقیب اول بن سکتی ہے۔ صبیح رحمانی ایسی باتیں صرف سوچتے یا کہتے ہی نہیں ہیں بلکہ ہزار جان سے اپنی راست فکری پر عمل پیرا بھی ہیں۔ ان کا ایمان ہے کہ

لڑکھڑاتا ہوا جب چلا ہوں بھینٹنے راستہ دے دیا ہے  
راہ ہستی میں ان کے کرم نے کس جگہ پر سنبھالا نہیں ہے



ان کی مدحت پہ مامور ہوں میں غیر کی مدح سے دور ہوں میں  
فکرو فن کو صبیح اپنے میں نے غزلوں میں ڈھالا نہیں ہے  
جب پیغام نعت اور انقلاب نعت کی بات آتی ہے تو پکارا اٹھتے ہیں:  
زیست کے تپتے ہوئے صحراؤں میں ان کا وجود  
ان کی یاد ان کی تمنا ان کی سیرت کا گلاب



نکل آئیں گے حل سب مسئلوں کے چند لہجوں میں  
حیات مصطفیٰ کو سوچنا اول سے آخر تک

ڈاکٹر رفیع الدین اشفاق (بھارت) ان کی نعتیہ شاعری کے حوالے سے رقم طراز ہیں۔ ”صبح رحمانی نے اپنی عمر کے تھوڑے حصے میں جو کام کر دیا ہے وہ بہت ہے۔ جس خلوص اور جوش و خروش سے وہ اس راہ میں آگے بڑھ رہے ہیں وہ قابل ستائش ہے۔ فکر سخن میں ان کا انہماک نئے نئے اسالیب کی تلاش، خوش آہنگ الفاظ دلاویز ترکیبوں، بدیع تشبیہات اور استعارات سے اپنے کلام



کو مزین کرنے کی فکر، یہ ان کی زندگی کا ایک ایسا مشغلہ ہے جو اپنی کیفیت میں عبادت سے کم نہیں۔ یہ ان کی ذہنی اور قلبی فضا کی تطہیر کے لئے ایک وظیفہ ہے۔ کلام میں تشبیہات اور استعارات کی جدت ان کے مذاق سلیم اور ان کی شعر گوئی کی صلاحیت پر شاہد ہے۔“

صبحِ رحمانی کے لئے نعت حاصلِ حیات ہے۔ فکر و فن کا اعزاز ہے۔ قرطاس و قلم کی آبرو ہے۔ عشق و عقیدت کی نئی منزلوں کے لئے ذوقِ جستجو ہے۔ نعت ان کا ایمان ہے۔ عشق کا اظہار ہے۔ لفظوں کا افتخار ہے۔ یہ لفظوں سے خوشبو اُگانے کا ہنر جانتے ہیں اور پھر یہی خوشبو زما نے بھر میں لٹانے کا عزم رکھتے ہیں۔ اس حوالے سے ان کی شاعری عمل کا پیغام دیتی ہے۔ محبت رسول ﷺ کے حوالے سے باطل قوتوں سے ٹکرا جانے کا حوصلہ عطا کر دیتی ہے۔ اس لئے ہم نے کہا ہے کہ ان کے لئے نعت فقط سوز و گداز کا نام ہی نہیں بلکہ وقت کے ظلمت کدوں میں بصد جلال ایمانی شمعِ عمل روشن کرنے کا عزمِ پیہم بھی ہے۔ ملاحظہ کیجئے۔

لب پہ نعت پاک کا نغمہ کل بھی تھا اور آج بھی ہے  
میرے نبی سے میرا رشتہ کل بھی تھا اور آج بھی ہے



فکر نہیں ہے ہم کو کچھ بھی دکھ کی دھوپ کڑی تو کیا  
ہم پہ ان کے فضل کا سایہ کل بھی تھا اور آج بھی ہے



بتلا دو یہ گستاخِ نبیؐ کو غیرتِ مسلم زندہ ہے  
ان پہ مر مٹنے کا جذبہ کل بھی تھا اور آج بھی ہے  
سید صبحِ رحمانی بجا طور پر سمجھتے ہیں کہ نعتِ اول و آخر حسن ہے۔ جمالِ آگہی ہے کمالِ آرزو ہے۔ حسنِ بصیرت ہے۔ نورِ یقین ہے۔ وظیفہٴ قلب و جان ہے۔ وقتِ تہجدِ شبنم کے قطروں سے وضو کرتی ہوئی گلاب کی پتیوں کی طرح سرمایہٴ عشق و گداز ہے۔ یوں تو ہر نعت جو محبت رسول ﷺ کے فکری اور عملی تقاضوں سے ہم آہنگ ہو سرمایہٴ ایمان ہے مگر ان نعتوں کا حسن ہی کچھ اور ہوتا ہے جو اپنے مترنم لب و لہجے، وجدانی سرمائے اور بہارِ آفریں مصرعوں کی بدولت کلکِ شاعر سے ٹپک کر پڑھنے والوں کے دلوں پر اپنی دائمی جگہ بنالیں۔ صبحِ رحمانی نے اپنی مترنم اور تغزل آفریں نعتیہ شاعری سے کچھ ایسا ہی رنگ جمایا ہے۔ یہ اشعار پڑھئے اور آنکھوں سے مدینے



والے کی عقیدت کے آنسوؤں سے وضو کرنے کا انداز دیکھئے۔

حضورؐ ایسا کوئی انتظام ہو جائے  
سلام کے لئے حاضر غلام ہو جائے



تجلیات سے بھریوں میں کاسہ دل و جاں  
کبھی جو ان کی گلی میں قیام ہو جائے



مزا تو جب ہے فرشتے یہ قبر میں کہہ دیں  
صبحِ مدحتِ خیر الانام ہو جائے

صبحِ رحمانی نے جس پیغامِ نعت کو عام کرنے کا پرچم لہرایا تھا وہ آج دورِ حاضر کا اعزاز بن چکا ہے۔ صبحِ رحمانی کی نعت گوئی ہو یا نعتِ رنگ کے تاریخی سلسلے کی صدائے بازگشت آج اس مداحِ رسول ﷺ کا پیغام لمحے لمحے میں سما چکا ہے بلکہ شبہ اس کا یہ افتخار حاصلِ زیست بن چکا ہے۔

میں ہوں وقفِ نعتِ گوئی کسی اور کا قصیدہ  
مری شاعری کا حصہ کبھی تھا نہ ہے نہ ہوگا



مرے طاقِ جاں میں نسبت کے چراغِ جل رہے ہیں  
مجھے خوفِ تیرگی کا کبھی تھا نہ ہے نہ ہوگا



کسی وہم نے صدا دی کوئی آپ کا مماثل  
تو یقین پکار اٹھا کبھی تھا نہ ہے نہ ہوگا

اس پوری نعت میں کبھی تھا نہ ہے نہ ہوگا“ کی ردیف صبحِ رحمانی کے ایمان کی پختگی اور حضور ﷺ سے امنٹِ محبت اور وابستگی کا واضح ترین اعلان ہے یعنی شاعر یہ سوچنے کو تیار ہی نہیں کہ اس کے محبوب ﷺ جیسا کوئی اور ہے یا ہو سکتا ہے۔ وہ ایسا سوچنا بھی گناہِ کبیرہ سمجھتا ہے۔ تشکیک و اوہام کی دھند میں گرفتار ایسے شعراء کے لئے کہ جو فقط نام و اعزاز کے لئے زندہ ہیں اور جب حضور ﷺ سے محبت و عقیدت کے واضح ترین اعلان کا وقت آتا ہے تو لفظوں کی بھول بھلیوں کی



بدولت پہلو بچا کر نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ صبحِ رحمانی کے عشق کی پختگی ایک زمانے کو حضور ﷺ سے غیر متزلزل وابستگی کا حسن عطا کر رہی ہے۔

ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی ناقدانہ انداز سے صبح کی راست فکری پراظہار خیال کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔ ”نوجوان باعزم اور ادب آشنا صبحِ رحمانی کو اللہ تعالیٰ نے یہ توفیق بخشی کہ در بدری کی رسوائیوں سے محفوظ رہا اور نوخیزی کے ایام ہی میں جادۂ رحمت کا راہی بنا، غزل کی جلت رنگ میں جوانی کے لئے بڑی ترغیبات ہوتی ہیں مگر قدرت نے اس جوان کو دورِ تربیت ہی میں ایقان کی پختگی عطا کر دی۔ کتنا بڑا اعزاز ہے کہ صبحِ رحمانی کا شعری شعور صرف ایک پیکرِ جمال سے مستنیر ہے۔ اس لئے اسے اعتماد ہے۔

بس اس نام کی خوشبو ہے مرے ہونٹوں پر

بس یہی نام دو عالم میں بڑے کام کا ہے

صبحِ رحمانی ایک بلند فکر نظریاتی شاعر ہے جو سوز و گداز سے عشق و عقیدت کے نئے نئے عنوان تراشتا ہے۔ فکر و فن پر غرور نہیں کرتا بلکہ بارگاہِ رسول ﷺ میں عاجزی اور عجز شعاری کو خضر راہ بناتا ہے اس کا ایمان ہے کہ ذاتِ رسالتِ مآب ﷺ اس قدر بلند، عظیم اور رفیع المرتبت ہے کہ ان کے حضور فرشتے بھی دم بخود حاضر ہوتے ہیں جہاں فنی تفاخر سے نہیں بلکہ انتہائے عاجزی سے آگے بڑھنے کا موقع ملتا ہے۔ جسے حضور ﷺ کی غلامی کی نسبت نصیب ہو جائے اس کے سامنے زمانے بھر کا جاہ و جلال ہیچ ہے۔ اسی کمالِ عجز کا انداز صبحِ رحمانی کے ہاں ملاحظہ کیجئے۔

نظر کے ریگزاروں کو متاعِ نقشِ پا دے دو

میں ہوں تاریک راتوں میں اُجالوں کا پتہ دے دو



میں نواحِ شب میں بھٹک گیا نئے سورجوں کی تلاش میں

کوئی روشنی کہ بدل سکے مری شب کا حال مرے نبی



مری کیا جرأت کہ بن جاؤں غلامِ مصطفیٰ ﷺ

مجھ کو تو ان کے غلاموں کی غلامی چاہیے

زندگی جہدِ مسلسل اور تحرک سے عبارت ہے۔ یہاں ستانے کا دوسرا نام کوتاہی و ذوقِ عمل



ہے اور وقت کی تیز رفتاری کوتاہی و ذوقِ عمل کی اجازت نہیں دے سکتی جو مسافر کا روانِ عمل سے کچھڑا سو کچھڑا یہاں منزل اسی کا مقدر بنتی ہے جو ہر آن مجھ جستجو رہنے کا حوصلہ رکھتا ہو۔ صبحِ رحمانی کی تمام تر کاوشوں کا جائزہ لیتے ہوئے یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ یہ کسی طور بھی وقت کے سیلِ رواں کے مقابل اپنی جدوجہد کے پتوار پھینکنے کو آمادہ نہیں ہے۔ صبحِ رحمانی کو قدرت نے سیمابی روح عطا کی ہے۔ یہ رکنے کے عمل سے نا آشنا ہے بلکہ خود رکنا تو ایک طرف یہ زمانے کو ساتھ لے کر چلنے کا عزم کیے ہوئے ہے اور خوش بخت ہیں وہ مسافر جو اس کے ساتھ جادۂ رحمت کے مسافر بن گئے۔ یہ انہیں بھی نعت گوئی اور تنقیدِ نعت کے میدان میں مسلسل محوِ عمل رکھتا ہے۔ یہ اسی جہدِ مسلسل کا ثمر ہے کہ آج ”نعت رنگ“ کے ظاہری و باطنی مواد، فکری محاسن اور مضامین کے تنوع کی صدائے باز گشت دنیا بھر کے ایوانوں میں سنی جا رہی ہے۔ صبحِ رحمانی نے اپنی کاوشوں اور خداداد صلاحیتوں سے مجلہ نعت رنگ کو یوں نقشِ دوام بخشا ہے کہ آج اس مجلہ کا ہر شمارہ نعتیہ انسائیکلو پیڈیا کی ایک کڑی معلوم پڑتا ہے۔ دعا ہے کہ ربِ کریم صبحِ رحمانی کے عزائم کو مزید وسعت اور اس کے حوصلوں کو مزید فراخی عطا کرے تاکہ یہ سعید بخت نعت گو اور نعت رنگ کا مدیر شہیر وہ سب کچھ کر گزرے جس کا تصور کر کے اس نے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔ آمین بحرمتہ سید المرسلین۔





## مسدس کی ہمہ گیری اور انور جمال کی مدحت نگاری

اگرچہ شاعری کا تعلق شاعر کی واردات قلبی اور فکری تگ و تاز سے ہوتا ہے اور شاعر اپنے مدعا کو پیش کرنے کے لیے کسی بھی مخصوص صنفِ سخن یا مخصوص اسلوب کا پابند نہیں ہوتا۔ جس طرح ”نالہ پابند“ نے نہیں ہے۔،، اسی طرح سخن گو بھی کسی ایک صنفِ ادب تک خود کو محدود نہیں رکھتا۔ شاعروں، نغمہ گروں اور سخن طرازوں نے جملہ اصنافِ شاعری میں اپنی خداداد صلاحیتوں کا جادو جگایا ہے۔ غزل، مثنوی، رباعی، ہائیکو اور مسدس سمیت انہوں نے ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ دراصل بعض اوقات کلام خود اپنے لئے راہیں ہموار کرتا ہے اور کلام کی موزونیت خود بخود مخصوص صنفِ سخن کا تقاضا کرتی ہے۔ حمد، نعت، مرثیہ اور قصیدہ سمیت ہر مضمون کو ہر صنفِ سخن میں ادا کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی، یہ علیحدہ بات ہے کہ بعض مضامین کو ادا کرنے کے لئے بعض اصنافِ سخن مخصوص ہو کر رہ گئیں۔ ان میں سے ایک اہم صنفِ سخن مسدس ہے جس میں ہر مضمون کو سمونے اور شاعری کے مطالب شعری کو بشرح کمال بیان کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔

مسدس کا ہر بند چھ مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ لیکن مسدس کے ترکیبی عناصر میں بلا کی روانی اور الفاظ کی موزونیت ہے کہ جس مضمون کو بھی اس میں سمونا چاہیں، نظر آتا ہے کہ یہ مضمون اور یہ خیال مسدس ہی کے لئے موزوں ہوا ہے۔ تاریخ شعر و سخن پر ایک نظر ڈالتے ہی مسدس کی جامعیت، ہمہ گیریت اور تاثر انگیزی ظاہر ہونے لگتی ہے اور صاف دکھائی دینے لگتا ہے کہ یہ وہ شعری ملبوس ہے جو ہر صنفِ سخن کے قد زیبا پر موزوں نظر آتا ہے۔ مسدس میں ادا ہونے والے مضامین اور اصناف کو دیکھ کر اس کے دامن کی وسعت اور قالب کی فراخی کا احساس ہونے لگتا ہے حمدِ ربِ جلیل ہو یا نعت سرورِ کونین ﷺ، شہر آشوب ہو یا حالات کی سختیوں کا ماجرا، مرثیہ کے دلگداز موضوعات ہوں یا قصیدہ کے توصیفی لوازمات، حالات کی بے رحمیوں کا فسانہ ہو یا زوالِ اُمت کی داستاں، مسدس نے دوسری اصناف کی نسبت کہیں زیادہ بہتر انداز سے مطلوبہ موضوعات کی تصویر کشی کی کوشش کی ہے۔

جہاں تک مدحت و توصیف مصطفیٰ ﷺ کا تعلق ہے تو اس میں مسدس کا حسن اور ہی انداز سے جلوہ گر نظر آتا ہے۔ یہ ”مسدس حالی“، ہی تھی جس نے ایک زمانے کو بیدار کر دیا۔ شعری دنیا میں انقلاب برپا کر دیا اور شعرا کو نعت نگاری کے نئے اسلوب سے آشنا کیا، محشر رسولِ نگری کی



عظیم نعتیہ تصنیف ”محرر کونین“ مسدس کے پیرائے میں سرور کونین کی دلاویز سوانح حیات ہے۔ محسن کا کوروی کی نعتیہ مسدس اپنی جگہ بلند مقام کی حامل ہے۔ تفصیلات سے گریز کرتے ہوئے جب ہم عہد حاضر میں داخل ہوتے ہیں تو نعت گو انور جمال کی مسدس ”لولاک لما“، قارئین کے اذہان اور افکار کو اپنی لپیٹ میں لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ”لولاک لما“ میں انور جمال نے مسدس کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے جس کا حقیقی اندازہ اس کے مطالعہ سے ہی ہو سکتا ہے۔

رب دو عالم کا ہم پہ کس قدر احسان ہے کہ اس نے محبوب کائنات حضور ﷺ کو لولاک لما خلقت الافلاک کی خلعت دوام عطا کر کے آپ کو مدوح آدم و بنی آدم بنا دیا۔ اب کون بے بھر ہے جو حسن و جمال مصطفویٰ کی لمحہ افشانیوں کو قلب و نظر کی زینت بناتے ہوئے آپ کی بارگاہ میں توصیف و ثنا کی ڈالیاں نذر کرنا نہ چاہے گا۔ سلطان دو جہاں اگر کرم بار ہو اور تحدیثِ نعمت کا جذبہ برقرار ہو تو پھر ذرات بے مایہ کو بھی مہرِ علم و آگہی کی مدحت و توصیف کا حوصلہ عطا ہونے لگتا ہے مدحت سرائی کے اسی ذوقِ سرمدی کی لے سے نعتِ مصطفویٰ کی نے ابھرتی ہے۔ آرزو کی خامکاری سے عشق کی جاں سپاری جنم لیتی ہے عقیدت کی وسعتوں سے مدحت کی رفعتوں کا اہتمام ہوتا ہے اور محشرستانِ خیال میں عشقِ مصطفویٰ کے نخلِ ایمانی کی چھاؤں تلے نعتِ سرکارِ دو عالم ﷺ و اماندگانِ ہستی کو روحانی و فکری سکون سے بہرہ ور کرنے لگتی ہے۔

نعتِ سرور کائنات ﷺ حکمِ الہی کی تعمیل بھی ہے اور جذباتِ عشق کی تکمیل بھی۔ غلاموں کا آقائے نامدار کے حضور ار مغانِ نیاز بھی ہے اور خاصانِ کائنات کا امتیاز بھی۔ عشاقِ سرمست کا نعمۂ لا ہوتی بھی ہے اور خاک نشینوں کی پروازِ تخیل کا اندازِ ملکوتی بھی۔ شہیرِ عقیدت کا ذوقِ پرواز بھی ہے اور خاموش لبوں پہ مچلتی ہوئی زندگی پرور آواز بھی۔ شاد کام تمناؤں کی صدا بھی ہے اور سرخوش و سرشار جذبات کی توا بھی۔ ازل کی حسین ساعتوں میں جس ایوانِ نعتِ رسول ﷺ کو زینت بخشی گئی تھی وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے درود و سلام کے قدسی زمزموں سے آباد ہو گیا۔ خدائے کریم کی تقلید میں تمام انبیاء و رسل مختلف ادوار میں آپ کی ذات والا صفات کو خراجِ مدحت ادا کرتے رہے لیکن عہدِ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام میں حضرت حسان بن ثابت اور حضرت کعب بن زہیر نے تجلیاتِ نبوی کو آئینہ دل میں پر تو فلکں کرتے ہوئے جس باقاعدہ سلسلہ نعت گوئی کا آغاز فرمایا وہ خوشنودیِ مصطفیٰ کے طفیل ابد الابد تک کے لئے مدحت و نعت کی عالمگیری کا مظہر بن گیا۔

ہر دور و دورِ نعت ہے اور ہر عہد انوارِ مصطفیٰ سے مستنیر ہونے کے لئے نعت کا وسیلہ ڈھونڈتا رہا ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں کرامت علی شہیدی، محسن کا کوروی، احمد رضا خاں، علامہ اقبال اور ظفر علی خاں کے حوالے سے جب ہم جدید ادبی دور کا جائزہ لیتے ہیں تو نعت گوئی کو اپنی تمام تر فکری و روحانی کاوشوں کا محور بنانے والے ثنا گو یاںِ مصطفیٰ کے احترام میں بے اختیار جہیں خم



اور پلکیں نم ہونے لگتی ہیں۔۔۔ انور جمال بھی دورِ حاضر کے ان خوش بخت شعراء میں شامل ہیں جنہیں تو صیف و ثنائے رسول کی دولت بطورِ خاص ودیعت ہوئی ہے انہوں نے ”لولاک لما،، کی صورت میں حضور پر نور سید یوم النشور ﷺ کی مدحت و توصیف کا ایک ایسا گلشن سدا بہار کھلا دیا ہے جس کی کلیاں جوشِ عقیدت سے چمکتیں، غنچے اظہارِ شوق کے لئے لب واکرتے اور پھول فرطِ عشق و عقیدت سے تبسم آفریں دکھائی دیتے ہیں۔ لولاک لما خلقت الافلاک کی تفسیر انور جمال کے قلم عقیدتِ رقم سے ملاحظہ کیجئے۔

جذبوں میں جوشِ دل میں تمنا دھنک میں رنگ  
برگِ گلاب و نورِ چراغ و شرارِ سنگ  
موجیں ہوا پرند، بھنور مچھلیاں نہنگ  
الفاظِ صوت گفتگو مضربِ جلت رنگ  
پنہاں نظر سے تھا جو ہویدا کیا گیا  
سب کچھ اسی کے واسطے پیدا کیا گیا

”لولاک لما،، میں شاعر نے شاعری کے نام پر اپنے جذبات بے کراں کو عقیدت رسول ﷺ کی زبان بخشی ہے۔ انور جمال ممتاز غزل گو شاعر ہیں لیکن جب آپ غم جاناں اور غم روزگار سے پہلو بچا کر ایوانِ نعت میں داخل ہوئے تو آپ کا فکری مشاہدہ، روحانی مطالعہ، فصاحت و بلاغت کی بوقلمونیاں، ندرتِ نخیل اور جدتِ بیان آپ کے پایہ رکاب تھے۔ شعری و فکری محاسن سے آپ کا دامنِ علم آباد تھا یہی وجہ ہے کہ ”لولاک لما،، میں جذبات اپنے تمام ترفنی و فکری شکوہ کے ساتھ نمایاں نظر آتے ہیں۔ الطاف حسین حالی نے مد و جزر اسلام کی صورت میں اصحابِ یقین کو جس طور حضور نبی کریم ﷺ کی شخصیت اور سیرت کا احساس دلایا ”لولاک لما،، اسی کی صدائے بازگشت ہے جو پڑھنے والوں کے ذہنی خلوت کدوں میں پوری تاثیر کے ساتھ گونج رہی ہے۔ غزل کی مجازی چکاچوند سے نعت کی ایمانی تب و تاب کی طرف لوٹتے ہوئے انور جمال حرفِ عجز کے نام سے رقمطراز ہیں۔

”یہ شاعری نہیں۔ شاعری کے لئے میرا ذریعہ اظہارِ غزل ہے یہ تو ان گداز جذبوں کا تخلیقی اظہار ہے جو ہر وقت میری ذات کے سمندر میں متلاطم رہے۔ کبھی یہ میرے اشکوں میں منقلب ہو کر بہے، کبھی دھڑکن کے ساز میں متشکل ہوئے اور کبھی ان جذبوں نے طویل خاموشی کی ردا اوڑھ لی۔ یہ ساری جذباتی کیفیات ہیں جو لفظ محمد ﷺ کے جمال اور جلال کو شعور و وجدان کے سامنے رکھنے سے پیدا ہوتی ہیں،،۔

شاعری میں ایک مشکل مرحلہ مختلف کیفیات کو قلمبند کرنے کا ہوتا ہے اور جب اس



شخصیت کا تذکرہ ہو جس کے نام سے معمورہ عالم کو شوکتِ نمودی، جس کا ذکر حسنِ عبادت، جس کی صورت رشکِ بہاراں اور جس کی سیرت جمالِ فطرت ہے۔ جس کے تصور سے دلوں میں عقیدت کے فانوس جلتے، دلوں میں زندگی کے ولولے مچلتے، آرزوؤں کے خواب حقائق میں ڈھلتے اور حسرت و حرمان کی بنجر زمینوں میں قبولیت و پذیرائی کے چشمے ابلتے ہیں جس کا نام محمد و احمد ﷺ ہے جو پریشاں حال بزمِ ہستی کا قرار، ٹھکرائے ہوئے انسانوں کا افتخار اور ممدوح مخلوق و خالق کردگار ہے تو پھر شاعرانے قلم کو زمزمِ عقیدت میں ڈبوتا اور احتیاطِ شریعت کو اپنی فکر میں سموتا ہوا آگے بڑھتا ہے دعائے خلیل اور نویدِ مسیحا کے ظہورِ قدسی کی جاں نواز ساعتوں کا تذکرہ ”لولاک لما،، کے حوالے سے ملاحظہ کیجئے۔

سورج نے دیں سحابِ رُتوں کی بشارتیں  
بادِ سحر نے لکھیں گلوں پر عبارتوں  
شب نے مہ و نجوم پر ڈالیں بجھارتیں  
اوقات کے ضمیر میں جاگیں حرارتیں  
کلیانِ نجوم کا ہکشاں دیکھنے لگے  
اٹھ اٹھ کے راہِ فخرِ زماں دیکھنے لگے



فرخ تھا لمحہ صبحِ سعادت کا وقت تھا  
ایمان کی گھڑی تھی عبادت کا وقت تھا  
ساعت تھی آگہی کی بصیرت کا وقت تھا  
ربِ صمد کی خاص عنایت کا وقت تھا  
جب کی دعا خدا سے خدا کے خلیل نے  
دم بھر کو سانس روک لیا جبرائیل نے  
حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عالی مرتبت شخصیت حسنِ صورت اور حسنِ سیرت سے عبارت ہے۔ حسنِ صورت وہ کہ ازل سے ابد تک کی جمالِ آفرینیوں کو آپ کے سراپائے اقدس میں سمو دیا گیا۔ مہر و ماہِ آپ کی تابانیوں سے مستنیر ہوتے اور نجوم و کہکشاں آپ کی حیرات سے جگمگاتے ہیں۔ نورِ خدا کا مظہر بنا کر آپ کو یسین و طہ کا مصداق ٹھہرا دیا گیا۔ ادھر آپ کے جمالِ سیرت کا یہ کمال کہ صادق و امین کے القاب کا حامل ٹھہرا کر آپ کے کردار کو ”اُسوہ حسنہ“ کا نام دیا گیا۔ حقیقی نعت فی الواقع آپ کی صورت و سیرت کے ذکر جمیل سے عبارت ہے مگر بیشتر نعت گو شعراء جب نعت لکھنے بیٹھے تو ان کی نظر آپ کے انوار و تجلیات میں کھو کر رہ گئی اور پھر تمام تر کوشش کے باوجود وہ رُخِ مصطفیٰ کی تجلیات سے نظر ہٹانے کی کوشش نہ کر سکے اور آپ کی عظمتِ کردار



سے کما حقہ آگاہ ہونے کے باوجود ان کے لئے اس پہلو کو اجاگر کرنا ممکن نہ رہا۔  
 انور جمال نے نعت رسولؐ کے حقیقی خدو خال کو فکر کی وسعتوں میں سموتے ہوئے آپ کے خُسن صورت کے ساتھ ساتھ خُسن سیرت کو بھی حاصل شاعری بنایا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ امر خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ انہوں نے حضور نبی کریم ﷺ کے جمال جہاں آفریں کا تذکرہ کرتے ہوئے آپ کو غزل گو شعراء کے روائتی محبوب کی حیثیت سے پیش نہیں کیا ہے۔ وہ انسانِ کامل جو کائنات کے جملہ محامد و محاسن کا مجموعہ اور بلند ترین خصائل و اوصاف کا مرقع ہو اور جس کے لافانی سیرت و کردار کے افق سے روح حیات کی تابانیاں پھوٹ رہی ہوں۔ بادہ خوار غالب نے ایک غزل کے نعتیہ مطلع میں کہا تھا۔

منظور تھی یہ شکل تجلی کو نور کی  
 قسمت کھلی ترے قد و رخ سے ظہور کی  
 غالب کے اسی شعر کے پیش منظر میں انور جمال کی نعتیہ مسدس کا بند پیش نظر ہے۔  
 جلوہ ہے وہ صفاتِ خدائے غفور کا  
 وہ عبدہ کی شکل میں پیکر ہے نور کا  
 چمکا ہے جس کے دم سے مقدر ظہور کا  
 جس کے قدم کی خاک بھی سرمہ ہے طور کا  
 راتوں کی ضو دنوں کا اجالا اُسی سے ہے  
 دنیا میں روشنی کا حوالہ اُسی سے ہے  
 اب انور جمال کے قلم سے سیرت و کردار مصطفوی ﷺ کا اظہار دیکھئے۔

ذہنوں کو سوچ ، سوچ کو دانائی بخش دی  
 مُردوں کو جان ، جاں کو مسیحائی بخش دی  
 سینوں کو دل دلوں کو توانائی بخش دی  
 غربت کو فقر ، فقر کو دارائی بخش دی  
 افلاس کو وقار عطا کر دیا گیا  
 مفلس کو اعتبار عطا کر دیا گیا

انور جمال نے لولاک لما کے لئے مسدس کی ہیئت کا استعمال کر کے ایک کڑی راہ اختیار کی ہے۔ بحمد اللہ کہ وہ اس راستے پر پوری احتیاط شریعت اور احترام مقام مصطفیٰ ﷺ کو مد نظر رکھتے ہوئے چلے ہیں۔ مسدس کی ہیئت جس تاریخی شعور، زمانی و مکانی صداقت، واقعاتی سچائی اور معنوی ارتقا کے ساتھ ساتھ جس سلاست و روانی کا تقاضا کرتی ہے ”لولاک لما“، ان سب کا موثر اظہار ہے۔ حضور ﷺ کا ظہور، آپ کا اعلان نبوت، ظلماتِ کفر کی یورش، رحمتِ دو عالم کی پیہم



عنایتیں، اشراقِ کفر کی مشرکانہ تگ و تاز، وہ آپ کے لبوں پہ رقصاں بسمِ دلنواز، وہ اعدائے دین کی حیلہ سازیاں، وہ سید الکونین کی رحمت نوازیاں، آپ کے خصائل و محاسن، آپ کی سیرت کے نقوش روشن، آپ کے روحانی و نظری کمالات، آپ کے خصائل و معجزات، آپ کی گفتار کی معجزکاریاں، کردارِ سر بلند کی ضو بارپاں، خلقِ عظیم کی اثر آفرینی، وہ بے مثال رحمۃ العالمینی۔ ان سب کی جھلک ”لولاک لما،، کے آئینے میں ضرور نظر آتی ہے ملاحظہ کیجئے۔

جو بوریہ نشین ہے دشتِ حجاز کا  
وہ رمزِ داں ہے گن کی نوا ہائے ساز کا  
محرم ہے وہ مظاہرِ فطرت کے راز کا  
انگلی سے موڑ لائے جو لمحہ نماز کا

جس وقت چاہے کھینچ لے باگیںِ سحاب کی  
اس کی گرفت میں ہیں رگیںِ آفتاب کی

نعتِ رسولِ کریم! ایک ایسا وسیلہ اظہار ہے جس کی بدولت بندگانِ خدا کو محبوبِ خدا کی توصیف و ثنا کا موقع میسر آتا ہے۔ کعبہِ خضریٰ کی خشک چھاؤں کی خاطر تڑپنے والے مہجوردلوں کے لئے نعت وہ شجرِ طوبیٰ ہے جس کے مہکبار سائے تلے انہیں قلبی سکون اور روحانی طمانیت میسر آتی ہے یا پھر نعت وہ زمزمِ حیات ہے جو زندگی کے جھلستے ہوئے صحرا میں نیم جان عشاقِ سرمست کو آبِ بقا بخشتا ہے یا پھر نعت وہ قندیلِ نور ہے جس کی روشنی سے مدحت نگار پہلے اپنی فکری خلوتوں اور پھر کاروانِ شوق کی جلو توں کو ضیا بار کرتا ہے سوانورِ جمال نے بھی ”لولاک لما،، کی صورت میں ایک ایسے ہی چراغِ آرزو کو روشن کیا ہے۔ آج انورِ جمال فکری و فنی افتخار کے ساتھ نہیں بلکہ تمام تر عجز سامانی کے ساتھ لولاک لما کی الی اٹھائے شہرِ شوق کے تاجدارِ پُر انوار ﷺ کے حضور حاضر ہیں۔ یوسفِ عربی نازشِ خوبانِ دو عالم کی خریداری کا دعویٰ لے کر نہیں بلکہ ان کی خوشنودی کے طلبگاروں کی فہرست میں اپنا نام لکھوانے کے لئے۔ تو آئیے چند لمحوں کے لئے ہم بھی یہ کہتے ہوئے انورِ جمال کے ہمنوا بن جائیں۔

اے تُو کہ تیری ذات سے محکم ہے میری ذات  
اے تُو کہ تیری ذات پہ نازاں قلمِ دوات  
مجھ پر سدا رہی ہے تری چشمِ التفات  
یہ نعت خواں ہو حشر میں بھی تیرے سات سات

حیرت میں ہوں ملک مرے اوجِ نصیب پر  
حشر کے لوگ رشک کریں مجھ غریب پر

☆☆☆



منفرد اور سر بلند نعت گو

## عبد الغنی تائب

توصیف مصطفیٰ ﷺ وہ نعمت عظمیٰ ہے جو ہر کسی کا مقدر نہیں بنتی۔ تاریخ شاہد ہے کہ ہر دور میں وہی خوش بخت روح عصر کہلائے جنہیں بارگاہِ لم یزل سے ثنائے حضور ﷺ کی توفیق عطا ہوئی۔ ثنائے رسول وہ لامتناہی داستانِ عقیدت ہے جو پھیلی تو لامحدود تھی مگر جب اسے سمیٹا گیا تو اسمِ محمد ﷺ کی تجلیات میں گم ہو کر رہ گئی۔ اس داستانِ شوق کو عہدِ ماضی سے دورِ حال اور حال سے زمانہٴ مستقبل تک کا اعزاز بنانے کے لئے جو سعید قسمت شعراءِ نوکِ خامہ سے جمالِ رسول ﷺ کے گل و لالہ مہکار ہے ہیں اُن میں سے ایک تیزی سے اُبھرتا ہوا نام عبد الغنی تائب کا ہے۔ عبد الغنی تائب دل کی خلوتوں کو مدت سے صورت و سیرت حضور ﷺ کی جلوہ گری سے آباد کیے ہوئے پارہٴ ناں، کے تصور سے بے نیاز ہو کر کرم نواز آقا کے در کی گدائی کو حاصلِ آرزو سمجھنے والے کاروانِ نعت کے معزز رکن، جن کے لئے نعت نمودن نہیں بلکہ روحِ عبادت ہے۔ کشاکشِ حیات سے فرصت پا کر نعت کے مرکزِ دامن میں اس طرح پناہ لی کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اسی وادیِ جاں نواز کے ہو کر رہ گئے۔ جب حاصلِ آرزو دل کا مقدر بن جائے تو پھر کہیں اور جانے کا خیال بھی تو ہیں آرزو کہلاتا ہے۔ کیونکہ

دید حق عشق احمد بندگان چیدہ خود را

بہ خاصاں می و ہدشہ بادۂ نوشینۂ خود را

عبد الغنی تائب کی نعت گوئی محض لفظوں کی جلوہ گری نہیں بلکہ اس کے پس منظر میں وہ غیر معمولی جذبہٴ عشق و ارادت موجزن ہے جو عشاق کو دامنِ حضور ﷺ سے قلبی و نظریاتی وابستگی کے اسالیب عطا کرتا ہے۔ شاعر کو احساس ہے کہ مدحت و نعت کے جس کوچے میں وہ قدم رکھ رہا ہے وہاں جنید و بایزید بھی نفسِ گم کردہ آتے ہیں، وہاں اونچی آواز بھی عمر بھر کا سرمایہٴ عبادت چھین سکتی ہے، وہاں پلکوں سے جاروب کشی کی تمنا کی جاتی ہے، وہاں ناز نہیں بلکہ نیاز کی قبولیت ہے۔ وہاں عاجزی کی سرخروئی اور احساسِ بے مائیگی کو شوکتِ بندگی عطا ہوتی ہے۔ اس کمالِ عجز نے عبد الغنی تائب کو یہ ادراک بخشا کہ بارگاہِ مصطفویٰ میں ارمغانِ نیاز کو وسیلہٴ اظہار بنا کر ہی وہ خوشنودی



رسول ﷺ کے تمنائی بن سکتے ہیں۔

ارمغانِ نیاز اگرچہ نعتیہ مجموعہ کا نام ہے مگر یہ نعت گو شعراء اور فنِ نعت گوئی پر مباحث پیش کرنے والوں کے لئے ایک مہکبار ترکیب بھی ہے اور عبدالغنی تائب نے تو شروع سے آخر تک زندگی کا ماحصل یہی بنائے رکھا ہے کہ

شاید اسی کا نام ہے توہینِ جستجو  
منزل کی ہو تلاش ترے نقش پا کے بعد

اس تناظر میں ارمغانِ نیاز محبت و عقیدت مصطفیٰ ﷺ کا سدا بہار گلدستہ ہے جس کے پھولوں کی رنگت جدا جدا ہو سکتی ہے۔ بخور اور اوزان مختلف ہو سکتے ہیں مگر اس گلدستہ کا ہر پھول کسی نہ کسی حوالے سے صورت و سیرت محبوب دو عالم ﷺ کی رنگ آمیزی اور لطافت لئے ہوئے ہے۔ عبدالغنی تائب کے ہاں ایوانِ نعت میں داخل ہونے کے لئے پہلا قرینہ ہی نیاز مندی اور عجز و فروتنی ہے۔

وہ اسم محمد ﷺ ہے جسے ہونٹ بھی چومیں  
کچھ ایسا حسیں نام ہے ہر ایک حسیں سے

نیاز عشق میرا مدعا ہے  
حصولِ بندگی نعت و ثنا ہے

عرضِ دعا کو جنبشِ لب سے غرض نہیں  
پلکوں پہ اشک بکھرے ہیں اس بے نوا کے پاس

میں بڑھ کر چوم لیتا ہوں قدم ہر اس مسافر کے  
جسے جو سفر میں جانبِ طیبہ کہیں دیکھوں

شوق سر کو ہے جبیں سائی کا با عجز و نیاز  
پوری ہوگی آرزو نقشِ قدم پانے سے ہی



یہ زباں گنگ اور شکستہ ہے قلم عاجز بیاں  
ان سے ممکن ہی نہیں مدح شہ کون و مکاں

ہر ثنا خواں کی زباں پر عاجزی کا اعتراف  
کب ہوا ہے نعت کا حق یا نبیؐ مجھ سے ادا

اس حقیقت کے اعتراف میں یارائے کلام نہیں کہ عبدالغنی تائبؒ نے اپنی نعت گوئی کی بدولت عصر حاضر کو سیرت حضور ﷺ کا پیغام دیا ہے۔ بعثت مصطفیٰ ﷺ کا مقصد اولیٰ بھی یہی تھا کہ گمراہوں کو جادۂ حق پر گامزن کر کے خدا نا شناسوں کو عرفان الہی کی منزل سے ہمکنار کیا جائے۔ حضور پر نور سید یوم النشوء ﷺ نے ”لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ“ کا تاج زرنگار زیب سر کر کے قافلہ انسانیت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دینی دنیاوی سرفرازیوں سے بہرہ ور کر دیا۔ آپ کی سیرت مقدسہ جان قرآن تھی تو صورت نور قرآن آپ کے روشن کردار نے تاریک دلوں کو ضو بار کر دیا۔ عرب کے بدوؤں کو قیصر و کسریٰ کے مقدر کا مالک بنا دیا یہی وجہ ہے کہ رب کریم نے آپ کی اطاعت کو اپنی اطاعت قرار دیتے ہوئے اطاعت مصطفیٰ ﷺ کو ہی نجات ابدی کی ضمانت بنا دیا۔ آج ضرورت ہے کہ زمانے کے مادیت زدہ دلوں میں اسم محمد ﷺ کی شمع سے اُجالا کیا جائے۔ عبدالغنی تائبؒ نے اپنے آقا و مولا کی لازوال سیرت سے اکتساب و فیض کرتے ہوئے محاسن حضور کو زمانے بھر کے سامنے بشرح کمال پیش کر دیا ہے کہ خستہ سامانو! اگر حیاتِ سرمدی مقصود ہے تو بلا تاخیر دامانِ مصطفیٰ ﷺ سے وابستہ ہو جاؤ ورنہ۔

قافلہ تو اے رضا اول گیا آخر گیا

تائبؒ کے جملہ شعری محاسن اپنی جگہ، لاریب انہوں نے جس حسین انداز سے عصر حاضر کو عظمتِ رسولِ خدا کا پیغام دینے کے لئے آپ کے کردار اور سیرتِ مطہرہ کے مختلف زاویوں کو اُجاگر کیا ہے۔ اس نے ان کی شاعری کا حسن ہی دو چند نہیں کر دیا بلکہ بے شمار تاریک دلوں کو سیرت حضور کی ضیا بخشنے کا اہتمام بھی کر دیا جائے۔ اب ہم دیکھتے ہیں عبدالغنی تائبؒ کس حسین انداز میں کثافت آلود دلوں کی لطافتِ عشقِ مصطفیٰ ﷺ مہیا کرنے کی کوشش کرتے ہوں۔

اے باعثِ آبادی بزمِ گل و لالہ

محبوب مجھے آپ کی سیرت کا حوالہ



ہمدوشِ ثریا ہے کیا اہلِ زمیں کو  
انسان کو ہے آپ نے پستی سے نکالا

ہر اُفق پر ہے مثالِ مہر و مہ جس کا وجود  
قائدِ انسانیت کو رہنما رکھتا ہوں میں

اے صلِّ علیٰ نامِ ترا کتنا حسین ہے  
سیرت ہے کہ خود بولتا قرآنِ مبیں ہے

اشرف مخلوق کو دکھلا کے راہِ مستقیم  
آپ نے کی دنیا بھر کی رہبری اچھی بھلی  
توڑ ڈالے کعبہٴ دل سے تعصب کے خم  
بکتر و برتر کو دھ دی ہمسری اچھی بھلی

دلنشین تھے اس قدر اطوارِ ختمِ المرسلین  
ہو رہے تھے لوگ جان و دل سے قائل دیکھ کر  
دامنِ انسانیت پہ داغ تھا جن کا وجود  
بن گئے انسان وہ انسان کا مل دیکھ کر  
آؤ کر لیں شاہراہِ زندگی کو تابناک  
ہادیٰ کامل کے اوصاف و شمائل دیکھ کر

عبدالغنی تائب جب اپنے آقا و مولا کے محامد و محاسن اور کمالات و خصائص کا ذکر کرتے ہیں تو  
نکبت و نور کی وادیوں میں کھو کر رہ جاتے ہیں۔ وہ ذوق و شوق کو رہبر منزل بنا کر آگے بڑھتے ہیں۔  
عشق و عقیدت ان کا زادِ راہ ہے تو وجودِ شوق سے اپنے جذبات کو تیز تر کرنے کا کام لیتے ہیں۔ و فور  
شوق وہ خوش بختی ہے جو ممدوح کا سناتِ علیہ السلام کے اذن سے ہی کسی مداح حضور کا مقدر بنتی ہے۔ یہ تو  
ایک بحرِ بے کراں کا موج ہو جانا ہے۔ جذباتِ عقیدت کے سیلِ نور کا بے کنار ہو کر وسعتِ قلب  
و ذہن پہ چھا جانا ہے۔ یہ تو روحانی کیف و سرور کے نور آفریں نظاروں میں کھو جانا ہے۔ یہ تو اپنی  
ذات کے حصار سے ابھر کر محبتِ رسول ﷺ کی پہنائیوں میں گم ہو جانا ہے۔ اس کیفیت پر شوق پر



اقبال کی یہ فکر صادق آتی ہے کہ

نغمے بیتاب ہیں تاروں سے نکلنے کے لئے  
طور مضطر ہے اسی آگ میں جلنے کے لئے

عبدالغنی تائب کی عقیدت کے برہم پر جو نغمے ابھرتے ہیں ان کے اندر اس قدر ہمہ گیری، تاثیر انگیزی ہے کہ سننے والا خود اسی کیفیت سے ہمکنار ہو جاتا ہے جس نے تائب کے نوکِ خامہ کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہوتا ہے۔ ہم عبدالغنی تائب کے ان مضامین کی رنگارنگی اور تنوع کا سراغ لگانے لگے، تو اسی ذوق و شوق کی بے کرائی نے آگے جانے سے روک دیا بلکہ آگے جانے کا یارا ہی کہاں رہا تھا؟ ہم تو ان کی شعری عمر اور فکری بلند پروازی کا تقابل کر رہے تھے مگر تقابل بھی کس طور ممکن ہے کہ

یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے  
اہل نظر کا کہنا ہے کہ اگر نعتیہ شاعری و فور شوق سے محروم ہو جائے، تو محض نظم گوئی بن جاتی ہے۔ و فور شوق کا اٹھتا ہوا نور مدحت نگاری کے انوار لٹاتا، محروم دلوں میں مرادوں کی شمعیں جگمگاتا، قلم کی نوک سے محبوب خدا کی محبت کے گلزار کھلاتا اور نعت کو محض لفاظی کی تہمت سے نکال کر حاصلِ ادب عالیہ بناتا ہے۔ بلاشبہ عبدالغنی تائب اس سعادت سے بہرہ ور ہیں اور سعادت خاص سے بہرہ ور ہونے میں ان کی کسی شعوری کاوش یا لاشعوری جدوجہد کا دخل نہیں بلکہ یہ فقط اور فقط ممدوح کائنات کی بندہ نوازی ہے جس کی چشمِ کرم سے فیضیاب ہونے کے لئے ہر دور منا جاتوں کا کاسہ اٹھائے پھرتا ہے اس و فور عشق عقیدت اور کمال ذوق و شوق نے عبدالغنی تائب کی مدحت نگاری سے کس طور خراجِ نیاز لیا ہے اس کی ایک جھلک ملاحظہ ہو۔

وارنگی شوق کو منزل ہو اب نصیب  
لرزیدہ پا کر طیبہ نگر تک رسائی دے  
محشر میں مرے نامہ عصیاں کے باوجود  
ان کے وسیلہ پاک سے مجھ کو رہائی دے

آج تک رقصاں ہے طیبہ میں وہ رحمت کی بہار  
سختیاں جھیلیں جو آقا نے محبت پیار سے  
حضورِ ناز میں پہنچے جو ارمغانِ نیاز  
تو پھر نصیب ہو اپنا پر ہما کی طرح



پلکوں پہ قطرے عرضِ تمنا کے دیکھ کر  
بن مانگے مجھ کو دیتے ہیں اپنی جناب سے  
رہتے ہیں میری فکر میں طیبہ کے تذکرے  
عنبر فشاں ہیں لب مرے مشک و گلاب سے

لامکان میں خالقِ ارض و سما کی ذات تھی  
چشمِ مازاغِ البصر کے روبرو جلوہ نما  
ابتدائے عشق پیغمبرِ شعورِ ذات ہے  
انتہائے شوق ہے بس آپ ہی کا نقش پا

مجھ کو دی ہاتھِ غیبی نے نویدِ بخشش  
آپ سے عشق و عقیدت کا جو رشتہ دیکھا  
اوج پر اس کے مقدر کا ستارا چمکا  
جس کو بھی پڑھتے ہوئے اُن کا قصیدہ دیکھا

یہ حقیقت اظہر من الشمس ہیں کہ حضور محمد مصطفیٰ ﷺ جانِ دو عالم ہیں۔ افتخارِ آدم و بنی آدم ہیں۔ صبحِ ازل کا نور اور شامِ ابد کا سراج ہیں۔ آپ محبوبِ خدا بھی ہیں اور مطلوبِ کائنات بھی۔ جملہ انبیاء و رسل کے محاسن آپ کی ذاتِ واحد میں جمع کر کے آپ کو کاروانِ عشق و سرمستی کی تمناؤں کا مرکز و محور بنا دیا گیا۔ آپ کو ”ورفعنا لک ذکرک“ کا مصداق بنا کر آپ کے وجود سے بزمِ دو عالم جگمگائی گئی، آپ کے وجود کے صدقے میں یہ ساری کائنات بنائی گئی۔ آپ کے محاسن عقل کی آخری حدود سے ماورا اور آپ کے ظاہری و باطنی کمالات فکرِ بشر کی معراج سے بھی بلند ہیں۔ جس کا مداح خود خدا ہو اور جس کا سب سے بڑا نعتیہ خراج قرآن مجید ہو انسان اس کے معجزات و خصائص پر طائرانہ نظر ڈالنے سے بھی قاصر ہے۔ امام احمد رضا خاںؒ کے مطابق

قرآن تو ایمان بتاتا ہے انہیں

ایمان یہ کہتا ہے مری جان ہیں یہ

عبدالغنی تائب کو بخوبی ادراک ہے وہ جس ممدوحِ دو عالم کی مدحِ سرائی کا اعزاز حاصل کر رہے ہیں اُس کی ثنا گوئی کا حق ادا نہیں کر سکتے مگر یہ شاعر سعید بخت نعت گوئی کو ایک اعزاز سمجھ کر



سینے سے لگائے مستقبل کے روشن دریچوں میں قدم رکھ رہا ہے۔ یہ اس عجز آفریں فخر سے سرشار ہے کہ ”یا رسول اللہ میں مانتا ہوں کہ آپ کی نعت گوئی کا حق ادا نہیں کر سکتا مگر کیا یہ شرف میرے لئے کم ہے کہ آپ کے نعت نگاروں میں میرا نام آ جائے۔“

سلطانِ دو عالم ﷺ کے محاسنِ قدسیہ بیان کرتے کرتے عبدالغنی تائب بار بار اس حسین احساس سے سرشار ہونے لگتے ہیں کہ انہیں حضور سے نسبت تو حاصل ہے۔ یہ وہی نسبت ہے جو غلام کو آقا سے، بندے کو بندہ نواز سے، شعاع کو سورج سے، کرن کو چاند سے، خوشبو کو پھول سے اور درد و آلام کے مارے ہوئے کو مسیحا کے دوراں کے ساتھ ہوتی ہے۔

تری نگاہ جسے آشنائے راز کرے

وہ اپنی خوبی قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

اب ہم ایک نظر دیکھتے ہیں کہ عبدالغنی تائب ممدوحِ دو عالم کے محاسنِ قدسی کا کس طور تذکرہ کرتے ہیں۔

واللیل کے گیسو سے قدر شب نے ہے پائی

اور عکسِ رخِ شاہِ اُمم دن کا اُجالا

جس کو بھی عطا کر دیں کبھی مات نہ کھائے

اعجاز ہے یہ سیدِ عالم کے علم کا

ختمِ الرسل ہیں اور ہیں مقصودِ کائنات

ہیں کنت کنزاً مخفیاً کے گوہرِ مکنون

نعماتِ رفعتِ لک ذکرک کے ہیں چرچے

از وسعتِ افلاک و زمیں شرق و غرب تک

حدیثِ دلنشینِ الفقرِ فخری میری رہبر ہے

نبیؐ کے ہاتھ میں ہر نعمتِ دنیا و دیں دیکھوں

آ رہے ہیں آج تک قدسی قطار اندر قطار

عرشِ اعظم سے حسیں تر آستاں ہے آپ کا



لولاک لہما شانِ رفعتنا لک ذکرک  
تزئینِ گلستانِ جہاں آپ کے دم سے

.....

سایہ زمیں پر نہ پڑا جس کے وجود کا  
ہمسر ہو کون اُس کا بھلا کائنات میں

محامد و محاسن مصطفیٰ ﷺ کا ذکر کرتے ہوئے عبدالغنی تائب جس نسبت سرکار پر نازاں ہیں وہ تو ہر صاحب ایمان کے لئے سرمایہ حیات ہے مگر تائب نے اس نسبت کو جس انداز سے دیکھا ہے وہ کچھ ان کا ہی خاصہ ہے۔ وہ انداز بدل بدل کر اسی نسبت کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ اس نسبت پر شاداں بھی ہیں اور مسرور بھی۔ وہ سمجھتے ہیں کہ نسبت مدحت حضور ﷺ انہیں خدا اور ملائکہ کی سنت کی ادائیگی کا شرف بھی عطا کرتی ہے۔ وہ لہجہ بدلتے ہیں۔ انداز بیاں بدلتے ہیں۔ اسلوب سخن گوئی بدلتے ہیں۔ لفظوں کے بانگین کو نیا رنگ دیتے ہیں۔ تراکیب و استعارات کو نیا آہنگ عطا کرتے ہیں۔ حسن تغزل کی چاندنی اور جمالی صوت کی کہکشاں کے انوار بکھیرتے ہیں۔ فکرو فن کا نئے سے نیاز او یہ تراشتے اور شعر و نغمہ گری کا تازہ سے تازہ پیرایہ اظہار اختیار کرتے ہیں۔ مقصود فقط یہی ہے کہ مضامین کی تکرار بھی محسوس نہ ہو اور اسم محمد ﷺ کے حوالے سے نعت محمد ﷺ کا غازہ و نو بہار بھی بکھرتا رہے۔ عبدالغنی تائب کے نزدیک نعت کیا ہے؟ نعت کا حسن کیا ہے اور نعت نگاری سے والہانہ لگاؤ نے انہیں صاحب نعت ﷺ سے محبت و عقیدت کے نام پر کس خلوص فن سے ہمکنار کیا ہے اس کا جائزہ لینے کے لئے تبرک کے طور پر چند اشعار نذر قارئین ہیں۔

اعجاز ہے سرکار کے فیضانِ کرم کا  
ہے مدح و ثنا قبلہ مرے نوکِ قلم کا  
گنجینہ بخشش ہیں یہ گلہائے عقیدت  
تائب پہ کھلا رہتا ہے یوں بابِ کرم کا

.....

بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ ہو میلاد کی محفل  
مگر تائب نے محفل میں نہ کی نغمہ سرائی ہو

.....



یا رسول اللہ تائب پر بھی ہو چشمِ کرم  
لوگ کہتے ہیں کہ یہ بھی نعت خواں ہے آپ کا

ہاں مجھ کو عقیدت ہے مدینے کی زمیں سے  
نسبت کا شرف اس کو جو ہے سرورِ دیں سے  
تائب پہ ہوئی آج ہے پھر چشمِ عنایت  
قطرے ہیں گرے عرقِ ندامت کے جبیں سے

تائب کو ان کی نسبتِ عالی پہ ناز ہے  
اللہ کرے کہ فخر یہ تا زندگی رہے

عبدالغنی تائب نے جس حسنِ بیان اور الفاظ کی معجز نگاری کے ساتھ حضور ﷺ کے محامد و محاسن بیان کرتے ہوئے آپ سے نسبتِ خاص کا ذکر کیا ہے۔ وہ ہر صاحبِ نظر کی آرزو بھی ہے اور حاصلِ آرزو بھی، انہوں نے جس طرح ندرتِ بیان اور حلاوتِ زبان سے اپنے آقا و مولا سے اپنے تعلق پر ناز کا اظہار کیا ہے۔ اس سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ وہ آتش کے اس شعر کی ایمان آفریں تفسیر پیش کرنے کے آرزو مند ہیں کہ

نیا ہے لیجئے جب نام اس کا  
بڑی وسعت ہے میری داستاں میں

اور اس امر میں کلام نہیں کہ عبدالغنی تائب کی داستانِ شوق میں بڑی وسعت ہے جو فہم و ادراک کی حدود سے کہیں زیادہ جامع اور ہمہ گیر ہے۔ اس داستانِ شوق کے دراز ہونے کی رفتار ان کے راہوار عمر کی رفتار سے کہیں زیادہ ہے۔ نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے، ازل کے تصور اور ابد کے تعین سے بے نیاز، یوں سمجھئے کہ عمر سمٹ رہی ہے اور عبدالغنی تائب کے وفورِ شوق کی وسعتیں اپنے معاصرین سے خراجِ تحسین سمیٹ کر بارگاہِ حضور ﷺ میں مقبولیت و پذیرائی کا شرف حاصل کر رہی ہیں۔

ارمغانِ نیاز کی صورت میں عبدالغنی تائب نے مدحت و توصیفِ حضور کے جو گلہائے رنگارنگ کھلائے ہیں وہ ہمیشہ عشاقِ سرورِ کونین کے مشامِ ذہن و فکر کو لطافت آشنا کرتے رہیں گے۔ ارمغانِ نیاز ایک ایسے شیشِ محل کی مانند ہے جس میں لا تعداد آئینے نصب ہوں اور وہاں عبدالغنی تائب اپنی تمام تر سعید بختیوں کو سریہ فکر اور عجز سامانیوں کو ذریعہ اظہار بنا کر اس شیشِ محل میں



نعت حضور کی شمع نور لا کر رکھ دیں۔ اس ایک شمع نور (ارمغانِ نیاز) کے پر تو۔۔۔ تمام آئینوں میں شمعیں جھلملانے لگیں گی ان میں سے ہر شمع اپنی جگہ مکمل اور خوبصورت وجود۔۔۔ عتی ہوگی مگر یہ سب ایک ہی شمع نور ارمغانِ نیاز کا پر تو نور ہوں گی۔ ارمغانِ نیاز کے شیش محل میں جھلملانے والی شمعیں ہمیں کیا کچھ عطا نہیں کر رہیں؟

کہیں صورتِ مصطفیٰ ﷺ کی جلوہ گری ہے تو کہیں سیرتِ سرور کائنات ﷺ کی ناز آفرینی، کہیں نبی کریم ﷺ کے محامد و محاسن کا نور پھیلا ہوا ہے تو کہیں آپ کے اوصاف و کمالات کی ہر آن بکھرتی ہوئی روشنی، کہیں ضائع بدائع کی خوبصورتی ہے تو کہیں خوبصورت اور بر محل تراکیب و استعارات کی مرصع کاری، کہیں حسن تغزل اپنے تمام تر فکری و فنی لوازمات کے ساتھ جگمگا رہا ہے تو کہیں عشق و عقیدت سلطانِ مدینہ کی رم جھم دلوں کو حیات بخش تازگی عطا کر رہی ہے۔ کہیں گفتارِ حضور ﷺ معجز کاری ہے تو کہیں کردارِ سرورِ کونین ﷺ کی ہمہ گیری، کہیں عجز و انکسار کو بہانہ بنا کر شفاعتِ طلبی کا حسن اپنا وجود منوار ہا ہے تو کہیں اُمتِ اسلام کے رنج و آلام کا ماجرا سناتے ہوئے حضور ﷺ سے استمدادِ طلبی کا منظر دلوں کو کرب سے دو چار کرتا نظر آتا ہے۔ ان نعتوں میں حسنِ طلب بھی ہے اور ادائے نیاز بھی، رعنائیِ فکر بھی ہے اور عاجزی و در ماندگی کا انداز بھی، اس ایک شمع نور (ارمغانِ نیاز) نے اپنے نور آفریں پر تو صفات و کمالات حضور ﷺ کے حوالے سے جس قدر شمعیں روشن کر دی ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ ان کی روشنی کبھی بھی ماند نہ پڑنے پائے۔ ارمغانِ نیاز عبدالغنی تائب کی عشقِ حضور کے حوالے سے ان کی پہچان بھی ثابت ہے اور ان کے لئے سرمایہ ایمان بھی ہے۔ ہم اس تحریر کا اختتام عبدالغنی تائب ہی کے ان نعتیہ اشعار پر کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔

مرے قلب و نظر میں عشقِ احمد یوں مچل جائے  
تصور میں مدینہ ہو بدن سے جاں نکل جائے  
بے ہوں گے خیالوں میں مرے جو شافعِ محشر  
نہیں ممکن کہ پل سے پاؤں تائب کا پھسل جائے

☆☆☆



## خیراتِ مدحت کا تمنائی

### محمد اقبال نجمی

گلستانِ نعت کو قدرت نے وہ سدا بہاری عطا کی ہے کہ یہ کبھی خزاں آشنا نہیں ہوا۔ اس کی ہر کلی عطر بیز اور ہر پھول عنبر فشاں ہے۔ اس کی بہار جاودانی اور اس کی خوشبودائی ہے۔ اس گلستانِ نعت کی مہک کی ہمہ گیریت کا یہ عالم ہے کہ صدیوں کے تواتر سے جو بھی اس خوشبو کو اپنے مشامِ فکر کا اعزاز بنالیتا ہے وہی جمالِ نعت سے بزمِ عالم میں اجالا کرنے کو سرمایہ زندگی تصور کرنے لگتا ہے۔ فروغِ نعت کا کبھی نہ ختم ہونیوالا یہ سلسلہ پورے روحانی تزک و احتشام سے جاری ہے۔ جو بھی نیا سورج طلوع ہوتا ہے وہ نئے شعراء کی کوچہ مدحت و نعت میں آمد کی نوید لے کر آتا ہے۔ کوچہ نعت میں بصدِ عجز و انکسار آنے والا ہر نعت گو اس احساس کے ساتھ گلہائے نعت سے ماحول کو معنبر کرنے کا اہتمام کرتا ہے کہ نعت گوئی اس کی شعوری کاوش نہیں بلکہ فقط انعامِ خداوندی اور رحمتِ مصطفوی ہے۔

وگر نہ کہاں میں کہاں یہ مقام اللہ اللہ

محمد اقبال نجمی ایک طویل عرصہ سے شعر و ادب کی دنیا میں اپنے بھرپور وجود کا احساس دلارہے ہیں۔ انہوں نے بڑوں کے لیے بھی لکھا اور بچوں کے لیے بھی متعدد نثری و شعری کتب کے خالق ہیں۔ وہ سہ ماہی مفیض اور ماہنامہ دلچسپ کے نام سے موقر ادبی جرائد بھی شائع کر رہے ہیں جب سے شاعری کی دنیا میں داخل ہوئے انہوں نے تمام شعری اصناف میں فکر و فن کے ستارے لٹائے ہیں۔ جب نعت کے گلستانِ صدر نگ میں داخل ہوئے تو نعت و مدحت کو خصوصی طور پر اعزازِ فکر بنالیا اور نعتِ مصطفیٰ ﷺ کی یہ شمع انہوں نے آغاز شاعری سے ہی جلا رکھی ہے۔ پنجابی اور اردو شاعری پر یکساں بھرپور گرفت رکھتے ہیں۔ کئی سال پیشتر ”آپ کی باتیں“ کے عنوان سے بچوں کے لیے معیاری نعتوں کا مجموعہ شائع کیا اور بچوں کے لئے ہی سیرت حضور دی، کے عنوان سے آسان پنجابی زبان میں حضور سرور کائنات ﷺ کی سیرت پاک تحریر کی۔ جدید صنف شاعری ہائیکو کو ذریعہ اظہار بنا کر نعتیہ ہائیکو کے عنوان سے عشق و عقیدت کا خوبصورت گلدستہ اہل یقیں کی نذر کیا۔ ”سک دی ڈالی“ کے عنوان سے ان کی پنجابی نعتیں اصحاب



نظر سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ قومی ترانوں پر مشتمل ان کی کتاب ”قدم قدم آباد“ پاکستان رائٹرز گلڈ ایوارڈ پنجابی مثنوی ”ایہ نہیں میرا پاکستان“ مسعود کھدر پوش ایوارڈ کی حقدار قرار پا چکی ہیں جبکہ ان کی پنجابی نعتیہ ہائیکو پر مشتمل کتاب ”مہکاں ونڈ دے بول“ کو وزارت مذہبی امور کی طرف سے اول ایوارڈ مل چکا ہے۔

ہر صاحب ایمان کا دل محبت رسول میں سرشار رہتا ہے۔ کائنات میں جنم لیتے ہی اس کے دل میں حضور ﷺ کی محبت و عقیدت کی شمع فروزاں ہو جاتی ہے اور وہ کنارِ لحد تک دل و جاں کو اسی روشنی سے آباد پاتا ہے اور پھر جب صاحب ایمان قبر میں اترتا ہے تو محبت رسول ﷺ کے حوالے سے اس خوشی سے سرشار ہو کر قبر کی خلوتوں کو قبول کرتا ہے کہ اس کا جذبہ، عشق بارگاہِ خدا اور رسول ﷺ میں قبول ہو چکا ہوگا اور پھر یہی عشق قبر کی تاریکیوں میں چراغِ بخشش کی صورت فروزاں ہوگا۔ امام احمد رضا خاں کے بقول

لحد میں عشق رخِ شہ کا داغ لے کے چلے  
اندھیری رات سنی تھی چراغ لے کے چلے

محمد اقبال نجمی کے دل میں بھی یہی جذبہ محبت حضور ﷺ شمع بن کر ضو بار ہے۔ یہ جذبہ مچلتا ہے تو دل میں گنبدِ خضریٰ کو دیکھنے کی تمنا جاگ اٹھتی ہے۔ شہر رسول ﷺ کی زیارت کی آرزو حاصل حیات بننے لگتی ہے۔ ان کے لئے گنبدِ خضریٰ کا ہر نظارہ ایمان آفریں ہے اور شہر رسول کی ہر جھلک جمال آگہی ہے تصورات کے دوش پر سفر کرتے ہوئے محمد اقبال نجمی کے قلم سے تمناؤں کی صدرنگی دیکھئے۔

دل میں طیبہ کے تصور سے اجالا دیکھوں  
منزلِ شوق پہ اپنا میں سفینہ دیکھوں  
ایک اُمید لئے کب سے جیے جاتا ہوں  
خوبی، بخت اس سے نور کا جلوہ دیکھوں  
دردِ ہستی کا مداوا بھی میں ایسے چاہوں  
لطف فرماتا ہوا رشکِ مسیحا دیکھوں

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی آمد بہاراں کی تمہید بن گئی آپ الم رسیدگانِ ہستی کی آہ وزاری اور بلکتی ہوئی انسانیت کی بے قرار یوں کے جواب میں رحمت پروردگار بن کر آئے۔ آپ کے آنے سے نہ صرف تیرہ و تاریک ماحولِ ضو بار ہو گیا بلکہ دلوں کے ظلمت کدے بھی جگمگا اٹھے۔ ایمان کی روشنی سے محروم وہ حرماں نصیب کہ جنہیں اپنے وجود کا ادراک بھی نہیں تھا اسرارِ فطرت



کے ترجمان بن گئے، بے یقینیوں کو ایمان کی دولت، گمراہوں کو حق شناسی کی نعمت، مایوس دلوں کو سکون کی رفعت اور بت پرستوں کو خدائے واحد کے حضور سر بسجود ہونے کی سعادت عطا ہوئی۔ آپ ﷺ نے جس طرح عالم انسانیت کی راہنمائی فرمائی اس نے تاریخ عالم کے دھارے کا رخ تبدیل کر دیا اور بربادی و تباہی کے بحر بے کراں کی نذر ہونے والا سفینہ حیات یکا یک عافیت کے ساحل پر لنگر انداز ہو گیا۔ دوسرے اصحاب شوق کی طرح محمد اقبال نجمی بھی حضور علیہ السلام کی اس خاکدانِ عالم میں قدم رنجہ فرمائی کی بدولت بپا ہونے والے ایمان آفریں انقلاب کے غور طلب اثرات سے آشنا ہیں۔ اُن کا قلم تعلیمات حضور ﷺ کی بدولت جہاں بھر کو ہر لحظہ منور کرتی ہوئی روشنی کو یوں خراج عقیدت پیش کرتا ہے۔

آئے حضور ہو گئی ہر سمت روشنی  
آنے سے اُن کے چھٹ گئی دنیا کی تیرگی  
کمزور جتنے لوگ تھے محفوظ ہو گئے  
آئے جو آپ کٹ گئی زنجیر بے کسی  
گوئی صدائے مرجبا آنے سے آپ کے  
آئے جو آپ آ گئی چہروں پہ تازگی  
چشمِ عطا ہوئی تو جواہر کبھی بنے  
ذراتِ خاک کو ملی اس طور دلکشی



جس پر حضور آپ کی چشمِ عطا ہوئی  
اس کی تمام زندگی وقفِ ثنا ہوئی  
مانگی ہے جب بھی آپ کے نعلین کے طفیل  
پوری بس ایک آن میں میری دعا ہوئی  
آئے جو آپ شمعِ ہدایت لیے ہوئے  
ظلمت زدہ قلوب کو حاصلِ ضیا ہوئی



پستیوں میں گرنے والوں کو ہمالا کر دیا  
نور بانٹا ظلمتوں میں اور اُجالا کر دیا  
”سانیٹ“ ایسی صنفِ ادب ہے جس میں شعراءِ برنم، تغزل اور تفکر کا جادو جگا کر کم



اشعار میں بڑی بات کہہ جاتے ہیں۔ مختلف عنوانات کے حوالے سے ممتاز شعراء نے اس میدان میں بھی خوب طبع آزمائی کی ہے۔ محمد اقبال نجمی نے حصول سعادت کے لئے نعتیہ سانیٹ لکھے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اوصافِ حسنہ اور سیرت و کردار کے حوالے سے عصرِ حاضر کو نور آفریں پیغام دینے کی کوشش کی۔ نعتیہ سانیٹ بجائے خود ایک ایمانی ترکیب ہے جو ہمیں یہ احساس بخشتی ہے کہ جب شاعر کا دل حبِ مصطفیٰ ﷺ اور اُس کا قلم جمالِ حضور ﷺ سے آبدار ہو تو پھر نوکِ خامہ سے لفظوں کی جگہ ستارے پھوٹتے ہیں۔ تراکیب و استعارات کے نام پر انوار کی رم جھم کا سماں نظر آتا ہے اور شاعر ورطہ حیرت میں کھو جاتا ہے کہ کیا کہے اور کیا نہ کہے۔ محمد اقبال نجمی بھی اسی کیفیت سے دوچار ہیں انہیں فکر و نظر کی شادمانی اور رحمتِ خداوندی کی ارزانی کا گمان گزرتا ہے اور اُن کے قلم سے نعتیہ سانیٹ کا زمزمہ ابھرنے لگتا ہے۔

مل گیا پیغام مجھ کو کھل گئے دل کے گلاب  
تھا شجرِ عمرِ رواں کا کب سے بے برگ و ثمر  
مل گئیں شادابیاں جب ہو گئی اُن کی نظر  
شوق کی تنویر سے روشن ہوئے ہیں میرے خواب  
آسماں پر چھا رہے ہیں رحمتِ حق کے سحاب  
میں کہ تھا اک خشک پتا کر دیا مجھ کو ہرا  
ہے تمنا ان کی چاہت میں کروں خود کو فنا  
مجھ کو لے آغوش میں ان کے کرم کا ماہتاب  
دیدۂ پر شوق نے منظر سہانے پا لیے  
اُس عرب کے چاند کا ہم کو اُجالا مل گیا  
اُن کی نعمت مل گئی سارے خزانے پا لیے  
اُن کے در پر آ گئے ہم کو سویرا مل گیا  
نصرتیں ہی نصرتیں ہیں اور دامن تنگ ہیں  
رحمتیں ہی رحمتیں ہیں اور دامن تنگ ہیں

حضور پر نور سید یوم النشور ﷺ کی خوشنودی اور رحمتِ خداوندی کے حصول کا ایک اہم ذریعہ درودِ پاک ہے۔ درود کیا ہے؟ آرزوؤں کے نام پر چاہتوں کا نور ہے۔ بہتر سے بہترین پیرایہ میں صف و ثنائے حضور ہے۔ یہی درود خدا بھی پڑھ رہا ہے اور ملائکہ بھی درود کی ڈالیاں بارگاہِ محبوبِ خدا میں نذر کرنے میں مصروف و محو ہیں، خدا اُمّتِ مصطفیٰ ﷺ کو محسنِ انسانیت ﷺ کی



ذاتِ اقدس پر درود و سلام پڑھنے کا حکم دیتا ہے۔ گو یا درود حکمِ ربانی کی تکمیل بھی ہے اور عشقِ رسول ﷺ کے تقاضوں کی تکمیل بھی، یہ سنتِ خداوندی بھی ہے اور جمالِ بندگی بھی۔ محمد اقبال نجمی کو بجا طور پر احساس ہے کہ جو بھی ارمغانِ عقیدت بارگاہِ سالت مآب ﷺ میں پیش کیا جائے وہ درود ہی ہے مگر اس کے باوجود ان کا قلم درود کے عنوان سے اوصافِ حضور ﷺ رقم کرنا سعادتِ عظمیٰ تصور کرتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے۔

رکھتا ہے روح و جسم کو تازہ درودِ پاک  
کرتا ہے رنج و غم کا مداوا درودِ پاک  
وابستگی ہے جس کو محمد ﷺ کے نام سے  
اُس کا تو ہر گھڑی ہے وظیفہ درودِ پاک  
اُس کو مرے حبیب کی قربت ہوئی نصیب  
جس نے مرے حبیب پہ بھیجا درودِ پاک

محمد اقبال نجمی نے ”نعتیہ ہائیکو“ کے عنوان سے ایک مجموعہ عقیدت و محبت پیش کر کے ثابت کر دیا ہے کہ جس طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ذکر جمیل ہر عہد اور ہر زبان کا اعزاز ہے اسی طرح ہر صنفِ سخن اسی محبوبِ دو عالم کے تذکارِ حسین کی بدولت مقبولیت کی حقدار ٹھہرتی ہے۔ ہائیکو اگرچہ جاپان سے درآمد ہوئی مگر ہمارے بعض ایجاد پسند شعراء نے اسے اردو زبان کا جامہ عطا کر کے اپنی فکر آفرینی کے ظہور کا ذریعہ بنا دیا۔ محمد اقبال نجمی نے معاصر شعراء پر سبقت حاصل کرتے ہوئے ”نعتیہ ہائیکو“ کی صورت میں جدید لہجہ میں نعتِ حضور ﷺ پیش کرنے کی انتہائی مستحسن کاوش کے ذریعہ ایک دنیا کو چونکا دیا۔ انہوں نے محض جدیدیت کی دھن میں یہ ہیئت اختیار نہیں کی بلکہ ان کے قلب و جاں میں پنہاں و فوہِ شوق نے ہائیکو کی سمت سفر شروع کر دیا۔ محمد اقبال نجمی کی ہائیکو میں غزل کا وقار نظر آتا ہے اُن کی نعتیہ ہائیکو جمالِ مصطفیٰ ﷺ کی تابانیوں سے آباد نظر آتی ہے اس سلسلہ میں ان کا جو پہلو انہیں معاصرین سے ممتاز کرتا ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے آقائے دو عالم ﷺ کی سیرت و کردار اور جمالِ جہاں افروز کے گل و لالہ اس شان سے مہکائے ہیں کہ ان کی خوشبو تازہ سیرتِ عشاقِ حضور ﷺ کے مشامِ عقیدت کو معنبر کرتی رہے گی۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

کتنی صدیاں گزر گئیں لیکن  
تیری جانب ہی دیکھتا پایا  
آدمیت کو ارتقا کے لئے





ایسے لمحات کچھ میسر ہوں  
میرے آقا کروں تری باتیں  
میں ترے شہر کی کھجوروں سے



شوق میرا ہے بس یہی نجمی  
رحمتوں کے حصار میں رہنا  
معفرت کی بہار میں رہنا  
اب جمالِ مصطفیٰ ﷺ کے حوالے سے نعتیہ ہائیکو میں محمد اقبال نجمی کا حسنِ قلم دیکھئے۔

جب وہ نازِ بشر شبِ اسری  
اپنی معراجِ انتہا پر تھا  
عشق پر حسن کی نوازش تھی



تو کہ اک آفتاب روشن ہے  
اس جہاں کو مٹھاس دیتا ہے  
نور تیرا ہے سارے عالم میں



میں سراپا حضور کا پڑھ کر  
جب درود و سلام کہتا ہوں  
رحمتوں کا نزول ہوتا ہے

محمد اقبال نجمی کو احساس ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بارگاہ وہ دربارِ عالم پناہ ہے جہاں سے ہر ایک کو حسبِ طلب ہی نہیں بلکہ طلب سے بھی سوا ملتا ہے۔ حضور نے زندگی بھر کسی سائل کو خالی ہاتھ نہ لوٹایا اور آج جبکہ مونس بے کساں صلی اللہ علیہ وسلم گدِ خضریٰ میں آرام فرما ہیں تو سائلوں کا ہجوم ہمہ وقت محو طواف رہتا ہے۔ آپ کو پکارتے ہیں تو ان کی بے قرار یوں کو قرار اور بے چینوں کو سکون کی دولت نصیب ہونے لگتی ہے۔ محمد اقبال نجمی اپنے آقا و مولا کے حسنِ سخاوت سے بخوبی آگاہ ہیں اور جانتے ہیں کہ آپ کا نام لینے سے مایوسیوں کی گھٹائیں چھٹنے لگتی ہیں اور رحمت کا سورج طلوع ہونے لگتا ہے۔ آپ کا در لطف و عطا کا گہوارا اور آپ کا گدِ خضریٰ آپ کے عشاق کے لئے انوارِ خداوندی کا نظارہ ہے۔ آپ ﷺ کی بارگاہ سے زندگی کے آداب بھی عطا



ہوتے ہیں اور آپ سے محبت و ارادت کی بدولت آپ کے اُسوۂ حسنہ پر عمل پیرا ہونے کی توفیق بھی عطا ہوتی ہے۔ محمد اقبال نجمی کے قلم سے آرزو مندی کا جمال دیکھئے۔

وہ جو مائل بہ کرم ہیں تو یہ دھڑکا کیسا  
جب بھی دیکھیں طلب، اپنی رضا بخشیں گے  
اُن کی چاہت کے خزانے ہیں جہاں میں بٹتے  
جتنا چاہو گے تمہیں اس سے سوا بخشیں گے



جس پر حضور آپ کی چشم عطا ہوئی  
اس کی تمام زندگی وقف ثنا ہوئی  
مانگی ہے جب بھی آپ کے نعلین کے طفیل  
پوری بس ایک آن میں میری دعا ہوئی



ادھر رحمت لپکتی ہے جدھر سرکار ہوتے ہیں  
جو اُن کے در پر آتے ہیں وہی سرشار ہوتے ہیں  
جو اُن کو خواب میں دیکھیں وہی بیدار ہوتے ہیں  
درود اُن پر سلام اُن پر درود اُن پر سلام اُن پر

اس عندلیب گلستان رسالت کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی طہ اور یسین کا مصداق ہے اُن کے لئے حضور سلطانِ دو عالم کی صورت و سیرت سراپا روشنی ہیں۔ آپ سے پہلے انسان وقارِ آدمیت سے محروم تھا۔ لات و منات کا جادو سرچڑھ کر بول رہا تھا۔ آپ کی ولادت باسعادت سے روشنی اور نور کا قافلہ اس شان سے منزل ایمان کی جانب گامزن ہوا کہ عرب و عجم اس سے یکساں فیض یاب ہونے لگے۔ غم کے ماروں کو قرار اور محروم قسمت انسانوں کو وقار کی دولت نصیب ہوئی۔ ٹھوکروں پر پلنے والے عظمتِ انسانیت کے علمبردار بن گئے۔ آمدِ مصطفیٰ ﷺ انسانیت نوازی کا پیغام لے کر آئی، فاران کی چوٹیوں سے طلوع ہونے والے مہر رسالت نے ذروں کو آفتاب کی تابانی اور سنگریزوں کو خورشید کی تابانی بخش دی۔ محمد اقبال نجمی جانتے ہیں کہ ایسا انقلاب چشمِ فلک نے بھلا کب دیکھا تھا یہ تو بجائے دو عالم ﷺ کی تشریف آوری کا فیضان ہے کہ اس صبح بہاراں کے طلوع ہوتے ہی کائنات ہستی ایک نئی ولولہ انگیز شان کے ساتھ قافلہ زیست کی انسانی اقدار کی منزل کی جانب سفر کا حیرت انگیز منظر دیکھنے لگی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام تشریف لائے تو ویرانے کس طرح بہارِ بداماں بن گئے اس کا احساس محمد اقبال نجمی کی نعت



کے مطالعہ سے بہت سے مقامات پر ہوتا ہے۔

اس جہانِ رنگ و بو میں اُن سے ساری رونقیں  
بٹ رہی ہیں اُن کے در پر دو جہاں کی نعمتیں  
دل کے ویرانوں میں آئی اُن کے آنے سے بہار  
اُن کا ذکرِ پاک سُن کر جھومتی ہیں رحمتیں  
دولتِ تہذیب ہستی فکرِ عشق و آگہی  
اُن کی نسبت سے ملی ہیں ہم کو ساری عظمتیں



دلکشی روشنی نور ہی نور ہے  
نورِ طیبہ سے ہر آنکھ معمور ہے  
جس نے فکر و نظر کو جلا بخش دی  
میرے آقا کا روشن وہ منشور ہے

خیراتِ مدحت، اس نعتیہ تصنیف کا عنوان بھی ہے اور ایک دلائلِ فریں نعتیہ ترکیب بھی۔  
یہ ایسی نعتیہ ترکیب ہے جس کی گہرائی میں ڈوب کر عظمت و شانِ حضور ﷺ اور سائل کی عجز سامانی  
کا احساس ہوتا ہے۔ دربارِ مصطفیٰ ﷺ وہ دربار ہے جہاں سے سائلوں کو طلب سے بھی سوا عطا ہو  
رہا ہے، جہاں سے بٹنے والی خیرات سے شاہ گدا، سلاطین و فقراء، تاجدارین کجکلاہ اور گدایان  
بے مایہ سبھی فیضیاب ہو رہے ہیں جس کے دربار کی خیرات پر دو عالم کا گزارا ہے۔ نبی اکرم ﷺ  
نے ارشاد فرمایا کہ، خدا مجھے عطا کرتا ہے اور میں تقسیم کرنے والا ہوں۔

درِ مصطفیٰ ﷺ سے عطا ہونے والی خیرات پہ کونین کا گزارا ہے۔ خدائے کریم نے کُن  
کی کنجیاں آپ کے دامن میں ڈال دی ہیں تو پھر وہاں سے سائلوں کو کیا کیا عطا نہ ہوتا ہوگا اور کیا کیا  
عطا نہیں ہو رہا۔ انبیاء اور رسل بھی اپنے اپنے ادوار میں آپ ﷺ کی رحمت کا وسیلہ ڈھونڈتے  
رہے، یہ رحمت طلبی بھی تو خیراتِ نور حاصل کرنے کا بہانہ ہے۔ اولیاء، اغواث، شعراء، ادباء، قلم کار،  
فصحاء، خطباء سبھی خیراتِ مدحت کے تمنائی ہیں کیونکہ سب اپنے آقا و مولا ﷺ کی شانِ عطا سے  
آگاہ ہیں۔

مالکِ کونین ہیں گو پاس کچھ رکھتے نہیں  
دو جہاں کی نعمتیں ہیں اُن کے خالی ہاتھ ہیں  
محمد اقبال نجمی بھی نعتوں کے گلاب اٹھائے، عقیدت کی کلیاں سمیٹے، محبتوں کے ارمغان  
کی خوشبو لٹاتے ہوئے اسی عظیم المرتبت دربارِ اقدس کی طرف ملتجی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اُن



کے لہجے میں عاجزی ہے، اظہار میں سوز ہے، آنکھوں میں اشتیاق کا نم ہے، دل میں گداز شوق کا وفور ہے۔ کبھی آقا و مولا کے مقام مرتبہ کی رفعتوں کو دیکھتے ہیں اور کبھی اپنی کم مائیگی کو۔ ایک نیاز مندانہ جھجک آگے بڑھنے اور اظہارِ مدعا سے روکتی ہے۔ مگر گنبدِ خضریٰ سے رحمتِ عام اور بخشش و عطا کی ہر آن اُبھرتی ہوئی صدائیں اُن کے جذبہ طلب کو ابھارتی ہیں اور پھر اُن کے قلم سے حُسن طلب کے نام سے خیراتِ مدحت کی طلب ابھرنے لگتی ہے۔ یہ صرف اپنے لئے ہی نہیں مانگتے بلکہ اُمتِ اسلام کے لئے بھی مانگتے ہیں کیونکہ یہ خود کو اُمتِ اسلام سے الگ نہیں سمجھتے۔ خیراتِ مدحت کے اس تمنائی کا جذبہ خیراتِ طلبی دیکھیے یہ خیراتِ مدحت بھی طلب کرتے ہیں تو خیراتِ عطا کرنے والے آقا کی رفعت بے کراں کا تذکرہ کر کے۔

ترے در کے غلاموں کو ابد تک سرخوشی دے گا  
وہ جامِ لطف جو تُو نے پلا رکھا ہے صدیوں سے  
کیا اپنے فقیروں کا بھی اونچا اس قدر رتبہ  
کہ اُن کے در پہ شاہوں کو جھکا رکھا ہے صدیوں سے



جادۂ شوق ترے لطف کی چھاؤں میں رہے  
غنجِ نعت سدا پاک ہواؤں میں رہے  
زندگی اُس کو بتانے کا ہنر آتا ہے  
جامِ رحمت جو پے پیار کی چھاؤں میں رہے



ارضِ طیبہ سے ہر بے نوا کے لئے  
نورِ رحمت رواں ہے عطا کے لئے  
لب پہ آتی ہیں سب دل کی بے تابیاں  
ہاتھ اٹھتے ہیں جب بھی دُعا کے لئے  
ماہِ قاراں کی پھیلی ہے جو روشنی  
وا کئے سب نے دامنِ ضیا کے لئے



اپنی رحمت کا مرے سر پہ یوں سایا کر دیں  
ارضِ طیبہ کا طرف میرا بھی پھیرا کر دیں



نعت کی اصل شان وہ ادب و احترام ہے جو عشاق حضور ﷺ کو الہانہ انداز کی رعتیں عطا کرتا ہے۔ محمد اقبال نجمی محبت رسول کے نام پر بجا طور پر یہ ادراک رکھتے ہیں کہ بارگاہ رسول ﷺ میں تو ملائکہ اور اولیائے کرام بھی سانس روک کر حاضری دیتے ہیں کہ کہیں سانسوں کا زیرو بم بھی گستاخی کا سبب نہ بن جائے۔ ادب محبت کے قرینوں میں پہلا قرینہ ہے اور پھر اس کے حضور با ادب حاضری جو خلاق کائنات کا محبوب اور بزم فطرت کا مطلوب ہے۔ محمد اقبال نجمی کا قلم بھی عجز و انکساری کو اپنا ترجمان بنا کر ادب و احترام کے تقاضوں کو بجالاتے ہو یحجب نعت کے پھولوں کی مالا پروتا ہے تو پڑھنے والوں کے دل روحانی کیف و سرور کے احساس میں کھو جاتے ہیں یہ وہ مقام ہے جہاں صاحب ایمان پہنچنے کی آرزو تو کرتا ہے مگر پھر واپسی کا راستہ یاد نہیں رہتا۔ بارگاہ رسالت مآب علیہ الصلوٰۃ والسلام میں محمد اقبال نجمی کے جذبات احترام و عقیدت، استمداد طلبی، و فور شوق، حسن ذوق، کمال آرزو، اور نیازِ تمنا کا ایک انداز دیکھئے۔

تصدق ہیں سارے اسی خوش بیاں پر  
سدا پھول کھلتے ہیں جس کی زباں پر  
فضائیں معطر یہ ہو جائیں ساری  
مہکتا ہے جب اعمام احمد زباں پر



میں نعت کی تکمیل کروں گا کیسے  
دل نور کی قندیل کروں گا کیسے  
لفظوں کے ستارے میں بنا لوں لیکن  
اس حسن کو تمثیل کروں گا کیسے



نکھرے ہیں مرے لفظ ضیا کی صورت  
چلتی ہے مری سانس صبا کی صورت  
توصیف نبیؐ سے ہوا عالم ایسا  
مہکتی ہے مری خاک حنا کی صورت

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے یوں تو وہ ذرہ بھی رشکِ صدا آسمان ہے جسے آپ سے نسبت ہو گئی لیکن بلادِ مکہ مکرمہ، مدینہ طیبہ اور بالخصوص گنبد خضریٰ کو آپ کی نسبت سے جو مقام حاصل ہے اس کی بلندیء درجات کا کسی اور مقام سے تقابل ہی نہیں کیا جاسکتا۔ مدینہ منورہ کے تصور سے ہی عشاق کے دل دھڑکنے لگتے ہیں اور گنبد خضریٰ کے سامنے حاضری کے تصور سے ہی



نبض ہستی درہم برہم ہو جاتی ہے۔ خوش بخت ہیں کہ جنہوں نے مدینہ طیبہ میں شہر رسول کے ذرات کی خورشید سامانی کو دیکھا، وہاں کے درو بام پر پھیلی ہوئی تجلیات کو دیکھا، گنبد خضریٰ کا طواف کرنے والے عشاق حضور کی دعاؤں، مناجاتوں اور سسکیوں کو دل کی زبان سے سن کر نعتوں کے تصورات سے دل و جان کو آباد کیا۔ گنبد خضریٰ کے حوالے سے محمد اقبال نجمی کی عقیدت کا انداز ملاحظہ کیجئے۔

گنبد خضریٰ تری کیا شان ہے  
پاس تیرے دو جہاں کی جان ہے  
زاران کوئے طیبہ کے لیے  
دید تیری وصل کا سامان ہے  
اک نظر جو تیری جانب دیکھ لے  
وہ ہی تیرے حسن پر قربان ہے

شہر مدینہ اور گنبد خضریٰ کی عظمتوں کے کیا کہنے، جس نے نہیں دیکھا وہ دیکھنے کے لئے تڑپتا ہے جو دیکھ آیا ہے وہ بار بار زیارت کے لئے تڑپتا ہے۔ محمد اقبال نجمی بھی عشاق رسول ﷺ کے اُس قافلہ کے رکن ہیں جن کے تخلیات اور تصورات کی دنیا گنبد خضریٰ کے انوار سے بسی ہوئی ہے، اُن کی نعتوں کا گداز، لہجے کا خلوص، قلم سے نکلنے والے اشعار کا مودب پیغام، عشق و عقیدت حضور کی داستان بیان کر رہا ہے ایسی داستان، جو زبان کو حلاوت، فکر کو طراوت، افکار کو رفعت اور فکری بانگین کو عاجزی کی لذت سے آشنا کرتی ہے، یہ سوچتے ہیں، شہر مدینہ کے لئے تڑپتے ہیں، زیارت گنبد خضریٰ کے لئے، جیتے ہیں تجلیات مدینہ الرسول کے لئے، سانس سانس آباد رکھتے ہیں تذکار شہر حضور ﷺ کے لئے۔ جب عشق صادق ہو، جذبہ رفعت آشنا ہو، احساس مہکبار ہو، ادراک گہر بار ہو اور آنکھیں اشکبار ہوں تو پھر نوک خامہ سے اشعار نہیں بلکہ گلاب مہکتے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے۔

ارض طیبہ سے محبت کا سندیسہ آیا  
دل یہ چاہے کہ چلوں اب میں ہوا کی صورت



اُن کے در پر رہی حاضری چار دن  
میں نے جانا ملی زندگی چار دن  
اشک تھمتے نہ تھے ہونٹ تھے کانپتے  
ایسی حالت بنی تھی مری چار دن



میری نظروں نے چو میں حسین جالیاں  
میں نے پائی عجب روشنی چار دن



طیبہ کی چاندنی میں کیا لطف پا رہا ہوں  
صلیٰ علیٰ کے غنچے دل میں کھلا رہا ہوں  
دل رو برو ہے اُن کے آنکھیں جھکی ہوئی ہیں  
طیبہ کی روشنی ہے میں جگمگا رہا ہوں  
میرے حضور کا ہے دربار سب سے عالی  
بن کر گدائے طیبہ قسمت جگا رہا ہوں

ایوانِ مدحت میں محمد اقبال نجمی کا ذوقِ نعت پورے روحانی شکوہ کے ساتھ پروان  
چڑھتا، جذبات کے مطلع ایمان پر چمکتا، دلوں کو انوارِ آگہی سے ضو بار کرتا، احساسات کو مہکاتا اور  
معاصرین کے درمیان اپنے روشن وجود کا احساس دلاتا نظر آتا ہے۔ محمد اقبال نجمی کی نعتوں پر ایک  
نظر ڈالتے ہی یہ حقیقت واضح ہونے لگتی ہے کہ شاعر نے نعت محض شاعرانہ تفاخر یا فکرو فن اور نقد و  
نظر کے لحاظ سے اپنی محنت کی داد پانے کے لئے نہیں لکھی بلکہ اس کے پیش نظر فقط وہ جذبہء عشق  
رسول ﷺ ہے جو سیدنا حسان بن ثابت سے علامہ اقبال تک چمکتا، جگمگاتا اور وقت کے بنجر  
صحراؤں میں لطف و رحمت کے گلاب کھلاتا نظر آتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ وہ  
عظیم المرتبت مقام ہے جس کی عظمتوں کا احاطہ کرنے کے لئے شاعر کا قلم کما حقہ وہ کچھ بیان نہیں  
کر سکتا جسے بیان کرنے کی تمنا لے کر اس نے اس وادیء شوق کا سفر اختیار کیا ہے۔ یہاں زمانے  
بھر کے الفاظ ذخیرہ تمام، دنیا بھر کی سحر بیانی عاجز، اور اصحاب علم و ادب کا تمام شعری و نثری سرمایہ  
انتہائی محدود و مختصر نظر آتا ہے۔ یہ عجز بیانی اپنی جگہ، پھر بھی اس حقیقت کا اعتراف شوکتِ نعت کو  
خراج عقیدت پیش کرنے کے مترادف ہے کہ محمد اقبال نجمی نے سلطانِ سلاطین دو عالم ﷺ کے در  
بار میں اپنی چاہتوں اور آرزوؤں کا نذرانہ خیراتِ مدحت کی صورت میں پیش کرنے کے لئے جس  
اسلوب اور آہنگ کو اختیار کیا ہے وہ اہل شوق کی نگاہوں میں مقبول ٹھہرے گا اور غلامانِ سرور کو نین  
صلی اللہ علیہ وسلم کے دلوں میں عشق و عقیدت کے ایسے چراغ روشن کرنے کا سبب بنے گا جن کی  
روشنی ان کے لئے حالات کے ظلمت کدو کو منور کرنے اور لحد کی تاریکیوں کو کافور کرنے کا سبب  
بنے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ العزیز











## مصنف کی دیگر کتب

### مطبوعہ کتب

- روحِ تکلم... (تقریریں)
- حسنِ تکلم... (تقریریں)
- جمالِ فقر
- کاروانِ نعت کے حدی خواں
- تجلیاتِ مخدوم
- حیاتِ شیخ الاسلام
- شہرِ یارِ خطابت
- سلام بخضر سید الانام
- انوارِ میاں میر
- تاریخِ گوجرانوالہ
- فیضانِ اکبری
- میلادِ مصطفیٰ ﷺ قرآن و سنت کی روشنی میں
- رہنمائے عمرہ
- مرکزِ تجلیات
- قافلہ شوق کے مسافر
- ضربِ تکلم

### زیر طبع کتب

- حیاتِ شہنشاہِ لاٹانی
- انتقادیاتِ نعت
- سیرتِ خطیبِ الاسلام